اسلامی عبادات

(تحقیقی مطالعہ)

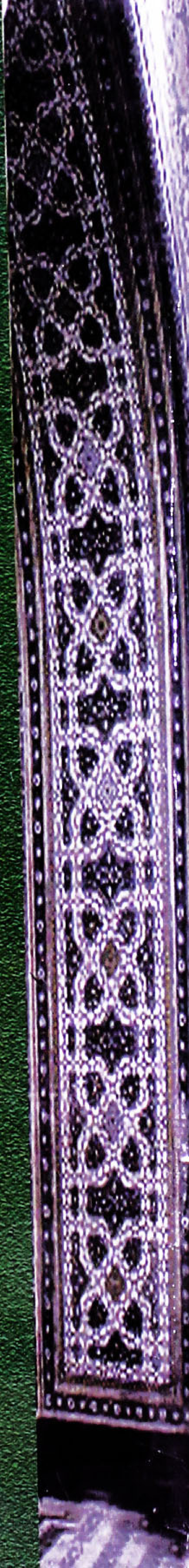

الطاف احمد اعظمی

Marfat.com

اسلامی عبادات

(ایک مطالعہ)

الطاف احمد اعظمی

Marfat.com

111918

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ

کتاب کا نام : اسلامی عبادات، ایک مطالعہ

مصنف : الطاف احمد اعظمی

صفحات : ۴۰۵

کمپوزنگ : فراہی کمپیوٹرس، 400/1/19A منیر کا، نئی دہلی-٦٧

سال طباعت : ۲۰۰۷

زیرِ اہتمام : محمد طلحہ

قیمت : ۲۵۰

تقسیم کار

البلاغ پبلیکشنز، ۱۰-اعظمی اپارٹمنٹ، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

Name of Book	:	Islami 'Ibādāt
Author	:	Prof. Altaf Ahmad Azmi
Address	:	901B, Flat No. 402 Lane No. 24 Tughlaqabad Exten. N. Delhi-19

Marfat.com

عرض ناشر

پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے بیسویں صدی کے ربع آخر میں فکر اسلامی کے اردو لٹریچر میں اہم اضافے کئے اور یہ سلسلۂ فیضان ہنوز جاری ہے۔ 'ایمان و عمل کا قرآنی تصور'، 'توحید کا قرآنی تصور'، 'وحدۃ الوجود ایک غیر اسلامی نظریہ' اور 'خطبات اقبال ایک مطالعہ' ان کی قابل مطالعہ کتابیں ہیں۔

زیر نظر کتاب میں پروفیسر اعظمی نے اسلامی عبادات کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کا انداز تحقیق عصری تقاضوں سے کافی ہم آہنگ ہے۔ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں عبادات کی حقیقت اور غرض و غایت واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عبادت کا خالص رسمی اور ظاہری پہلو ہی سامنے نہ رہے۔

ہم نے تین سال قبل اس سلسلے کا ایک حصہ 'حقیقت حج' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ اس حصے میں باقی تین عبادتوں نماز، روزہ اور زکوۃ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب کے بعض مباحث خاص طور سے ربو کے سلسلے میں مصنف سے اتفاق کرنا ایک مشکل امر ہے۔ البتہ اس بحث کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے نقد و نظر کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے۔ چوں کہ یہ مسئلہ امت کے سماجی و معاشی مسائل سے راست تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کو سنجیدہ غور و فکر کا موضوع بنانے کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

فہرستِ مضامین

دیباچہ :		۷
باب اوّل :	تصورِ عبادت :	۱۵
	ہندو مذہب میں عبادت	۱۷
	یہودی مذہب میں عبادت	۲۲
	عیسائی مذہب میں عبادت	۲۶
	اسلام میں عبادت	۳۰
باب دوم :	صلوٰۃ (نماز)	۷۳
	صلوٰۃ (مختلف مذاہب میں)	۷۵
	صلوٰۃ کے لغوی معنی	۷۷
	اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم	۸۱
	حقیقتِ صلوٰۃ	۸۶
	صلوٰۃ اور عقیدۂ توحید	۹۰
	دین میں صلوٰۃ کا مقام	۹۹
	ترکِ صلوٰۃ	۱۰۸

Marfat.com

اوقاتِ صلوٰۃ	۱۱۳
صلوٰۃ کے اجزائے ترکیبی	۱۱۷
وجوبِ صلوٰۃ کا تدریجی حکم	۱۲۲
اقامتِ صلوٰۃ کے شرائط	۱۲۵
خصوصیاتِ صلوٰۃ	۱۴۲
تعلیماتِ صلوٰۃ	۱۴۵
موجودہ صلوٰۃ کی بے اثری	۱۵۶
ترکِ صلوٰۃ کے نتائج	۱۶۰
صلوٰۃ باجماعت	۱۶۷
نوافل	۱۷۱
امامت	۱۸۳
تین بڑی اجتماعی نمازیں:	۱۸۷
صلوٰۃِ جمعہ	۱۸۷
صلوٰۃِ عیدین	۱۹۷
مساجد کی حیثیت	۲۰۱
طریقۂ صلوٰۃ	۲۰۵
حقیقتِ دعا	۲۱۳
باب سوم : زکوٰۃ:	۲۲۳
زکوٰۃ (خیرات)	۲۲۵
خیرات ہندو مذہب میں	۲۲۵
خیرات یہودی مذہب میں	۲۲۸

Marfat.com

	خیرات عیسائی مذہب میں	۲۲۹
	خیرات اسلام میں	۲۳۰
	زکوٰۃ اور صدقہ: لغوی مفہوم	۲۳۶
	زکوٰۃ اور صدقہ میں فرق	۲۳۹
	وجوبِ انفاق	۲۴۲
	حقیقتِ زکوٰۃ	۲۴۵
	زکوٰۃ کی اہمیت	۲۴۷
	زکوٰۃ کے مصالح	۲۵۰
	وجوبِ زکوٰۃ کے شرائط	۲۵۶
	نصابِ زکوٰۃ	۲۵۸
	شرحِ زکوٰۃ	۲۶۲
	مصارفِ زکوٰۃ	۲۶۴
	زکوٰۃ سے متعلق چند بنیادی مسائل	۲۸۵
	حقیقتِ ربا (سود)	۲۹۵
باب چہارم:	صوم (روزہ)	۳۲۵
	روزہ اور مذاہب عالم	۳۲۷
	صوم کے لغوی معنی	۳۳۷
	ماہِ صیام کی فضیلت	۳۳۸
	صوم کی اہمیت	۳۴۱
	حقیقتِ صوم	۳۴۳
	مقاصدِ صوم	۳۴۵

Marfat.com

مفسداتِ صوم	۳۵۳
فوائدِ صوم	۳۵۵
صوم پر ایک اعتراض	۳٦۰
معذور الصوم	۲٦۲
''وعلی الّذین یطیقونه'' کا صحیح مفہوم	۳٦۲
نفلی صوم	۳۷٦
سفر میں صوم	۳۷۷
اعتکاف	۳۷۸
شب قدر	۳۷۹
تراویح	۳۸۰
سحری و افطار	۳۸۸
صدقۂ فطر	۳۹۴
رویتِ ہلال	۳۹۵
کتابیات	۴۰۰

Marfat.com

دیباچہ

زیرِ نظر کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں تصوّرِ عبادت سے بحث کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے عبادت کا جو تصور دیا ہے وہ دوسرے مذاہب کے تصوّرِ عبادت کے مقابلے میں زیادہ معتدل اور جامع ہے۔ کتاب کے بقیہ ابواب کا تعلق بالترتیب صلوٰۃ، زکوٰۃ اور صوم سے ہے۔ اسلام کی چوتھی عبادت ''حج'' اس میں شامل نہیں ہے، یہ حصہ ''حقیقتِ حج'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اسلامی عبادات کے موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں بالخصوص عربی، فارسی اور اردو میں چھوٹی بڑی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اس لیے بظاہر اب کسی نئی کتاب کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن جس وقت راقم نے اس عبادتی لٹریچر کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو شدت سے محسوس ہوا کہ یہ موضوع ابھی مزید توجہ چاہتا ہے۔ عبادتی لٹریچر میں بعض ایسے نقائص ہیں جن کی اصلاح بے حد ضروری ہے۔

مثلاً، نماز اور زکوٰۃ میں جو گہرا تعلق ہے اس کو عبادتی لٹریچر میں خاطر خواہ واضح نہیں کیا گیا ہے اور بہت سے علماء نے اس سے صرف نظر کیا ہے۔ معلوم ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ''اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ'' (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) کا جملہ ایک ساتھ آیا ہے۔ اس سے بالکل واضح ہے کہ زکوٰۃ نماز کے حکم میں ہے، یعنی ان دونوں عبادات

Marfat.com

کی ادائیگی یکساں طور پر مطلوب ہے۔ یہاں ملحوظ رہے کہ اس جملے میں واؤ بیان کا ہے۔ ''واتوا الزکوٰۃ'' کا فقرہ دراصل ''اقیموا الصلوٰۃ'' کی معنوی وضاحت کے لیے لایا گیا ہے کہ زکوٰۃ نماز میں شامل ہے، اس سے الگ نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے علماء وفقہاء نے اس لزوم کو نظر انداز کیا ہے۔ اس غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج جو لوگ نماز پڑھتے ہیں وہ انفاق کو لازمی نہیں جانتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انفاق صرف مال داروں پر واجب ہے۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔

عبادتی لٹریچر کا دوسرا بڑا نقص افراط وتفریط ہے۔ اکثر کتابیں بالکل فقہی طرز پر لکھی گئی ہیں یعنی ان میں عبادات کے مسائل واحکام ہی بیان کیے گئے ہیں، ان کی حقیقت وغایت اور دیگر اُمور سے، جن کا تزکیۂ نفس سے گہرا تعلق ہے، تعرض نہیں کیا گیا ہے یا ان کا سرسری ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح بعض کتابوں میں عبادات کے مادی فوائد کا ذکر اس انداز واسلوب میں ہوا ہے کہ روحانی فوائد کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب ''اسلامی عبادات پر ایک نظر'' اس نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ اس کے برخلاف بعض کتابوں میں عبادات کے مادی فوائد کے ذکر سے بڑی حد تک چشم پوشی کی گئی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''ارکانِ اربعہ'' میں یہ کمی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب ''سیرت النبی'' جلد پنجم، جو عبادات پر ہے، غنیمت ہے۔ اس میں عبادات کے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، لیکن زکوٰۃ کے بیان میں ان کا نقطۂ نظر دوسرے علماء کی طرح روایتی ہے۔ وجوبِ انفاق ان کے ہاں بھی نظر انداز ہو گیا ہے۔

عبادتی لٹریچر کا تیسرا نقص یہ ہے کہ اس میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے لازمی تعلق کو واضح نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق نماز اور زکوٰۃ ایمان بالغیب کے لازمی تقاضے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سورہ بقرہ کے بالکل شروع میں فرمایا گیا ہے:

وَيُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ''وہ غیب پر ایمان

Marfat.com

رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انھیں بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

نماز اور انفاق کا معاملہ دراصل خدا سے عہد و میثاق باندھنے کا معاملہ ہے اور یہ عہد ہر قوم سے باندھا گیا ہے۔سورہ مائدہ (آیات: ۱۲، ۱۳) میں جس میثاقِ بنی اسرائیل کا ذکر ہے اس میں خدا کی مخلصانہ عبادت کے ساتھ نماز اور زکوۃ کے قیام و اہتمام کا حکم دیا گیا ہے اور یہودیوں سے صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ جب تک وہ اس عہد پر قائم رہیں گے خدا ان کے ساتھ ہوگا لیکن عہد شکنی کی صورت میں وہ اس کے غضب سے محفوظ نہ ہوں گے۔اس وقت ساری دنیا میں مسلم قوم کی الم ناک پامالی اور ہوا خیزی کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ مسلمانوں کی عہد شکنی کی سزا تو نہیں ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں عبادتی لٹریچر کے مذکورہ تین بڑے نقائص کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ بعض غلط فہمیوں کو بھی رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں مختلف اسباب سے پیدا ہوگئی ہیں اور وہ کافی پختہ ہو چکی ہیں۔مثلاً اسلام نے عبادت کا ایک جامع تصور دیا ہے جو فرد کی ذاتی زندگی سے لے کر اس کے اجتماعی معاملات تک پھیلا ہوا ہے اور انسانی زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس سے باہر نہیں ہے جب کہ دوسرے مذاہب میں عبادت محض پرستش کے چند اعمال و رسوم کی انجام دہی تک محدود ہے۔لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اسی محدود تصورِ عبادت کو قبول کر لیا ہے۔ہم نے کتاب کے بالکل شروع میں ایک باب ''تصورِ عبادت'' کے عنوان سے قائم کیا ہے جس میں اسلام کے علاوہ چند دوسرے مذاہب کے تصورِ عبادت کو بیان کیا گیا ہے تاکہ اسلام کے تصورِ عبادت کا امتیاز معلوم ہو اور مسلمانوں پر ان کے موجودہ تصورِ عبادت کی غلطی پوری طرح واضح ہو جائے۔

مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے برخلاف نماز کا قیام و انتظام

Marfat.com

متعین اوقات کے ساتھ باقی رکھا ہے لیکن اس کی روح سے غافل ہیں۔ انھوں نے نماز کو خدا کی یاد، تزکیۂ نفس اور تعمیرِ سیرت کا ذریعہ بنانے کے بجائے ثواب کے عجمی تصور سے جوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نمازیں پڑھ کر بھی ان کی باطنی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، وہ بہت سی اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہیں حتیٰ کہ بہت سے مسلمان شرکِ جلی کے بھی مرتکب ہیں۔

عبادات کو اجتماعی طور پر انجام دینے کی ایک دنیوی مصلحت یہ تھی کہ مسلمانوں میں اجتماعی شعور اور قومی نظم وضبط پیدا ہوتا کہ دنیا میں ان کے لیے کامیابی کی راہ کھل سکے۔ یہ دنیوی مصلحت نماز باجماعت بالخصوص جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں بالکل واضح طور پر نظر آتی ہے لیکن مسلمان اس سے بالکل غافل ہیں۔ اکثر نمازی یہ نہیں جانتے کہ ایک مقام پر جمع ہو کر عبادت کرنے کے کیا معنی ہیں، امامت کیا چیز ہے، صف بندی اور اطاعتِ امام کی کیا غرض ہے؟ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ نماز باجماعت کی ادائیگی سے زیادہ ثواب ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے عالم و عامی سب کی نمازوں کا قبلۂ مقصود حصولِ ثواب ہے، نہ کہ تزکیۂ نفس اور تعمیرِ سیرت۔

اسی طرح دعا کے معاملہ میں بھی مسلمان شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ وہ نماز میں لمبی لمبی دعائیں مانگتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ دعا مانگنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، اس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ قبولیتِ دعا کے کچھ شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر ایک دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک اہم شرط مطلوبِ دعا کے لیے حتی الامکان کوشش کرنا ہے۔ از روئے قرآن دعا اور کسب وجہد لازم وملزوم ہیں۔

زکوٰۃ کا معاملہ نماز سے بھی زیادہ خراب وخستہ ہے۔ اوّل تو بہت کم مال دار مسلمان شرعی اصول وضابطہ کے مطابق اپنی زکوٰۃ نکالتے ہیں، اور جو زکوٰۃ نکالی جاتی ہے اس کا بڑا حصہ مسلمانوں کے غربا ومساکین تک پہنچنے کے بجائے مختلف حیلوں سے دینی طبقہ یعنی مذہبی

Marfat.com

مدارس میں چلا جاتا ہے۔ انفاق کے معاملے میں پوری اُمت کوتاہ عمل ہے۔ اس بیماری سے طبقۂ علماء بھی محفوظ نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر انفاق نہیں کرتے حالاں کہ طولِ نماز ان کا معمول ہے۔

اس کتاب میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ جس طرح نماز کا قیام اور اس کے لیے مساجد کی تعمیر ایک مذہبی ضرورت ہے اور وہ واجب ہے اسی طرح مال خرچ کرنا بھی ہر مسلمان پر حسب حیثیت لازمی ہے اور اس کے لیے بیت المال کا قیام مساجد ہی کی طرح ضروری ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صدقہ و زکوٰۃ کے اصلی مستحق سماج کے غربا و مساکین ہیں نہ کہ دینی مدارس۔ بلاشبہ دینی مدارس کی ضرورت ہے اور ان کا قیام و انتظام ہونا چاہیے لیکن ناداروں اور مفلسوں کی حق تلفی کر کے یہ کام کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

زکوٰۃ ہی سے جڑا ہوا ایک اہم مسئلہ ربا (سود) کا ہے۔ اس سلسلے میں علماء و فقہاء کا رویہ غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ بلاشبہ ایک اسلامی ریاست میں جہاں اسلام کا اقتصادی نظام نافذ ہو، سود کا لینا دینا ممنوع ہوگا۔ لیکن غیر اسلامی ریاست میں، جہاں سارا معاشی نظام سود پر قائم ہو، اس کو بالکلیہ ممنوع قرار دینا حد درجہ بے دانشی کی بات ہوگی اور عملاً یہ ممکن بھی نہیں ہے، فتوے کی بات دوسری ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اسلام میں جس سود کی ممانعت کی گئی ہے اس کی علت جبر و استحصال ہے اور بالعموم یہ صورت سماج کے غریب طبقہ سے مالی معاملت میں پیش آتی ہے۔ غربا سے سودی لین دین ہر حالت میں ممنوع ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی غریب مسلمان کو سودی قرض دے۔ مستحسن بات یہ ہے کہ رقم کی واپسی کا خیال کیے بغیر غربا و مساکین کی مدد کی جائے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو بلاسودی قرض دیا جائے اور ادائیگی کے لیے ممکن حد تک مہلت دی جائے۔

نظامِ زکوٰۃ کے قیام کی طرف سے مسلمانوں کی موجودہ غفلت کے ذمہ دار دینی

Marfat.com

مدارس کے علماء ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھا دیا ہے کہ صدقہ و زکوٰۃ کا اصلی مصرف دینی مدارس ہیں۔ چنانچہ مسلمان آنکھ بند کر کے اپنی تمام خیراتی رقوم ان مدارس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس غلطی بلکہ "گناہ عظیم" کے تدارک کی ایک ہی صورت ہے کہ خود دینی مدارس کے علماء اور اربابِ نظم اپنی موجودہ روش میں تبدیلی لائیں۔ خدا انھیں اس نیک کام کی توفیق دے۔

نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ بھی خرابیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ روزہ ایک قدیم مذہبی عبادت ہے اور ہر قوم کے مذہبی نظام کا ایک اہم جز رہا ہے۔ لیکن ہر مذہب کے لوگوں نے اس میں غلو اور تشدد سے کام لیا اور اس کو نفس کشی کے مترادف بنا دیا۔ اسلام نے اس تصور کی نفی کی اور بتایا کہ روزہ کا مقصد نفس کشی نہیں بلکہ اس کی اصلاح و تربیت ہے، یعنی تقویٰ کی زندگی گزارنا۔

لیکن بدقسمتی سے اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں نے روزے کے اس بنیادی مقصد کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ماہِ صیام میں افطار کے وقت خورد و نوش کا غیر معمولی اہتمام ہے۔ لذتِ کام و دہن کے بوقلموں مناظر دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ یہ ماہِ صیام ہے اور اس کا مقصد نفس کی اصلاح و تربیت ہے۔ اکل و شرب کے اہتمام میں غیر معمولی دلچسپی اور اسراف کو دیکھ کر ایک اجنبی اس غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے کہ یہ شاید مسلمانوں کا ماہِ طعام ہے۔ علماء نہ صرف اس خلافِ سنت عمل سے مسلمانوں کو روکتے نہیں بلکہ خود اس بدعت میں مبتلا ہیں اور اجتماعی افطار میں شرکت کر کے، جس میں اسراف کی حد تک اہتمام ہوتا ہے، اس کو سندِ تحسین عطا کرتے ہیں۔

مسلمانوں نے دوسری عبادتوں کی طرح روزے کو بھی حصولِ ثواب اور گذشتہ گناہوں کی معافی تلافی کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے، نفس کی پاکی اور نظر کی طہارت اب اس کا مقصد نہیں رہا۔ روزے اور صبر میں جو تعلق ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں لیکن روزے رکھ کر بھی

Marfat.com

مسلمانوں میں صبر وضبط کی عادت پیدا نہیں ہوتی۔ بے صبری اور عجلت پسندی ان کا قومی مزاج بن چکا ہے۔

ماہ رمضان کی ایک بڑی فضیلت یہ ہے کہ اس مبارک مہینہ میں قرآن جیسی عظیم نعمت کا نزول ہوا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس مہینے میں کثرت سے قرآن کی تلاوت ہوتی اور اس کے اوامر و نواہی سے واقفیت حاصل کی جاتی۔ لیکن اس معاملے میں بھی مسلمانوں کا رویّہ غفلت کوشی کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شب میں تراویح کے نام سے قرآن سننے سنانے کا رواج ہے اور بظاہر لوگ اس میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں لیکن اس مشقت سے ان کو کوئی روحانی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ کیا پڑھا جارہا ہے۔ اس سے بڑی مصیبت حفاظِ قرآن کا رویّہ ہے۔ وہ نہ صرف ترتیل یعنی ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنے کا لحاظ نہیں کرتے جب کہ اس کا حکم دیا گیا ہے (وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا۔ سورہ مزمّل۔۴)، اس کے علاوہ قرآن سنا کر اس کا معاوضہ لیتے ہیں جس سے سختی سے روکا گیا ہے (سورہ بقرہ۔۴۱)

ماہ رمضان میں صدقہ و خیرات اور دوسرے نیک کاموں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس مبارک مہینے میں سماج کے غربا و مساکین کے لیے غم خواری اور دردمندی کے جذبات بیدار ہوں اور کثرت سے انفاق کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان حتی المقدور اس مہینہ میں فطرہ کے علاوہ بھی مال خرچ کرتا ہے لیکن دنیا پرست علماء کی غلط رہنمائی کی وجہ سے زکوٰۃ کی طرح فطرہ کا بہت تھوڑا حصہ ہی سماج کے غربا و مساکین تک پہنچتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بیشتر خرابیوں کی ایک بڑی وجہ عبادات کی حقیقی غایت سے جسے قرآن میں تقویٰ یعنی نفس کی مخالفت اور خدا کی اطاعت کہا گیا ہے، ان کی چشم پوشی ہے۔ طرفہ ستم تصوّرِ ثواب ہے جس نے ان کو باطن کی اصلاح و تربیت سے غافل بنایا ہے۔ اس کتاب کے لکھنے کی غرض یہی ہے کہ ان غلط

Marfat.com

تصوّرات کی اصلاح ہو اور عبادات کی روح وگنہ سے مسلمان واقف ہوں۔ راقم کا خیال بلکہ پختہ یقین ہے کہ ارکانِ اربعہ کی صحیح اقامت سے مسلمان دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو اور سربلند ہو سکتے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو فکرِ سلیم اور عملِ صالح کی توفیق دے۔ (آمین)

الطاف احمد اعظمی
تغلق آباد، نئی دہلی

Marfat.com

باب اوّل

تصوّرِ عبادت

Marfat.com

Marfat.com

تصوّرِ عبادت

مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ سے دوسری اقوام کی طرح عبادت کو پرستش کا ہم معنی سمجھ لیا ہے جو ایک بڑی غلطی ہے اور اس کے نتائج مہلک ہیں، اس لیے ہم نے ضروری خیال کیا کہ عباداتِ ثلاثہ پر گفتگو سے پہلے چند بڑے مذاہب کے تصورِ عبادت کے ساتھ اسلام کے وسیع اور جامع تصورِ عبادت کا ذکر کیا جائے تاکہ اسلامی عبادت کے امتیازات واضح ہوں اور مسلمانوں کو بھی معلوم ہو کہ ان کی موجودہ عبادتیں اسلام کے تصورِ عبادت سے کس حد تک موافقت رکھتی ہیں اور عجمی تصورِ عبادت کے اثرات کہاں کہاں اور کن صورتوں میں موجود ہیں۔

ہندو مذہب میں عبادت

ہندو مذہب میں عبادت کا مروّجہ تصور بہت محدود اور بڑی حد تک مشرکانہ ہے یعنی مورتی پوجا اور بعض مذہبی رسوم کی ادائیگی۔ ایسا نہیں کہ ان کی مذہبی کتابوں میں توحید کا تصور ہی موجود نہیں ہے۔ بعض کتابوں میں آج بھی توحید کی تعلیم ملتی ہے اور ان میں واضح لفظوں میں مورتی پوجا کی ممانعت کی گئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''اس ہستی کی کوئی مورتی یا تصویر نہیں، اس کا نام ہی سراپا تعریف ہے''
(یجروید: ۳۲۔۳)

''وہ ایک ہی ہے، اسی کی عبادت کرو۔''
(رگ وید: ۶ ۔۴۵۔۱۶)

''ایشور ہی اوّل ہے اور تمام مخلوقات کا اکیلا مالک ہے، وہ زمین اور آسمانوں کا مالک ہے۔ اسے چھوڑ کر تم کون سے خدا کو پوج رہے ہو۔'' (رگ وید: ۱۰، ۱۲۔۱)

توحید کی یہ تعلیم ان کی فلسفیانہ مذہبی کتاب اپنشد میں ان لفظوں میں موجود ہے:

Marfat.com

ایکم برہم دوستیہ ناستے۔ نیہ۔ نا۔ ناستے کنچن ''ایک ہی خدا ہے، دوسرا نہیں ہے، نہیں ہے، ذرا سا بھی نہیں ہے۔'' اس معاملے میں ہندو فلاسفہ اس حد کو پہنچ گئے کہ انہوں نے صفات سے انکار کردیا (نیتی نیتی) کہ اس سے خدا کی وحدت متاثر ہوتی ہے۔

اس تنزیہی تصورِ خدا کے باوجود ان کا یہ خیال ہے کہ خدائے واحد اس کائنات مادی سے ماورا نہیں بلکہ اس میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس تصور کے مطابق کائنات کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں اس کے مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ان کی پرستش دراصل خدا ہی کی بالواسطہ عبادت ہے۔ پوچھا گیا کہ فی الحقیقت کتنے خدا ہیں؟ یجنا والکیہ نے کہا ''ایک'' اچھا تو بتاؤ کہ اگنی، وایو، آدیتیا، کال (وقت) پران (سانس) انّ (غذا)، برہما، رودرا اور وشنو میں سے ہر ایک کی کچھ لوگ اُپاسنا کرتے ہیں، ان میں سب سے اچھا معبود کون ہے؟ اس نے جواب دیا ''یہ سب جن کا ذکر ہوا دراصل اعلیٰ، غیر فانی اور غیر مادی حقیقت (برہمن) کے مظہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے حقیقتِ اعلیٰ ہی کا دھیان رکھنا چاہیے البتہ اس کے جو مظاہر ہیں ان کی بھی آدمی عبادت کرسکتا ہے اور ان کو چھوڑ بھی سکتا ہے۔(۱)

اس خیال یعنی ہمہ اوست (۲) کے نظریے نے ان کو پہلے مظاہر پرستی اور پھر اصنام پرستی کی منزل تک پہنچایا اور آج ہندو قوم کی اکثریت شرک کی مختلف انواع میں گرفتار ہے۔ مرئی اور غیر مرئی ہر قوت ان کی نظر میں معبود کا درجہ رکھتی ہے اور اس طرح ان کے معبودوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ ہندوؤں (آریہ سماجیوں (۳) کی ایک مختصر جماعت کو چھوڑ کر) کے نظامِ عبادت میں مورتیوں (۴) کے سامنے سر جھکانا، نذر و نیاز چڑھانا، تالی پیٹنا اور مندر کی گھنٹی

(۱) انڈین فلاسفی، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ج ا ص ۱۴۴

(۲) تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی خیال کی بدلی ہوئی شکل وحدت الوجود کا نظریہ ہے جو ماضی میں طبقۂ صوفیاء میں کافی مقبول رہ چکا ہے اور آج بھی اس کے کچھ اثرات بعض مذہبی حلقوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں راقم کی کتاب ''وحدت الوجود، ایک غیر اسلامی نظریہ۔''

(۳) آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴۔۱۸۸۳) تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں اس اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تاکہ ہندو سماج کی اصلاح ہو۔ وہ مورتی پوجا کے سخت خلاف تھے اور صرف ویدوں کو الہامی کتاب مانتے تھے۔

(۴) مورتیاں دراصل دیوتاؤں کی شبیہیں ہوتی ہیں۔ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں اور اس سے مراد نوری مخلوق یعنی فرشتے ہیں۔

Marfat.com

بجانا وغیرہ جیسے رسوم داخل ہیں۔ ہندوؤں کی عبادت کے بعض طریقے عہد نبوی کے مشرکین کے عبادتی طریقوں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً

(سورہ انفال : ۳۵)

''اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

شرک سے ہندو ذہن کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے تیرتھ استھانوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے اور ان کی زیارت کو ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا ہے۔ایک ہندو مؤرخ لکھتا ہے:

''اجودھیا سے زیادہ کوئی مقام متبرک نہیں ہے۔اس شہر کے باشندے تمام گناہوں سے پاک ہیں۔جو شخص یہاں آکر درشن کرتا ہے یا یہاں آنے کا ارادہ اپنے دل میں کر لیتا ہے تو اس کو اور اس کے بزرگوں کو نجات کی دولت مل جاتی ہے۔اور جو کوئی اس سفر کے لیے کسی کو زر نقدی یا سواری دیتا ہے تو اس کو جگ اسمید کا ثواب ملتا ہے اور وہ اور اس کی اولاد بیوان پر چڑھ کر بہشت کو جاتی ہے۔'' (۱)

اسی مؤرّخ نے مزید لکھا ہے کہ:''سر گدوار دریائے سرجو پر ۳۱۸ گز تک محدود ہے۔ یہ مقام دنیا بھر سے متبرک ہے۔جو شخص یہاں مرتا ہے ہزار جنم کے گناہ اس کے معاف ہو جاتے ہیں اور اس کو اواگون سے نجات مل جاتی ہے۔''(۲) اہل ہنود یہی عقیدہ دریائے گنگا کے بارے میں رکھتے ہیں کہ اس میں نہانے سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔(۳)

ہندوؤں کے تصورِ عبادت کی دوسری نمایاں خصوصیت ترکِ دنیا اور نفس کشی ہے۔ ان کا سب سے بڑا عابد وہ شخص ہے جو دنیا چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں جا بسے اور وہاں اپنی تمام خواہشات کو فنا کر کے ایشور کی تپسیا کرے۔(۴) ایسے لوگ جوگی کہلاتے ہیں یعنی خدا رسیدہ۔ڈاکٹر برنیر (۵) لکھتا ہے:

---

(۱) تاریخ اجودھیا، مصنفہ کنور درگا پرشاد (تعلقہ دار ریاست سروین، بڑا گاؤں) ص ۹

(۲) ایضاً ص ۱۵

(۳) الٰہ آباد (یوپی) میں دریائے گنگا کے کنارے مہا کمبھ کا جو میلہ ہوتا ہے اس میں ہندو اسی خیال کے تحت کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

(۴) تپسیا، مراقبہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور اس میں مظاہر کی پرستش بھی شامل ہے۔

(۵) Francois Bernier ایک فرانسیسی سیاح تھا جو سترہویں صدی میں ہندوستان آیا۔ اس کا سفر نامہ Travels in the Mughal Empire، Cnstable London, 1891) کے نام سے چھپ چکا ہے اور ''وقائع سیر و سیاحت'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

Marfat.com

''یہ لوگ ایسے عجیب طور پر زندگی بسر کرتے ہیں کہ اگر میں اس کو بیان کروں تو مجھے شک ہے کہ آیا اس پر کوئی اعتبار کرے گا۔ خصوصاً میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو جوگی کہلاتے ہیں اور جس کے معنی ہیں خدا سے ملا ہوا۔ بہت سے جوگی بالکل ننگے رات دن تالابوں کے پاس بڑے بڑے درختوں کے نیچے یا مندروں کے اردگرد کے مکانوں میں راکھ کا بستر کیے بیٹھے یا پڑے رہتے ہیں۔ بعض کی جٹیں پنڈلیوں تک لٹکتی ہیں۔ بہت سے جوگی ایک یا دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے رکھتے ہیں۔ ناخنوں کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ بڑھ کر مڑ جاتے ہیں۔ ان کے بازو سخت اور غیر طبعی ریاضت کی حالت میں کافی غذا نہ پہنچنے کی وجہ سے مزمن بیماریوں میں مبتلا اشخاص کی طرح سوکھ کر نہایت دبلے پتلے ہو جاتے ہیں اور رگوں اور پٹھوں کے خشک اور سخت ہو جانے کے باعث اس قابل نہیں رہتے کہ جھکا کر ان سے کچھ منہ میں ڈال سکیں۔ ان فقیروں کے پاس ان کے چیلے حاضر رہتے ہیں جو ان کو نہایت ہی مہاتما سمجھ کر ان کا بڑا ادب کرتے ہیں۔''(۱)

وہ مزید لکھتا ہے:

''بعض فقیروں کی نسبت مشہور ہے کہ وہ بڑے روشن ضمیر اور کامل جوگی ہیں اور حقیقت میں خدا رسیدہ ہیں۔ ان کی نسبت بالکل تارک الدنیا ہونے کا گمان ہے۔ یہ فقیر راہبوں کی طرح آبادی سے دور کسی باغ میں تنہا زندگی بسر کرتے ہیں اور شہر میں کبھی نہیں آتے۔ اگر کوئی شخص ان کو بھوجن لا کر دیدے تو لے لیتے ہیں اور اگر کوئی نہ لائے تو عوام کے خیال کے مطابق یہ مہاتما لوگ بھوجن کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ مقدس لوگ اکثر مراقبہ کی حالت میں رہتے ہیں۔ ان کا ادّعا ہے، اور ایک فقیر نے خود مجھ سے کہا، کہ ہماری روحیں گھنٹوں بے خودی اور استغراق کی حالت میں رہتی ہیں، ہمارے ظاہری حواس معطل ہو جاتے ہیں اور ہم کو خدا کا دیدار حاصل ہوتا ہے جو ایک ناقابل بیان سفید اور چمکدار نور کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور ہم کو دنیا کے بکھیڑوں سے بالکل نفرت ہو جاتی ہے اور سرورِ خالص کی حالت میں ہم ایسے محو ہو جاتے ہیں جو ناقابل بیان ہے۔''(۲)

---

(۱) وقائع سیر دسیاحت (سفرنامۂ برنیر) ج ۲، ص ۱۹۰

(۲) ایضاً، ص ۱۹۷

Marfat.com

یہ ٹھیک اسی قسم کی رہبانیت ہے جو عہد تاریک میں عیسائی رہبان کی خصوصیت رہی ہے۔ ہندو عبادت کی تیسری نمایاں خصوصیت مشرکانہ اعمال ورسوم کی کثرت ہے اور آج بھی یہ صورت برقرار ہے۔۲۰۰۲ میں گجرات میں خشک سالی کی وجہ سے لوگ کافی پریشان تھے۔ چنانچہ بارش دیوتا کو خوش کرنے کے لیے صوبے کے مختلف مقامات پر مختلف قسم کی مشرکانہ رسوم انجام دی گئیں۔مندرجۂ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

> The government may not hvave given any directive this time round. but various organisations all over the state are praying for a revival of the monsoon. People are resorting to all sorts of methods to solicit divine intervention to avoid a drought. In Vadodra, plans are underway to bathe an elephant, in Rajkot a round-the-clock *yagna* is going on, in Ahmedabad farmer leaders have forsaken food to bring in the elusive showers. People in Saurashtra and kutch are offering prayers, performing *yagna* and chanting Ram Dhun to appease the Ram God. The Maharashi Dayanand Sarswati Smarak Trust at Tankara has launched vrusthi *yagna*. About 150 students have been chanting vedic mantras continuously for a week from Monday. And from Fridy onwards, the chanting has gone round-the-clock. The mahant of the jagannath temple said, "In a way, it is saying sorry for any misdeed that could have upset God." The Shiv Sena has also organised a varun *yagna* at Kutyana on Sunday. Rituals will be performed at Junagadh, Morbi, Bhayavadar, Veraval and porbunder. Even the Vadodara Municipal Corporation's water supply committee and the Satyam Shivam Sundaram Samiti conducted parjanya *yagna*- a ceremony where an elephant will be bathed with pump and fanfare while a group of Brahmins will invoke Lord Indira (1)

ہندوؤں کے تصورِ عبادت میں خدا (بھگوان، برہما) کے احکام وہدایات کی تعمیل کا کوئی تصور نہیں ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں گیان (معرفت) کو کرم (عمل) پر فوقیت حاصل ہے۔خدمتِ خلق کا تصور بھی غیر واضح ہے گو کہ دوسرے مذاہب کی طرح خیرات (دان پن) کو اس مذہب میں بھی اہمیت دی گئی ہے۔

---

(1) Sunday, The Times of India, New Delhi, August 4, 2002, p.6

Marfat.com

یہودی مذہب میں عبادت

یہودی مذہب میں عبادت کا مفہوم بہت واضح ہے، یعنی خدائے واحد کی پرستش (۱) تورات میں فرمایا گیا ہے:

''تم اپنے لیے بتوں کو یا کسی ترشی ہوئی مورت کو نہ بنائیو اور نہ پوجنے کی لاٹ کو کھڑا کرو اور نہ اپنے لیے کوئی صورت دار پتھر اپنے ملک میں قائم کرو کہ اس کے آگے سجدہ کرو اس لیے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔'' (۲)

تورات کے اس صریح حکم کے باوجود یہود اپنی تاریخ کے ہر دور میں شرکِ جلی یعنی اصنام پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ (سورہ اعراف۔۱۳۸)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا پس ان لوگوں کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں سے لگے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا، اے موسیٰ، ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی معبود (مجسم) مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہ معبود ہیں۔ موسیٰ نے کہا، بلاشبہ تم سخت نادان لوگ ہو۔''

موسیٰ علیہ السلام کی حیات ہی میں یہودیوں نے گوسالہ پرستی کی جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○ (سورہ اعراف۔۱۴۸)

''اور موسیٰ کی قوم نے اس کے (کوہ طور پر چلے جانے کے) بعد اپنے زیوروں

---

(۱) زبور مکمل طور پر خدائے واحد کی حمد و ستائش پر مشتمل ہے۔

(۲) کتاب احبار، باب ۲۶:۱

111918

Marfat.com

سے ایک مجسّم بچھڑا بنالیا، اور اس سے ایک قسم کی آواز نکلتی تھی۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نہ ان سے بات کرتا تھا اور نہ ان کی رہنمائی کرتا تھا (لیکن اس کے باوجود) انہوں نے اس کو معبود بنالیا اور وہ (یقیناً) ظالم (مشرک) تھے۔"

قوم یہود کی اس بت پرستانہ ذہنیت کا ثبوت تورات میں بھی موجود ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کے ادوار میں بھی اصنام پرستی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کتاب یسعیاہ میں ایک جگہ بیان ہوا ہے:

"وہ اہل مشرق کے رسوم سے پر ہیں اور فلیتوں کی مانند شگون لیتے ہیں... ان کی سرزمین بتوں سے پر ہے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت یعنی اپنی انگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں۔"(۱)

یہودیوں کا مذہبی طبقہ گو کہ بت پرستی سے کنارہ کش رہا لیکن عبادت میں ریا اور نمود کے مرض سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو نظام عبادت وضع کیا اس میں عبادت کے خارجی اعمال و رسوم اور بزرگانِ سلف کی روایات کی پاسداری پر بہت زیادہ زور دیا گیا اور اسی چیز نے رفتہ رفتہ عبادت کے مقصود یعنی تزکیۂ نفس کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے مذہبی طبقہ کا جو حالِ زبوں تھا وہ انجیل کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"اے ریا کار فقیہو اور فریسیو (یہودی علماء و فقہاء) تم پر افسوس کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو۔ تمہیں زیادہ سزا ہوگی۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پودینہ، سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو لیکن شریعت کی زیادہ اہم باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم پیالے اور رکابی کو اوپر سے خوب صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کر و تا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے خوبصورت دکھائی

(۱) کتاب یسعیاہ، باب ۲: ۶۔۸

Marfat.com

دیتی ہیں مگر اندر مردہ کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو لیکن باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔"(۱)

یہودیوں میں ظواہرِ عبادت پر اصرار کا ایک بڑا سبب مذہبی احکام و شرائع کی کثرت ہے جس کی وجہ سے مقصود عبادت سے ان کی نظر ہٹ گئی۔مثلاً ان کے ہاں جانوروں کی قربانی ایک بڑی عبادت ہے۔کتاب احبار کے بالکل شروع میں سوختنی قربانی کے متعلق فرمایا گیا ہے:

"اگر اس کی قربانی، سوختنی قربانی، گائے بیل سے ہو تو بے عیب نر لائے۔جماعت کے خیمے کے دروازے پر اپنے مقبول ہونے کے لیے خداوند کے آگے لائے اور وہ سوختنی قربانی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھے کہ اس کے لیے قبول کی جائے اور اس کے لیے کفارہ ہو۔اور وہ اس بیل کو خداوند کے حضور ذبح کرے اور کاہن، جو بنی ہارون ہیں، لہو کو لائیں اور اس کو مذبح پر ہر طرف جو جماعت کے خیمے کے دروازے پر ہے، چھڑکیں۔تب وہ اس سوختنی قربانی کی کھال کھینچے اور اس کو عضو عضو جدا کرے۔پھر ہارون کاہن کے بیٹے مذبح پر آگ رکھیں اور اس پر لکڑیاں ترتیب سے چنیں اور بنی ہارون جو کاہن ہیں، اس کے عضوؤں کو اور سر اور چربی کو ان لکڑیوں پر جو مذبح کی آگ پر ہیں، ترتیب سے رکھ دیں، اور وہ اس کے اوجھ اور پاؤں کو پانی سے دھوئیں اور کاہن سب کو مذبح پر جلائے کہ سوختنی قربانی یعنی خوشبو آگ سے، خداوند کے لیے۔"(۲)

یہودی سمجھتے تھے کہ قربانی کا گوشت جلانے سے جو خوشبو نکلتی ہے اس سے خدا خوش ہوتا ہے جیسا کہ کتاب احبار کی مذکورہ بالا عبارت کے آخری جملہ سے بالکل ظاہر ہے۔یہ ایک بالکل سطحی اور طفلانہ تصورِ عبادت تھا۔بعض احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں میں ظواہرِ عبادت پر زور زیادہ تھا۔مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لیا کرو یا چادر اوڑھ لیا کرو، یہودیوں کی طرح (ننگے) نماز نہ پڑھو۔"نماز میں یہودیوں

(۱) متی باب ۲۳: ۲۰۔۲۸

(۲) احبار، باب ۱:۱-۹ (کتاب احبار میں زیادہ تر قربانی کے احکام مذکور ہیں۔)

Marfat.com

کی طرح نہ جھومو۔'' (۱) '' تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو۔'' (۲) '' میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے۔'' (۳)

ظواہرِ عبادت پر زیادہ زور دینے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی عبادت میں اخلاص و للٰہیت کے بجائے ریا و نمود داخل ہو گیا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یہودی علماء عوام کو دکھانے کے لیے لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے۔ ان کے روزے بھی اس خرابی سے محفوظ نہ تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا:

> '' پھر جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ (یہود) اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے۔ پر جب تم روزہ رکھو تو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ تا کہ تم آدمیوں پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھ کو آشکار بدلہ دے۔ (۴)

یہودیوں کے تصورِ عبادت میں ترکِ دنیا اور نفس کشی کا کوئی عنصر نہیں ملتا اور یہ بظاہر ایک خوبی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل اس کی وجہ زر پرستی اور دنیا کی زندگی سے ان کا غیر معمولی لگاؤ ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ ان کا ہر آدمی ہزار سال تک زندہ رہنا چاہتا ہے (سورہ بقرہ:۹۶) انجیل میں ہے کہ ایک بار ایک یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ابدی زندگی کے حصول کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے اس کو بعض دینی احکام پر عمل کی ہدایت کی۔ اس

---

(۱) کنز العمال، ج ۴، ص ۲۷

(۲) ایضاً ص ۱۱۲

(۳) ایضاً ص ۱۱۴

(۴) متی، باب ۶: ۱۶-۱۸

Marfat.com

نے کہا، میں تو ایک مدت سے ان حکموں پر عمل پیرا ہوں۔ آپ نے فرمایا، اچھا تو کامل بننا چاہتا ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا، جاؤ اور اپنی کل دولت اور سب مال ومتاع بیچ کر میرے پیچھے آلگو۔ یہ سن کر وہ غمگین ہوا کہ دولت مند تھا۔(۱)

عیسائی مذہب میں عبادت

عیسائیوں کے تصورِ عبادت میں شرک پوری طرح دخیل ہے۔ اور یہ شرک نظری اور عملی دونوں طرح کا ہے۔ عیسائیوں کی اکثریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور لارڈ (رب) قرار دیتی ہے۔ شاہ قسطنطین (۳۰۶۔۳۳۷ء) کے عہد میں نیقا کے مقام پر ۳۲۵ء میں تمام چرچوں کی جنرل کونسل میں عیسائیوں کا جو متفق علیہ عقیدہ قرار پایا وہ یہ تھا:

> ''ہم خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں یعنی باپ پر جو مقتدر اعلیٰ ہے، جو تمام مرئی اور غیر مرئی اشیاء کا خالق ہے، اور آقا (لارڈ) عیسیٰ مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو خدا کا بیٹا ہے، جو باپ سے پیدا ہوا، اور ایک ہی ہے جو باپ سے پیدا ہوا، جس کا جوہر باپ کے جوہر کی طرح ہے۔ خدا سے خدا، روشنی سے روشنی، خدا سے سچا خدا، ساختہ نہیں آفریدہ۔ خدا کے جوہر سے متحد، جس کے ذریعہ تمام اشیاء خلق ہوئیں خواہ وہ اشیاء آسمان میں ہوں یا زمین میں، جو ہماری نجات کے لیے آسمان سے نیچے آیا، جسدی ظہور ہوا، آدمی بنا، دکھ سہے اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف صعود کر گیا۔''(۲)

اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں نے خدا کے ساتھ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی شریک عبادت کرلیا۔ یہ شرک صرف دعا اور طلب حاجات تک محدود نہ تھا بلکہ کھلی بت پرستی (Image worship) تک پہنچ گیا۔ مسیحی روما کے کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے مجسّمے نصب تھے اور دیواریں ان کی تصاویر سے آراستہ تھیں اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس بت پرستی کے خلاف جب بھی حکومت کی طرف سے آواز

---

(۱) متی باب ۶: ۶،۷

(۲) اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن (ڈی، سی، سمرویل) ص ۸۹

Marfat.com

بلند ہوئی تو اس کی مخالفت سب سے زیادہ پادریوں اور راہبوں نے کی۔ (۱) ایک عیسائی مؤرخ ان کی بت پرستی کے متعلق لکھتا ہے:

''مشرق میں رومن بادشاہ (Leo the Isavian 717-40) کو یقین تھا کہ اللہ نے مذہب اسلام کو اس لیے بھیجا ہے تا کہ وہ بت پرست عیسائیوں کو سزا دے جو تماثیل اور مقدس آثار کی پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ تمام چرچوں میں تصاویر اور مجسموں کو توڑ دیا جائے۔'' (۲)

اس شرک میں عیسائیوں نے اپنے اولیاء (عیسائی رہبان) کو بھی شریک کر لیا تھا۔ راہبوں میں سے جو راہب اپنے روحانی کمالات میں زیادہ شہرت حاصل کر لیتا اس کے متعلق عیسائی یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ صاحب کشف وکمال ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے پاس اپنی حاجتیں لے کر جاتے اور وہ ان سے نذریں لے کر یقین دلاتا تھا کہ ان کی حاجتیں پوری ہو جائیں گی۔ (۳) بعد کے ادوار میں ایسے راہبوں کے مقابر پر عیسائی جوق در جوق جمع ہوتے اور ان کو صاحب اختیار سمجھ کر ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے۔ ان کے مقابر سجدہ گاہ بن گئے تھے۔ قرآن مجید میں عیسائیوں کی اولیاء پرستی کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

(سورہ توبہ۔ ۳۱)

''انہوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ انہیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔''

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں: ہسٹری آف انٹلکچول ڈویلپمنٹ آف یورپ، جان ولیم ڈریپر، ج ۱، ص ۴۰۵، تا ۴۱۲

(۲) اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن، ص ۱۵۷

(۳) ایضاً

Marfat.com

عیسائیوں کے تصور عبادت کی دوسری نمایاں خصوصیت رہبانیت یعنی ترک دنیا اور نفس کشی ہے۔ اس معاملے میں عیسائی راہب اور ہندو جوگی یکساں ہیں۔ یورپ کے عہدِ تاریک (400-1000) میں اس تصور نے نا قابلِ بیان حد تک فروغ پایا۔ عیسائی مؤرخ ڈی سمرویل لکھتا ہے:

''عیسائیت نے زہد و تقویٰ کے لیے ترک دنیا کو لازمی قرار دیا۔ عیسائی راہبوں کے نزدیک ازدواجی زندگی اور والدین جیسے دنیوی علائق سے زیادہ اہم چیز خود اپنی زندگی اور نفس کا تزکیہ تھا۔ چنانچہ اس تصور کے تحت وہ انسانی آبادیوں سے نکل کر جنگلوں، پہاڑوں اور دوسرے مقامات پر جانے لگے، ایک دو کی تعداد میں نہیں، ہزاروں کی تعداد میں۔ ان مقامات پر وہ نہایت فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے، گندی حالت میں رہتے اور بیماریوں کو دیدہ و دانستہ دعوت دیتے تھے۔ سینٹ ایسوبیس (St.Eusebius) تین سال تک ایک خشک کنویں میں محوِ عبادت رہے۔ سینٹ سبینوس (St.Sabinus) صرف موٹے اناج پر جو مہینوں پانی میں بھیگ کر سڑ جاتے تھے، زندگی گزارتے تھے۔ سینٹ بساریان (St.Basarion) نے چار دن اور چار راتیں کانٹوں کی جھاڑی کے درمیان گزاریں۔

اس نفس کشی کی سب سے بھیانک مثال سینٹ سمیان (ST.Simeon) کی ہے۔ انہوں نے اپنے جسم کو رسیوں سے اتنا کس کر باندھ لیا تھا کہ یہ رسیاں ان کے گوشت میں پیوست ہو کر سڑ گئیں۔ ان کے جسم سے اتنی سخت بدبو آتی تھی کہ کوئی شخص ان کے پاس کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وہ حرکت کرتے تو ان کے جسم سے کیڑے گرتے تھے۔ انہوں نے ۶۰ فیٹ اونچا ایک مینار بنوایا تھا جس کا محیط ایک گز تھا۔ اس مینار پر وہ تیس سال تک ہر قسم کے موسم میں محو عبادت رہے۔ یہی عیسائی ولی ایک سال تک ایک پیر پر کھڑے رہے اور دوسرے پیر کو جس میں قرحہ تھا ڈھانک رکھا تھا۔ جب کوئی کیڑا اس زخم سے گر جاتا تو ان کا سوانح نگار جو ان کے پاس ہی رہتا تھا اس کو اٹھا کر دوبارہ زخموں میں رکھ دیتا تھا اور یہ فقیر ان کیڑوں سے کہتا: کھاؤ جو خدا نے تم کو دیا ہے۔ اس عیسائی ولی کا جب انتقال ہوا تو دین عیسوی کے ماننے والوں اور ان کے علماء مجتہدین کا ایک ہجوم ان کے جنازے میں

Marfat.com

شریک ہوا اور ہر شخص کی زبان پر یہی صدا تھی "وہ سب سے عظیم عیسائی درویش کا نمونہ تھے۔" (۱)

چھٹی صدی عیسوی میں اس ترک دنیا بلکہ نفرت دنیا میں کمی ہوئی اور عیسائی رہبان جنگلوں اور پہاڑوں کے بجائے ایک جگہ خانقاہ بنا کر رہنے لگے لیکن دنیا سے بے التفاتی ہنوز قائم رہی، اور یورپ میں نشأۃ ثانیہ کے آغاز تک کسی نہ کسی صورت میں اس کا سلسلہ جاری رہا۔

عیسائیوں کے تصورِ عبادت کی مذکورہ خرابیوں میں اب کافی کمی آ گئی ہے، رہبانیت کے اعمال و مظاہر تقریباً معدوم ہو چکے ہیں۔ لیکن شرک آج بھی باقی ہے۔ عیسائی قوم اپنی تمام سائنسی فتوحات اور روشن دماغی کے باوجود مذہبی معاملے بالخصوص عقیدۂ توحید کے باب میں کل کی طرح آج بھی اپنی سابقہ طفلانہ روش پر قائم ہے، یعنی یہ کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے اور اس دنیا کے لارڈ (رب) ہیں۔

دیگر مذاہب کی طرح عیسائی مذہب میں بھی غربا و مساکین کی امداد و اعانت کو ایک بڑی نیکی خیال کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں رہبانیت کے فروغ کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ ہو سکی لیکن رہبانیت کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس تصور نے کافی ترقی کی اور آج اس پہلو سے عیسائی قوم جملہ اقوامِ عالم سے آگے ہے۔ آج دنیا کے جس ملک میں بھی طوفان، زلزلہ، قحط، وبائی امراض اور خانہ جنگی جیسے واقعات پیش آتے ہیں وہاں عیسائیوں کی مختلف تنظیمیں آفت رسیدوں کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ملکوں میں عیسائی مشنریوں نے شفاخانے قائم کیے ہیں جہاں پوری لگن کے ساتھ غریبوں اور محتاجوں کو طبی امداد مہیا کی جاتی ہے۔ مدر ٹریسا کی خدمات سے کون انسانیت نواز واقف نہ ہوگا۔

عیسائیوں کے اس طرز عمل کی تفہیم انجیل میں بیان کردہ ایک روایت سے ہوتی ہے۔ ایک بار یہودی علماء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بغرض امتحان آئے اور پوچھا کہ اے استاد! تورات کی اولین اور اہم تعلیم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے پورے دل اور پوری جان سے خدا سے محبت رکھ اور اسی طرح پورے دل اور پوری جان سے اپنے پڑوسی سے محبت

---

(۱) اے شارٹ ہسٹری آف آور ریلیجن، ص ۱۴۵، ۱۴۶

Marfat.com

رکھ۔"(۱) عیسائیوں نے اپنے پیغمبر کی اس سادہ تعلیم کو حرز جان بنالیا بالخصوص اس کے دوسرے جز یعنی خدمتِ خلق کو۔ آج یہی ایک چیز ان کے مذہب کا طغرائے امتیاز ہے۔

دنیا کے تین اہم مذاہب کے تصور عبادت کی توضیح کے بعد اب ہم اسلام کے تصورِ عبادت کی شرح و تفصیل کریں گے۔

اسلام میں عبادت

اسلام کے تصورِ عبادت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے لفظ عبادت کے معنی و مفہوم کو، جو عربی زبان ہی کا ایک لفظ ہے، ذہن نشین کرلیں۔ عبادت کے لغوی معنی انتہائی عجز و تذلّل کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں:

"عبودیت کے معنی اظہار فروتنی کے ہیں اور عبادت کے معنی اس سے بھی ایک درجہ آگے یعنی غایت درجہ فروتنی کے ہیں۔ اس کی مستحق صرف وہ ذات ہے جس کی مہربانیاں بے پایاں ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے: ان لاتعبدوا الا ایاہ "صرف اسی کی عبادت کرو۔" (۲)

معروف عربی لغت لسان العرب میں ہے:

"عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ عبد الطاغوت یعنی اس نے طاغوت کی اطاعت کی اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ایاک نعبد یعنی ہم تیری ہی عاجزانہ اطاعت کرتے ہیں۔ اور لغت میں عبادت کے معنی اطاعت مع الخضوع ہیں چنانچہ وہ راستہ جو آمد و رفت کی کثرت سے پامال ہو گیا ہو طریق معبّد کہلاتا ہے۔"(۳)

تاج العروس میں ہے:

"لغت میں عبادت کے معنی اطاعت مع الخضوع کے ہیں۔"(۴)

---

(۱) متی، باب ۲۲: ۳۶ تا ۴۰

(۲) دیکھیں، مفردات راغب، بذیل مادہ "عبد"

(۳) لسان العرب، ج ۳، ص ۲۷۲

(۴) تاج العروس، ج ۲، ص ۴۱۱

Marfat.com

مفسرین نے بھی عبادت کے یہی معنی لکھے ہیں۔ امام طبری فرماتے ہیں:

''جملہ اہل عرب کے نزدیک عبودیت کی اصل ذلت ہے اور اسی لیے وہ راستہ جو مسافروں کی آمدورفت کی کثرت سے پست و پامال ہو چکا ہو طریق معبّد کہلاتا ہے۔ طرفہ کا شعر ہے:

تباری عتاقاً ناجیات، واتبعت
وظیفاً وظیفاً فوق مور معبد (۱)

اس شعر میں مورِ معبّد سے مراد طریق معبّد یعنی پامال راہ ہے۔ اور اسی طرح وہ اونٹ جسے سواری کے لیے رام کیا جا چکا ہو بعیرِ معبّد کہلاتا ہے۔ عبد کو بھی اسی وجہ سے عبد یعنی غلام کہتے ہیں کہ وہ اپنے آقا کا مطیع ومنقاد ہوتا ہے۔ اشعار عرب میں اس کے شواہد اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔'' (۲)

صاحب کشاف لکھتے ہیں:

''عبادت نام ہے غایت درجہ خضوع وتذلّل کا اور اسی لیے اس لفظ کا استعمال صرف اللہ کے سامنے خضوع کے لیے خاص ہے کیونکہ وہی آقا اور منعم حقیقی ہے اس لیے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے آگے خضوع وتذلّل کا اظہار کیا جائے۔'' (۳)

علامہ علاء الدین بغدادی رقم طراز ہیں:

''عبادت انتہائی جھکاؤ اور پستی کا نام ہے (العبادة اقصیٰ غایة الخضوع والتذلل) غلام کو اسی لیے عبد کہتے ہیں کہ وہ بالکل جھکا ہوا اور مطیع ہوتا ہے۔'' (۴)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''لغت میں عبادت کے معنی ذلت کے ہیں۔'' (۵)

---

(۱) ترجمہ ''وہ تیز رفتار گھوڑیوں کا مقابلہ کرتی ہے اور ایک پیر پر کے پیچھے اور دوسرا پیر پامال راستے پر رکھتی چلی جاتی ہے۔''

(۲) تفسیر طبری، ج ۱، ص ۱۶۱

(۳) الکشاف، ج ۱، ص ۹

(۴) تفسیرِ خازن مع البغوی، ج ۱، ص ۱۵

(۵) تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۵

Marfat.com

مفسّرین اور اہل لغت کی اس تشریح سے واضح ہوگیا کہ عبادت میں ذلّت اور خضوع کا مفہوم نمایاں ہے۔ لیکن ان کے معنی میں تھوڑا فرق ہے۔ صاحبِ لسان نے ذلّت کے مفہوم کی وضاحت میں لکھا ہے:

''ذلّت، قوت وشوکت اور غلبہ کی ضد ہے۔ اس کے معنی کمزوری، درماندگی اور مغلوبیت کے ہیں۔ الذل بالکسر کے معنی نرمی اور سہولت کے ہیں۔ یہ صعوبت کی ضد ہے۔ الذُّل بالضم (ضمہ کے ساتھ ذل) بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ ذلیل اور ذلول صفت کے طور پر آتا ہے۔ ذلول کا استعمال غیر ذوی العقول کے ساتھ مخصوص ہے اور ذلت انسان کے لیے۔ ذلّت الدابۃ کا مطلب ہے کہ جانور سواری کے لیے رام ہوگیا۔ فرسٌ ذلولٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو سرکشی چھوڑ کر مطیع ہوگیا ہو، جس پر سواری آسان ہوگئی ہو۔ طریقِ ذلیل اور طریقِ مذلّل اس راستے کو کہتے ہیں جو پامال ہوکر ہموار ہوگیا ہو۔ ذلت القوافی للشاعر کا مطلب ہے کہ شاعر کو قوانی پر پوری قدرت اور غلبہ حاصل ہوگیا ہے۔ تذلّل کے معنی کمزور ہونا، مغلوب ہونا اور مطیع ہونا ہے۔''(۱)

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ذلّت اور تذلّل کا مفہوم ہے سرکشی اور مزاحمت چھوڑ کر مغلوب اور تابع ہوجانا اس طرح کہ جو مغلوب ہو اس کے ظاہر و باطن سے پستی اور کمزوری ظاہر ہو۔ اسی لیے طریقِ ذلیل یا مذلّل اس راستے کو کہتے ہیں جو اس طرح پست و پامال ہو چکا ہو کہ اس پر چلنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور چلنے والا نہایت آسانی سے کسی ادنیٰ رکاوٹ کے بغیر اس سے گزر جائے۔ اس قسم کے راستوں کی ظاہری صورت ان کی پستی اور مغلوبیت کی تصویر ہوتی ہے۔ اسی طرح ''فرس ذلول'' کے معنی، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس گھوڑے کے ہیں جس پر سواری آسان ہو، دوسرے لفظوں میں سوار کسی مزاحمت کے بغیر اس پر سواری کرسکے اور اس کی حرکات و سکنات سے صاف ظاہر ہو کہ وہ سواری کے لیے بالکل پست و مغلوب ہو چکا ہے، اس کے اندر سرکشی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔

خضوع کے معنی جھکنے کے ہیں۔ خضعه الکبر و اخضعه یعنی بڑھاپے نے اس کی

---

(۱) لسان العرب، بذیل مادہ ''ذل''۔ مزید دیکھیں، المصباح المنیر لاحمد بن محمد

Marfat.com

کمر جھکادی۔ ''نعام اخضع'' وہ شتر مرغ ہے جس کی گردن چرنے میں زمین تک جھک جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خضوع کا لفظ جوارح یعنی سر، گردن اور جسم کے جھکنے کے لیے آتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ کسی کو سر جھکا کر نماز پڑھتے دیکھتے تو گردن اٹھا دیتے اور فرماتے'' لیس الخضوع فی الرکاب (خضوع گردن میں نہیں ہے) اور پھر دل کی طرف اشارہ کرتے کہ ھھنا (یہاں ہے)۔ اسی لیے خاضع کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو اپنا سر اور گردن مغلوب اور کمزور ہونے کی وجہ سے جھکا لے (الخاضع، المطاطی رأسه وعنقه للذل والاستکانة)

معلوم ہوا کہ خضوع کا لفظ اپنے اندر مغلوبیت کا جو پہلو رکھتا ہے اس میں ظاہر بدن کی مغلوبیت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے یہ اطاعت وانقیاد کے معنی میں زیادہ مستعمل ہے۔ لسان العرب میں ہے: الخضوع إلانقیاد والمطاوعة۔ لیکن اسی اطاعت وانقیاد پر خضوع کا اطلاق ہوگا جو رضا ورغبت کے ساتھ ہو۔ اسی لیے صاحبِ لسان نے خضوع کی تشریح میں انقیاد کے ساتھ مطاوعت (برضا اطاعت) کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن کبھی یہ جبری اطاعت کے لیے بھی آتا ہے۔ (۱)

یہاں یہ بات فراموش نہ ہو کہ عبادت کے لغوی معنی میں پرستش کا مفہوم بھی شامل ہے۔ تعبّد کے معنی تنسک کے ہیں یعنی گوشہ گیر ہو کر کسی برتر ہستی کی یاد اور اس کی تعظیم میں مشغول ہونا۔ متعبّد وہ شخص ہے جو عبادت کے لیے گوشہ گیر ہو جائے۔ ''عبد بہ'' کا مطلب ہے: لزمه فلم یفارقه یعنی اس سے وابستہ ہو گیا اور جدا نہ ہوا۔ مُعبّد کے معنی جہاں منقاد کے ہیں وہاں اس کے معنی معبود کے بھی ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

تقول لاتبقی علیك فاننی اری المال عند المسکین معبدا

''میری بیوی ملامت کرتی ہے کہ نمود و دہش میں تو اپنا بھی خیال نہیں رکھتا۔
میں تو دیکھتی ہوں کہ مال بخیلوں کے یہاں پوجا جاتا ہے۔''

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں، لسان العرب، ج۹، ص ۴۲۵۔۴۲۶

Marfat.com

قرآنی مفہوم

قرآن مجید کی بکثرت آیات میں عبادت اور اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے اور اس سے اس کا واقعی مفہوم بالکل متعین ہو جاتا ہے، یعنی اطاعت مع الخضوع۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا
جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝

(سورہ مومن۔ ٦٦)

''اے نبی، ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے ان کی عبادت سے منع کیا گیا ہے جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے رب کی طرف سے میرے پاس روشن دلائل آ چکے ہیں۔ اور مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں رب کائنات کے آگے اپنا سر جھکا دوں۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا
وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝ (سورہ بقرہ۔ ۱۳۳)

''انھوں (اولاد یعقوب) نے کہا کہ ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم واسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو تنہا معبود ہے اور ہم اسی کے مطیع و فرماں بردار ہوں گے۔''

مذکورہ دونوں آیتوں میں ''اُسلم اور مسلمون'' کے الفاظ دراصل ''اعبد اور نعبد'' کی معنوی وضاحت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہے کہ لغت میں اسلام (۱) کے معنی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں۔ بعض مقامات پر عبادت کے اس مفہوم کو کھول دیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

---

(۱) اس لفظ کے مادہ میں خود کو حوالہ کر دینے کا مفہوم غالب ہے اور یہیں سے اس میں اطاعت و فرماں برداری کے معنی پیدا ہوئے۔

Marfat.com

فَقَالُوْا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝

(سورہ مومنون۔٤٧)

''انہوں نے کہا، کیا ہم لوگ اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) ہماری مطیع ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ۝

(سورہ مریم۔٤٤)

''ابا جان، شیطان کی بندگی نہ کیجیے، بے شک شیطان نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے۔''

آخری آیت میں شیطان کی عبادت کے معنی اس کی اطاعت و پیروی کے ہیں۔ اس لیے کہ معروف معنی میں شیطان کی پرستش کوئی آدمی بھی نہیں کرتا ہے۔ آیت میں ''عصیا'' کا لفظ بھی اس معنی کی طرف رہبری کرتا ہے جس کے معنی نافرمان کے ہیں۔ مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں عبادت کے معنی اطاعت ہی کے لکھے ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

لاتعبدالشیطان ای لاتطعه فی عبادة هذه الاصنام (۱)

''شیطان کی عبادت نہ کرو یعنی ان بتوں کی پوجا کرنے میں اس کی اطاعت نہ کرو۔''

علامہ نسفیؒ لکھتے ہیں:

ای لاتطعه فیما سول من عبادة الصنم (۲)

''یعنی ان بتوں کی پوجا کرنے کی گمراہی میں اس کی اطاعت نہ کرو۔''

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

ای لاتطعه فیما یامرك من الکفر ومن اطاع شیئا فی معصیة فقد عبده (۳)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۲۳

(۲) مدارک التنزیل، ج ۳، ص ۳۶، ۳۷

(۳) تفسیر قرطبی، ج ۱۱، ص ۱۱۱، مزید دیکھیں، فتح القدیر (شوکانی)، ج ۳، ص ۳۲۴

Marfat.com

''جس کفر کا یہ تجھے حکم دیتا ہے اس میں اس کی بات نہ مان، اور جس نے نافرمانی میں کسی کی ادنیٰ اطاعت بھی کی تو گویا اس نے اس کی عبادت کی۔''

اس سلسلے میں قرآن مجید کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ (سورہ سبا۔۴۱)

''بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے''

اس آیت میں بھی عبادت کے معنی جنوں کی اطاعت کے ہیں۔ علامہ ابن جوزیؒ لکھتے ہیں:

بل كانوا يعبدون الجن اى يطيعون الشياطين فى عبادتهم۔ (۱)

''بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے یعنی ان کی عبادت کرنے میں شیاطین کی اطاعت کرتے تھے۔''

یہ آیت بھی قابل ملاحظہ ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يَا بَنِىْٓ اٰدَمَ اَلَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ

(سورہ یٰسٓ۔۶۰)

''اے بنی آدم، کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کرو گے۔''

اس آیت میں بھی شیطان کی عبادت کے معنی اس کی اطاعت کے ہیں۔ ابن جوزیؒ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

الم اعهد اليكم اى الم أمركم، الم اوصكم، ولا تعبدوا بمعنى لاتطيعوا، الشيطان هو ابليس زين لهم الشرك فاطاعوه۔ (۲)

---

(۱) زادالمسیر ج۶،ص ۴۶۳، مزید دیکھیں، معالم التنزیل، بغوی، علی حاشیہ وفی النسفی، ج۳، ص ۳۲۸

(۲) زادالمسیر، ج۷، ص ۳۰

Marfat.com

''کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا یعنی میں نے تمہیں حکم نہیں دیا، کیا تمہیں وصیت نہیں کی۔ اور لاتعبدوا بمعنی لاتطیعوا ہے یعنی اطاعت نہ کرو۔ شیطان سے مراد ابلیس ہے جس نے ان کے لیے شرک کو مزین کیا پس انہوں نے اس کی اطاعت کی۔''

معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں عبادت کا لفظ واضح طور پر اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہر اطاعت کو عبادت نہیں کہیں گے۔ عبادت کا اطلاق صرف اس حالت پر ہوگا جس میں سر کے ساتھ دل بھی پوری طرح جھکا ہوا ہو، یعنی برضا ورغبت تابعداری اور سرافگندگی۔ اس کے برخلاف صورت کو قرآن مجید نے استکبار سے تعبیر کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا۝ (سورہ نساء۔ ۱۷۲)

''اور جو شخص اس کی عبادت (یعنی اطاعت و بندگی) کو اپنے لیے عار سمجھے گا اور استکبار کرے گا تو وہ (ایک دن) سب کو اپنے پاس جمع کرے گا (اور اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کبریائی کے لائق کون ہے)

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰۤئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝ (سورہ نحل۔ ۴۹)

''آسمانوں اور زمین کی تمام ذی حیات مخلوقات اور فرشتے سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور وہ استکبار نہیں کرتے۔''

اس آخری آیت میں سجدہ کے لفظ نے استکبار کے معنی کو بالکل متعین کر دیا ہے یعنی خدا کے بالمقابل اپنی ہستی کو بڑا سمجھنا اور اس کے سامنے سر اطاعت جھکانے سے اعراض کرنا، اس لیے لازماً عبادت کے معنی ہوئے، خدا کے بالمقابل اپنی ہستی کو حقیر ترین سمجھنا اور اس کے

Marfat.com

آگے سر اطاعت خم کرنا۔ لیکن عبادت میں جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا، اطاعت مع الخضوع یعنی برضا و رغبت تابعداری کا مفہوم غالب ہے۔

حقیقت عبادت

عبادت کے مذکورہ بالا لغوی اور قرآنی مفہوم کی روشنی میں دیکھیں تو اسلام میں عبادت کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز خواہ چھوٹی ہو یا بڑی خدا کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کر رہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (سورہ ال عمران۔۸۳)

''آسمانوں اور زمین میں جو بھی زندہ وجود ہے وہ اس کے آگے، خواہ خوشی سے اور خواہ جبر سے، سرفگندہ ہے''

جبری اطاعت کا قانون پوری کائنات میں نافذ ہے۔ اس قانون سے انسان کی تکوینی زندگی بھی مستثنیٰ نہیں ہے لیکن اس کی تمدنی اور اخلاقی زندگی اس جبری اطاعت سے آزاد ہے۔ زندگی کے اسی حصے کو اپنی خوشی سے خدا کی مرضی کے تابع کر دینا حقیقی معنی میں عبادت ہے، اور یہی اسلام کی حقیقت بھی ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ۔۱۳۳)

''انہوں نے کہا، ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی، جو تنہا معبود ہے، عبادت کریں گے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہوں گے۔''

اور یہی انسان کی غایتِ تخلیق بھی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (سورہ ذاریات۔۵۶)

''ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

اس آیت میں جس عبادت کو انسان کی غایتِ تخلیق کہا گیا ہے وہ دل کی کامل رضا و رغبت کے ساتھ خدا کی فرماں برداری ہے۔ اسلام میں ایک عبادت گزار سے جہاں یہ

Marfat.com

مطلوب ہے کہ وہ اپنے اعضاء و جوارح سے خدا کے سامنے عجز و تذلل کا اظہار کرے، جسے عرف عام میں پرستش سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہاں اس سے یہ بھی مطلوب ہے کہ وہ معاملاتِ زندگی میں دل کی مکمل رضا کے ساتھ حتی المقدور خدا کی فرماں برداری کرے اور اس کی نافرمانی سے بچے۔ بندے کے اس عابدانہ رویّے کا نام قرآن مجید کی زبان میں تقویٰ ہے۔ عبادت اور تقویٰ میں گہرا رشتہ ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس ربط و تعلق کو واضح کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ (سورہ نوح۔۳)

''یہ کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَاِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ (سورہ عنکبوت۔۱۶)

''اور ابراہیم کہ جب اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ○

(سورہ مومنون۔۵۲)

اس آیت میں ''فاعبدون'' کی جگہ ''فاتّقون'' (پس میری نافرمانی سے بچو) کے جملہ نے عبادت کے مفہوم کو کھول دیا ہے کہ وہ دل سے خدا کی اطاعت و فرماں برداری کا نام ہے۔

اخلاصِ عبادت

اسلامی عبادت کے مفہوم میں جس طرح برضا و رغبت خدائے واحد کی اطاعت و بندگی کا مفہوم، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، بنیادی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح ضروری ہے کہ یہ اطاعت و بندگی خالص ہو، اس میں کسی طرح کی آمیزش نہ ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں اس بے آمیز عبادت کو ''اخلاص دین'' کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

اِنَّـآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ط

Marfat.com

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۝ (سورہ زمر۔۲)

''بے شک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف مطابقِ حق اتاری ہے تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو اطاعت کو اسی کے لیے خاص کرتے ہوئے۔سن لو کہ خالص اطاعت کا سزاوار اللہ ہی ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ الخ

(سورہ بینہ۔۵)

''ان کو بس یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، اطاعت کو اسی کے لیے خاص کرتے ہوئے، بالکل یکسو ہو کر۔''

اخلاص کے لفظی معنی چھانٹ کر الگ کر دینے کے ہیں یعنی اگر کسی چیز میں کوئی اور شے خارج سے آ کر شامل ہو گئی ہو تو اس کو اصل شے سے جدا کر دینا اخلاص ہے۔ خلص الماء من الکدر کا مطلب ہے، پانی کا میل کچیل سے پاک وصاف ہونا۔اسی سے لفظ خالص بنا ہے جو اردو میں کثیر الاستعمال ہے۔عربی میں ''ھذا الثوبُ خالصٌ'' کے معنی ہیں ''یہ صاف رنگ کا کپڑا ہے'' یعنی اس میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہیں ہے۔دین کے معنی لغت میں متعدد ہیں۔ایک معنی اطاعت کے بھی ہیں۔اوپر کی آیت میں یہ اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

''اخلاص اور دین'' کی اس لغوی وضاحت کے مطابق مذکورہ بالا آیات میں اخلاصِ دین کا مفہوم یہ ہوا کہ خدا کی اطاعت کے ساتھ کوئی دوسری اطاعت یا اطاعتیں جمع نہ ہوں۔ خدا کی خالص اطاعت و بندگی کو جن چیزوں نے ہمیشہ سے داغدار کیا ہے ان میں نفس اور مخلوق کی اطاعت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔اوّل الذکر اطاعت کے متعلق فرمایا گیا ہے:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (سورہ جاثیہ:۲۳)

''کیا تم نے دیکھا اس آدمی کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا ہے۔''

مؤخر الذکر اطاعت میں مرئی اور غیر مرئی دونوں مخلوقات شریک رہی ہیں۔غیر مرئی مخلوق میں فرشتے اور مرئی مخلوق میں وفات یافتہ بزرگان دین قابل ذکر ہیں۔ہم نے اوپر سورہ

Marfat.com

زمر کی جو آیت نقل کی ہے، جس میں خدا کی خالص اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ٹھیک متصل یہ آیت ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝

(سورہ زمر۔ ۳)

"اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز (اولیاء) بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔ اللہ ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔"

اس آیت میں بہت واضح طور پر وفات یافتہ صلحاء اور انبیاء کی کارسازی کی تردید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں وہ جھوٹے ہیں اور ناشکرے بھی۔ غیر اللہ پرستی اور غیر خدا کی مطلق کارسازی کے عقیدے کے علاوہ درج ذیل امور بھی اخلاص عبادت کے منافی ہیں:

(۱) خدا کے سوا کسی دوسرے کو، خواہ وہ نبی اور ولی ہی کیوں نہ ہو، سجدہ نہ کیا جائے اس لیے کہ سجدہ عبادت (نماز) کا ایک اہم رکن ہے اور وہ اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ

(سورہ حج۔ ۷۷)

"اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔"

معلوم ہوا کہ رکوع اور سجدہ عبادت میں داخل ہیں اس لیے یہ دونوں عمل کسی بھی شکل میں مخلوق کے لیے جائز نہیں، خواہ تعظیم کی غرض سے ہو اور خواہ اطاعت و بندگی کے لیے۔(۱) یہاں کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ قرآن میں برادرانِ یوسف کی سجدہ گزاری کا ذکر آیا ہے۔ اس سجدہ کا مطلب زمین پر گر جانا نہیں بلکہ تھوڑا آگے کی طرف

(۱) فتاویٰ عالمگیری کے الفاظ ہیں: لا یکفر ولکن یاثم لارتکابہ الکبیرۃ (ص ۳۶۹) "یعنی سجدہ تعظیمی کرنے والوں کی تکفیر تو نہیں کی جائے گی لیکن گنہگار ٹھہرایا جائے گا اس لیے کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔"

Marfat.com

خم کرنا ہے۔ اس کو انگریزی میں Bow down کہتے ہیں(۱)۔ اس سے مقصود اعتراف عزّ و کمال ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آسمان و زمین نیز درخت اور پہاڑ کی سجدہ گزاری کا بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معروف معنی میں سجدہ نہیں کر سکتی ہیں اس لیے لازماً ان کے سجدے کا مطلب اللہ کے طبعی قوانین کی تعمیل ہے۔ پس کسی مخلوق کو حقیقی معنی میں سجدہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ سجدہ گزار اس کا مطیع و عابد ہے اور یہ عمل اخلاصِ عبادت کے منافی ہوگا۔

(۲) کسی مخلوق کو مافوق الطبعی طور پر حاجت روا(۲) اور مشکل کشا سمجھ کر نہ پکارا جائے کہ یہ عمل اخلاصِ عبادت کے منافی ہے۔ صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (سورہ یونس۔۱۰۴)

''اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو جو تمہیں نفع پہنچائیں اور نہ نقصان۔ اگر تم نے ایسا کیا (یعنی حاجتوں اور مصیبتوں میں غیر خدا کو مدد کے لیے پکارا) تو تمہارا اشمار ظالموں (مشرکوں) میں ہوگا۔''

ہر مذہب کے درویشوں اور ولیوں کے بارے میں اس کے غالی پیروؤں کا یہ خیال رہا ہے اور آج بھی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے تصرف کا اختیار رکھتے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اسی باطل خیال کے تحت وہ ان کے مقابر پر جا کر ان سے مدد مانگتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس اختیار و تصرف کی شدت کے ساتھ تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کوئی مخلوق کسی نوع کے مافوق الفطری اختیار سے بہرہ ور نہیں ہے۔ اس مضمون کی چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ○ إِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۚ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ○ (سورہ فاطر۔ ۱۴،۱۳)

---

(۱) توریت کے انگریزی ترجمہ میں اس مقام پر Bow down ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(۲) قرآن مجید میں ہے: فابتغوا عند اللّٰه الرزق واعبدوه واشكروا له (العنکبوت۔۱۷)
''پس اسی سے رزق چاہو، اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر بجالاؤ۔''

Marfat.com

''اس کے سوا جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ (بذات خود) تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے، اور اگر (کسی ربانی ذریعہ سے) سن بھی لیں تو تمہاری حاجت روائی نہیں کر سکتے، اور روز آخرت وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے، ایک باخبر (یعنی اللہ) کے سوا کوئی دوسرا تمہیں اس حقیقت کی خبر نہ دے گا۔''

○ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ○ (سورہ کہف۔۱۰۲)

''پس کیا منکرین حق نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا ولی اور کارساز بنالیں (اور میں ان کا محاسبہ نہ کروں گا) ہم نے جہنم کو ایسے منکروں کے استقبال کے لیے تیار کر رکھا ہے۔''

○ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ○

(سورہ رعد۔۱۶)

''کہو، کیا تم لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر ان کو اپنا ولی اور کارساز بنالیا ہے جو خود اپنے نفع ونقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔''

○ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ○

(سورہ کہف۔۲۶)

''اس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں ہے اور وہ اپنے اختیار میں کسی کو ساجھی نہیں بناتا۔''

بہت سے نادان کہتے ہیں، اور عرب کے مشرکین کا بھی خیال تھا، کہ وہ حاجات وبلایا میں غیر خدا کو محض وسیلہ سمجھ کر پکارتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں چونکہ وہ خدا کے مقرب ہیں اس لیے وہ اللہ سے کہہ کر ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں یا ان کے کہنے سے اللہ ان کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ گویا وہ خدا کے ہاں ان کے سفارشی ہیں۔ قرآن مجید نے اس خیال کو باطل قرار دیا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ

Marfat.com

شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ٥ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ط لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ٥ (سورہ زمر۔۴۳،۴۴)

''کیا انہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے! کہو، اگرچہ نہ وہ کچھ اختیار رکھتے ہوں اور نہ کچھ سمجھتے ہوں۔ کہہ دو کہ سفارش تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے، آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ، سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ٥

(سورہ یونس۔۱۸)

''اور وہ اللہ کے سوا ایسوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، کہہ دو، کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اس کو علم نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ پاک اور بلند ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔''

نادان لوگ جن اولیاء اور بزرگان دین کے وسیلے پر اعتماد کرتے ہیں ان کا حال قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ط اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ٥ (سورہ بنی اسرائیل:۵۶،۵۷)

''کہو کہ ان کو پکار دیکھو، جن کو تم نے اس کے سوا معبود خیال کر رکھا ہے، وہ نہ تم سے کسی مصیبت کو دفع کر سکیں گے، نہ اس کو ٹال سکیں گے۔ یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب تک رسائی حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں

Marfat.com

سے کون سب سے زیادہ مقرب بنتا ہے۔ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمہارے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے قابل۔"

(۳) اخلاصِ عبادت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کسی مخلوق کو شریک نہ کیا جائے۔ یہ گمان رکھنا کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ اس کو جو نعمتیں حاصل ہیں، خواہ اولاد ہو، مال و منال ہو یا عہدہ و منزلت، وہ خدا کے سوا کسی اور نے دی ہیں، براہِ راست یا بالواسطہ، فرمایا گیا ہے:

وَاشْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (سورہ نحل:۱۱٤)

"اور اللہ کی نعمت کا شکر بجالاؤ اگر تم فی الواقع اسی کی عبادت کرتے ہو۔"

قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ تمثیل کے پیرایہ میں اس حقیقت کو ان لفظوں میں ذہن نشین کرایا گیا ہے:

فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَاءَ فِيْمَا اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَا اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(سورہ اعراف: ۱۸۹-۱۹٤)

"پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے وہ لیے چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں (مرد اور عورت) نے اللہ سے، جوان کا رب ہے، دعا کی کہ خدایا اگر تو نے ہمیں ایک تندرست اور بے عیب

Marfat.com

بچہ عطا کیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دیدیا تو اس کی بخشی ہوئی اس نعمت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ کی ذات بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ خدا کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ وہ نہ تو ان کی مدد پر قادر ہیں اور نہ ہی اپنی ذات کو مدد پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر تم ان کو رہ نمائی کے لیے پکارو تو وہ تمہارے ساتھ نہ چلیں۔ خواہ تم انہیں پکارو یا چپ رہو (باعتبار نتیجہ) یکساں ہے۔ تم اللہ کے سوا جن ہستیوں کو پکارتے ہو وہ تو تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔"

(۴) غیر خدا پر اعتماد کہ وہ علی الاطلاق نفع و ضرر پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں، اخلاصِ عبادت کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس اس بات پر اعتماد رکھا جائے کہ ہر قسم کے نفع و نقصان کا سررشتہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ اپنے کسی بندے کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو سارا جہاں مل کر بھی اس کو روک نہیں سکتا اور اگر کسی کے حق میں اس کے اعمالِ بد کی پاداش میں نقصان کا فیصلہ کردے تو اس سے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا ہے۔ (سورہ یونس: ۱۷) عبادت اور توکل کا یہ ارتباط آیۂ ذیل سے بالکل واضح ہے:

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ط (سورہ ھود۔ ۱۲۳)

"اس کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔"

عبادت کا وسیع مفہوم

عبادت کا لفظ جب اصطلاحاً استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے عام طور پر بعض معروف اعمالِ عبادت، مثلاً پرستش، دعا اور قربانی وغیرہ مراد لیے جاتے ہیں، اخلاق اور معاملات اس میں شامل نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام نے عبادت کے اس محدود مفہوم کو ختم کیا اور بتایا کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی عبادت میں داخل ہے۔ جس نے خدا کا حق ادا کیا لیکن بندوں کے حقوق، جو خدا نے اس پر عائد کیے ہیں، ادا نہ کیے تو وہ خدا کی نظر میں عابد شمار نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر عبادت کے اس پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً

Marfat.com

ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَاتُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا o

(سورہ نساء۔۳۶)

''اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی (یعنی جس سے کوئی آشنائی نہ ہو) ہم نشین مسافر اور اپنے لونڈی غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اور (مال وجاہ پاکر) اترانے والوں اور گھمنڈ کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط وَلَاتَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّیْ اَرٰكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّیْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ o وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَاتَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَ هُمْ وَلَاتَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ o

(سورہ ہود: ۸۴۔۸۵)

''اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ (اس وقت) میں تمہیں اچھی حالت (یعنی فارغ البالی) میں دیکھ رہا ہوں (لیکن آگے) میں تم پر ایک گھیرنے والے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ اور لوگوں کی چیزوں میں ان کی حق تلفی نہ کرو اور زمین میں فساد پھیلانے والے بن کر نہ پھرو۔''

Marfat.com

ماضی میں دیگر اقوام کی طرح قوم شعیب کا تصورِ عبادت بھی ناقص تھا۔ چنانچہ جب شعیب علیہ السلام نے انہیں مالی معاملات میں انصاف سے کام لینے کی تلقین کی، جیسا کہ اوپر کی آیت میں بیان ہوا ہے، تو انہوں نے کہا:

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآءُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ○ (سورہ ہود:۸۷)

''کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں سے دست بردار ہو جائیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں، (کیا خوب) بس تمہیں تو ایک دانشمند اور راست رو ہو۔''

فی الحقیقت اسلام میں انسان کا ہر عمل عبادت اور باعثِ اجر ہے، خواہ وہ عمل بادی النظر میں بالکل حقیر ہو بلکہ سراسر دنیا کا کام معلوم ہوتا ہو، بشرطیکہ اس عمل سے خدا کی رضا اور اس کا تقرب مطلوب ہو۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت سعدؓ نے خدمت اقدس میں آ کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، میں اپنی کل دولت راہ خدا میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، سعد تم جو کچھ راہ خدا میں صرف اس کی خوشنودی کی طلب میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو ضرور ملے گا یہانتک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں اس غرض سے ڈالو گے اس کا بھی تم کو ثواب ملے گا۔(۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ ہو:

مـا اطعمت نفسك فهو لك صدقة، ما اطعمت ولدك فهو لك صدقة، مااطعمت زوجك فهو لك صدقة، مااطعمت خادمك فهو لك صدقة○ (۲)

''تم نے خود اپنے آپ کو جو کھلایا وہ تمہاری طرف سے صدقہ ہے، جو اپنی اولاد کو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے، جو اپنی بیوی کو کھلایا وہ

---

(۱) ادب المفرد، امام بخاری، باب: یوجر فی کل شئی

(۲) مسند احمد

Marfat.com

تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے۔''

بہت سے قارئین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ اسلام میں میاں بیوی کے جنسی تعلقات بھی عبادت میں داخل ہیں۔ ایک بار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ مباشرت بھی صدقہ ہے۔ انہوں نے تعجب سے کہا، کیا شہوت کے پورا کرنے میں بھی اجر ہے؟ فرمایا، تمہارا کیا خیال ہے، اگر وہ یہ کام حرام طریقے سے کرتا تو کیا اس پر گناہ نہ ہوتا؟ صحابہ نے کہا، ضرور یہ فعل گناہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا، تو جب وہ یہی کام حلال طریقے سے کرے گا تو اس کو یقیناً ثواب ملے گا۔ (کذالك اذا وضعها فی الحلال کان له اجر) (۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

ما من مسلم يغرس غرسا او يزرع زرعا فيا كل منه طير أو انسان أو بهيمة الا كان له صدقة (۲)

''جس مسلمان نے بھی درخت لگایا یا کھیتی کی پھر اس درخت یا کھیتی سے چڑیا یا انسان یا جانور کھائے تو یہ ضرور اس کی طرف سے صدقہ ہوگا۔''

انسانی معاشرے میں مزاج اور مفادات کے مختلف ہونے کی وجہ سے بسا اوقات آپس کے تعلقات متاثر ہوتے ہیں اور دلوں میں بغض ونفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرنا بھی عبادت ہے۔ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ میں تم کو نفل روزہ و نماز اور صدقہ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں۔ صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے کہا، وہ ہے آپس کے تعلقات کا درست کرنا، یعنی اصلاح ذات البین۔'' (۳)

اتنا ہی نہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دینا، گونگے کو سنا دینا، اور اندھے کو راہ دکھا

---

(۱) رواہ مسلم والترمذی، مزید دیکھیں، مسند احمد

(۲) متفق علیہ

(۳) سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب: اصلاح ذات البین

Marfat.com

دینا بھی اسلام میں نیکی اور صدقہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آدمی کی معمولی باتیں بھی اس کے لیے صدقہ ہیں۔ مثلاً انصاف کی بات کہنا، آدمی کو اس کے جانور پر سوار کرا دینا یا اس کے سامان کو اس پر لا د دینا، بھلی بات کہنا، نماز کے لیے پیدل چل کر جانا اور راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا وغیرہ۔ (۱)

خدمتِ خلق

اسلام کے تصورِ عبادت میں، جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا، خدمتِ خلق کا شمار عبادت میں ہے اور اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ ایک حدیث میں کل مخلوق کو خدا کا کنبہ کہا گیا ہے اور وہی شخص اس کی نگاہ میں زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کے لیے زیادہ خیر خواہ اور نفع بخش ہو۔ حدیث کے الفاظ ہیں: الخلق کلھم عیال اللہ واحبھم الیہ انفعھم لعیالہ (۲)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مسکین اور بیوہ کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے، روزہ دار اور رات میں نماز پڑھنے والے کے برابر ہے (الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ و کالذی یصوم النھار ویقوم اللیل) (۳)

ایک بار کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ کی خدمت میں کچھ لوگ انتہائی پریشاں حالی میں صرف کمبل اوڑھے ہوئے حاضر ہوئے۔ آپ کی نظر جیسے ہی ان کے خستہ حال چہرے پر پڑی اداس ہو گئے۔ گھر میں تشریف لے گئے، کچھ دینے کو نہ ملا تو مایوسی کے عالم میں باہر آ گئے۔ بلالؓ سے کہا کہ تمام مسلمانوں کو جمع کرو۔ وہ جمع ہوئے اور سب نے مل کر کافی سرمایہ اکٹھا کیا اور رسول اللہ کے حوالہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر آپ نہایت خوش ہوئے۔ واقعے کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ کے الفاظ ہیں: فرأیت وجہ رسول اللہ کانہ مذھبۃ ''پھر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ کا چہرہ سونے کی طرح دمک رہا ہے۔'' (۴)

---

(۱) رواہ البخاری ومسلم
(۲) رواہ ابو یعلیٰ
(۳) بخاری، کتاب الادب
(۴) مسلم

Marfat.com

اس سلسلے میں ایک حدیث قدسی بھی قابل ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ روز آخرت فرمائے گا:

''اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری عیادت نہ کی۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب میں بھلا تیری عیادت کیونکر کرتا، تو تو پروردگار عالم ہے۔ خدا فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو اس کی خبر گیری کو جاتا تو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب میں تجھ کو کیونکر کھلاتا تو تو خود سارے جہاں کا پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں (بھوکے) بندے نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب میں تجھے کیونکر پانی پلاتا کہ تو رب العلمین ہے۔ خدا فرمائے گا: میرے فلاں (پیاسے) بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے نہیں پلایا۔ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔''(۱)

انسان تو بڑی چیز ہے، اسلام میں جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کو بھی نیکی کا کام بتایا گیا ہے۔ ایک مجلس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ایک آدمی کا واقعہ سنایا کہ اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ وہ پیاس کی شدت سے زبان نکالے ہوئے مٹی چاٹ رہا ہے (یلھث یاکل الثری من شدۃ العطش) چنانچہ یہ دیکھ کر اس کے دل میں رحم آیا اور اس نے پسند نہ کیا کہ وہ اس کتے کو، جب کہ وہ شدید پیاس میں مبتلا ہے، یونہی چھوڑ دے۔ چنانچہ وہ اس کو لے کر ایک کنویں کے پاس پہنچا اور اپنا موزہ اتار کر اس میں پانی بھرا اور اس کتے کو پلایا۔ اللہ نے اس کے اس عمل کو پسند کیا اور اس کو بخش دیا۔ جب صحابہ نے یہ قصہ سنا تو تعجب سے کہا، اے اللہ کے رسول، کیا جانوروں کے ساتھ حسن سلوک میں بھی اجر ہے (ائن لنا فی البھائم لأجرا یا رسول اللہ) فرمایا، ہر ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک میں اجر ہے۔ (۲)

اسلام نے مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک کو محض نیکی قرار نہیں دیا بلکہ اس کو اسلامی

---

(۱) مسلم، رواہ ابو ہریرہؓ، مزید دیکھیں، ادب المفرد (امام بخاری) باب: عیادۃ المرضیٰ

(۲) رواہ البخاری

Marfat.com

عبادات میں ایک اہم عبادت کا درجہ دیا۔ اسلام میں نماز کے بعد جو دوسری بڑی عبادت ہے وہ زکوٰۃ ہے، جو غربا و مساکین کی خبر گیری کا دوسرا نام ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر نماز کا ذکر زکوٰۃ کا ساتھ آیا ہے (اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوٰۃ) اس التزام سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ نماز اور زکوٰۃ لازم و ملزوم ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ایک بندۂ مومن کا ہر وہ کام، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، خواہ آخرت سے تعلق رکھتا ہو یا دنیا سے، عبادت ہے جو خدا کی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی عبادت میں داخل ہے۔

راہبانہ تصورِ عبادت کی نفی

تاریخ انسانی کے ہر دور میں ہر مذہب کے غالی اور متقشف لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ آدمی خدا کی عبادت میں جس قدر ریاضاتِ شاقہ اٹھاتا ہے اسی قدر اس کو خدا کی رضامندی اور اس کا قرب و اتصال حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال رہا ہے کہ خدا کی خالص اور سچی عبادت کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی انسانی معاشرہ اور اس کے علائق سے قطعِ تعلق کر کے جنگل یا پہاڑ کے کسی گمنام گوشے میں معتکف ہو جائے، اور اگر کسی سبب سے یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم انسانی آبادی سے دور کوئی خانۂ عزلت تلاش کر لے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو آبادی کے اندر ہی کوئی خاموش گوشۂ عافیت ڈھونڈ لے اور وہاں ہنگامہ ہائے دنیا سے بے خبر ہو کر خدا کی عبادت و ریاضت میں اپنا وقت گزارے۔ گویا ان کے نزدیک خدا کے حق کی ادائیگی کے لیے حقوق العباد سے منہ موڑنا اور امکانی حد تک خود اپنے نفس و جسم کے حقوق کو پامال کرنا ناگزیر ہے۔ اس راہبانہ تصور عبادت کی بہت سی مثالیں انسان کی قدیم مذہبی تاریخ میں موجود ہیں، اس سے پہلے ہم عیسائی رہبان اور ہندو جوگیوں کے احوال بیان کر چکے ہیں جن سے راہبانہ تصورِ عبادت کا مفہوم اور اس کے اطراف و جوانب پوری طرح واضح ہو گئے ہیں۔

جہاں تک اسلامی تاریخ کا تعلق ہے اس کے تقریباً ہر عہد میں مسلمانوں کے اندر ایسے مذہبی لوگ موجود رہے ہیں جو راہبانہ تصور عبادت سے ایک حد تک مانوس تھے، اگرچہ وہ عیسائی راہبوں کی طرح مکمل طور پر تجرد کے قائل نہ تھے اور نہ ہی تربیتِ نفس کے معاملے میں

Marfat.com

نفس کشی اور تعذیبِ جسم کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ (۱) پھر بھی ان کا عام طرزِ زندگی راہبانہ تھا، اور وہ عام طور پر مخلوقِ خدا سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارتے تھے اور ازدواجی تعلق بھی برائے نام ہی رکھتے تھے۔ یہ غالی صوفیوں کا طبقہ تھا۔

آج بھی مسلمانوں میں ایک ایسا مذہبی طبقہ موجود ہے جس کے تصورِ عبادت میں راہبانہ تصورِ عبادت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد علانیہ ترکِ دنیا کی تعلیم تو نہیں دیتے لیکن ان کے نزدیک روحانی ترقی اور آخرت میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ عابد و زاہد مسلمان اسبابِ دنیا کی نفی کرے یا ان سے برائے نام تعلق رکھے اور اپنے اوقات کا بیشتر حصہ کسی گوشۂ مسجد یا خانۂ خلوت میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی، مراقبہ اور مجاہدہ میں گزارے۔ ان کے نزدیک یہی معراجِ عبادت ہے۔ یہ خیال بھی راہبانہ تصورِ عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔

راہبانہ تصورِ عبادت کو صحیح تسلیم کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ یہ کارخانۂ خلق و ایجاد ایک کارِ عبث ہے اور اس میں انسانی وجود کی تخلیق بھی بے مقصد ہے۔ اور یہ تصور حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہوگا۔ اسلام نے بتایا کہ یہ کائنات کوئی بازیچۂ اطفال نہیں (وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ، سورہ انبیاء:۱۶) بلکہ اس کی تخلیق کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے اور وہ مقصد حق و باطل کی آویزش اور اس کے نتیجے میں حق کا غلبہ اور باطل کا استیصال ہے (بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ (سورہ انبیاء۔ ۱۸)

اس کے علاوہ اس عالمِ آب و گل میں انسانی وجود ایک مرکزی مقام رکھتا ہے۔ انسان کی عظمت و فضیلت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ خدا نے اس کو زمین میں خلیفہ بنایا۔ (هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ الخ، سورہ فاطر:۳۹) اور اس جہانِ رنگ و بو کی تمام چھوٹی اور بڑی اشیاء کو اس کے دستِ تصرف میں دے دیا (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ : سورہ جاثیہ۔۱۳) اس مقام و مرتبے کے حامل انسان کا مقصدِ تخلیق یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس دنیا سے اپنا ذہنی و عملی رشتہ منقطع کر کے کسی کنجِ

(۱) شاذ میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

Marfat.com

عزلت میں جا بیٹھے اور وہاں عبادت و ریاضت میں اپنی پوری زندگی گزار دے۔

جب معلوم ہو گیا کہ انسان اس زمین میں خلیفہ بنایا گیا ہے تو اس کا مقصدِ تخلیق خود بخود واضح اور متعین ہو جاتا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کی زمین میں اپنی مرضی اور خوشی سے اس کے حکم و ہدایت کے مطابق زندگی گزارے، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ٥ (سورہ ذاریات۔۵۶)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اسلام راہبانہ تصور عبادت کا مخالف ہی نہیں بلکہ اس کے وجود تک کا منکر ہے: لا رهبانية فی الاسلام۔ (۱) اگر کسی شخص کو لفظ رہبانیت سے کوئی خاص انس و شیفتگی ہو تو وہ جان لے کہ اسلام کے لغت میں اس کا مفہوم ترک دنیا نہیں بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: رهبانية هذه الامة الجهاد فی الاسلام (۲) اس اُمت کی رہبانیت اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سختی کے ساتھ رہبانیت کے جملہ اعمال و اشکال، مثلاً ترکِ دنیا یعنی قطعِ علائق، نفس کشی یعنی ترکِ لذائذ، اور عبادت (پرستش) میں ریاضاتِ شاقہ وغیرہ کی نفی کی ہے، جیسا کہ اگلی سطروں سے بالکل واضح ہو جائے گا۔

ترکِ دنیا

قرآن کے بیان کے مطابق، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انسان کا مقصدِ تخلیق خدا کی عبادت ہے، یعنی اس کے احکام کے مطابق اس زمین پر زندگی گزارنا۔ اس تصور عبادت کے مطابق ترک دنیا ممکن نہیں بلکہ اس میں ضروری حد تک شمولیت ناگزیر ہے۔ فرمایا گیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ
فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ

---

(۱) مسند ابن حنبل، ج ۵، ص ۲۶۶

(۲) ایضاً

Marfat.com

تَعۡلَمُوۡنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۝

(سورہ جمعہ۔۹۔۱۰)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ و اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو اللہ کے فضل کی طلب میں زمین میں پھیل جاؤ۔ اور اللہ کو بکثرت یاد کرو تا کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک بندۂ مومن اس دنیا میں کس طرح زندگی گزارے۔ وہ خدا کی عبادت بھی کرے اور فضل خدا (روزی) کی تلاش سے بھی غافل نہ ہو بلکہ اس میں سرگرمی دکھائے۔ البتہ اس بات کا دھیان رکھے کہ تلاشِ رزق میں اس سے ایسا کوئی فعل سرزد نہ ہو جو خدا کے حکم و ہدایت کے خلاف ہو۔ اس آیت میں صرف یہی نہیں کہا گیا ہے کہ وہ روزی کمانے میں جدّ و جہد کرے بلکہ اس عمل کو فضل خدا کی طلب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ لطیف پیرایۂ بیان خود صراحت کرتا ہے کہ روزی کمانا خدا کی نظر میں ایک پسندیدہ فعل ہے اور وہ اپنے بندوں سے اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ روزی کمانے کے لیے زمین میں تگ و دو کریں (فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ)، اس کو محض دنیا کا کام یا خدا کی عبادت میں کوئی رکاوٹ سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ کسب معاش کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ آیا ہے جو اس کی فضیلت کی دلیل ہے۔ فرمایا گیا ہے:

عَلِمَ اَنۡ سَيَكُوۡنُ مِنۡكُمۡ مَّرۡضٰى وَاٰخَرُوۡنَ يَضۡرِبُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ يَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنۡهُ

(سورہ مزمل۔۲۰)

''اس کے علم میں ہے کہ تم میں مریض ہوں گے اور ایسے لوگ بھی جو اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کریں گے اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کا ارادہ رکھتے ہوں گے تو جتنا آسانی کے ساتھ ہو سکے اتنا قرآن پڑھو۔''

اس آیت کی بہترین تفسیر حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول ہے کہ ''خدا کی راہ میں لڑتے

Marfat.com

ہوئے جان دینے کی خواہش کے بعد جس دوسری چیز کی میں تمنا رکھتا ہوں وہ یہ کہ حصول رزق اور کشادگی کی تلاش میں میری موت واقع ہو۔"(۱)

حقیقت یہ ہے کہ ایک آدمی کے ایمان و عبادت کا امتحان کاروبار دنیا ہی میں ہوتا ہے جہاں ہر قدم پر شیطانی وساوس اور نفس کی فتنہ انگیزیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مشہور تابعی ابراہیم نخعیؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ ایک عبادت گزار صوفی اور ایک امانت دار تاجر میں سے کس کو ترجیح دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ امانت دار تاجر میرے نزدیک افضل ہے اس لیے کہ شیطان اسے بہرصورت ورغلاتا ہے، کبھی ناپ تول اور کبھی لین دین میں اسے الجھانے اور غلط راہ میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اسے برابر شکست دیتا رہتا ہے۔

ترک دنیا کا مطلب بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی سے فرار ہے اور یہ اسلام کی نظر میں عبادت نہیں، فعل گناہ ہے۔ اسلام میں جو عبادت مطلوب ہے وہ خدا کے حق کے ساتھ بندوں کے حقوق کو، جس میں نفس کا جائز حق بھی شامل ہے، احکام شریعت کے مطابق ادا کرنا ہے۔ ایک غزوہ میں کسی صحابی نے ایک ایسا غار دیکھا جو نہایت عمدہ جگہ پر واقع تھا۔ قریب ہی میں پانی کا چشمہ رواں تھا اور قرب و جوار میں خوش نما نباتات اُگی ہوئی تھیں۔ صحابی مذکور کو یہ جگہ عبادت اور گوشہ نشینی کے لیے نہایت عمدہ معلوم ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا، یارسول اللہ! مجھ کو ایک غار ملا ہے، جو نہایت پسندیدہ ہے، وہاں ضرورت کی سب چیزیں بھی موجود ہیں۔ اجازت دیں کہ میں ترک دنیا کر کے وہاں جا بیٹھوں اور خدا کی عبادت کروں۔ آپ نے فرمایا، یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں۔ میں جو ابراہیمی مذہب لایا ہوں وہ نہایت آسان، سہل اور بالکل واضح ہے۔"(۲)

نفس کشی

ترک دنیا کی طرح اسلام میں نفس کشی کی بھی اجازت نہیں ہے۔ جائز حدود میں لذائذ دنیا سے متمتع ہونا خلاف عبادت تو کجا عین منشائے الٰہی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

---

(۱) سنن سعید بن منصور

(۲) مسند ابن حنبل، ج۵، ص۲۶۶

Marfat.com

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔ط

(سورہ اعراف۔۳۲)

''پوچھو، کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا، اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو''

دور رسالت میں جب بعض صحابہ نے جوشِ عبادت میں نفس کشی کی راہ میں چلنا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راہبانہ رجحان کی سختی کے ساتھ نفی فرمائی۔ ایک صحابی قدامہؓ بن مظعون اپنے ایک ساتھی کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ''یارسول اللہ ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ آپ نے فرمایا، میں تو یہ دونوں باتیں کرتا ہوں۔ یہ سن کر دونوں صحابی اپنے خیال سے تائب ہوگئے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے شادی کی اور وہ ایک صالح نوجوان تھے. نماز، روزہ اور تلاوت قرآن سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ ان کے والد عمروؓ ان کے گھر گئے تاکہ ان کی بیوی سے ان کا حال معلوم کریں کہ وہ کس طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ بیوی نے کہا: وہ اچھے آدمی ہیں، ہم نے ایک ساتھ ابھی تک بستر میں رات نہیں گزاری ہے۔ یہ سن کر عمروؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ عبداللہ بن عمروؓ خود روایت کرتے ہیں کہ جب میں خدمت اقدس میں پہنچا تو آپ نے کہا:

> ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دن میں روزہ رکھتے ہو اور ساری رات تلاوت کرتے ہو۔ میں نے کہا، ہاں یہ بات سچ ہے یارسول اللہ، لیکن اس سے بھلائی کے علاوہ اور میرا کوئی مقصود نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا، تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے اور تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ داؤد نبی اللہ کی طرح روزے رکھو کہ وہ بڑے عبادت گزار تھے۔ میں نے کہا، یارسول اللہ. داؤد کا روزہ کیا ہے؟ فرمایا، وہ ایک دن ناغہ دے کر روزہ رکھتے تھے۔ مزید فرمایا

(۱) بخاری، کتاب الصوم

Marfat.com

کہ ایک مہینہ میں قرآن ختم کیا کرو۔ میں نے کہا، میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا، بیس دن میں ختم کرلو۔ میں نے کہا، یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا، تو دس دن میں۔ میں نے کہا، یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا، اچھا تو سات دن میں ختم کیا کرو اور اس میں اضافہ نہ کرو۔ تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے اور تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔" (۱)

حضرت عثمان بن مظعونؓ ایک عابد وزاہد صحابی تھے اور نہایت متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آنحضورؐ کو معلوم ہوا کہ وہ شب و روز ذکر و عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ دن کو روزہ رکھتے ہیں اور شب میں بہت کم سوتے ہیں۔ آپ نے ان کو بلا کر پوچھا: عثمان! کیا تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا، خدا کی قسم میں ہرگز آپ کے طریقہ سے نہیں ہٹا ہوں، میں تو آپ ہی کے طریقے پر چلنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ تم روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔" (۲)

قبیلہ باہلہ کے ایک شخص نے اسلام قبول کیا تو ان صحابی نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے۔ ایک سال کے بعد جب وہ مدینہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ ان کو پہچان نہ سکے کیونکہ مسلسل روزوں کی وجہ سے ان کی صورت بالکل بدل گئی تھی۔ انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا، تم تو خوب رو تھے، یہ صورت کیسے بدل گئی؟ عرض کیا، یا رسول اللہ، جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں۔ فرمایا، تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے۔ انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ نے مہینے میں دو روزے کی اجازت دی۔ انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو مہینے میں تین روزے کر دیے۔ انہوں نے اس

(۱) بخاری، کتاب الصوم، باب: حق الجسم فی الصوم

(۲) ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ باب: یومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ

Marfat.com

سے بھی زیادہ کی درخواست کی تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔''(۱)

ایک بار صحابہ کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال معلوم کرنے ازواجِ مطہرات کے گھر پہنچی۔ ان کا گمان تھا کہ آپ ہر وقت سربسجود رہتے ہوں گے، رات بھر نمازیں پڑھتے ہوں گے، تمام دن روزے رکھتے ہوں گے، رات میں کم سوتے ہوں گے، جسم کو کم ہی آرام دیتے ہوں گے، اور عورتوں سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں گے۔ لیکن جب ازواجِ مطہرات نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں بتایا تو وہ ان کے ارادوں سے کم معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو آنحضورؐ سے کیا نسبت، اللہ نے آپ کی مغفرت فرمادی ہے (وَقَدْ غَفَرَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَاتَاَخَّرَ) ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا، میں عمر بھر روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا، تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ رسول اللہ نے جب ان کی باتیں سنیں تو ان کے پاس آئے اور فرمایا:

> انتم القوم الذین قلتم کذا و کذا؟ واللّٰہ انی لاخشاکم اللّٰہ واتقاکم لہ۔ لکنی اصوم وافطر، واصلی وارقد، واتزوّج النساء، فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (۲)
>
> ''کیا وہ تمہیں لوگ ہو جنہوں نے اس قسم کی باتیں کی ہیں۔ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اور اس کی نافرمانی سے احتراز کرتا ہوں تاہم میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقے سے ہٹ گیا اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

رہبانیت کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان مؤثر تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے نتیجے میں اسلام کے ابتدائی دور میں شجرِ رہبانیت کو برگ و بار لانے کا موقع نہیں مل سکا۔ جب بھی کسی کے اندر اس قسم کا میلان پیدا ہوا تو خود صحابہ نے اس کو سختی کے ساتھ روکا۔

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الصوم، باب: فی صوم شہر الحرام

(۲) صحیح بخاری، کتاب النکاح

Marfat.com

حضرت ابودرداءؓ ایک مشہور عابد شب زندہ دار صحابی گزرے ہیں۔ رسول اللہ نے ان کے اور حضرت سلمان فارسیؓ کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔ ایک بار سلمانؓ ان کی ملاقات کو گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا، تمہارے بھائی ابودرداء کو دنیا سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ جب ابودرداء آئے تو سلمانؓ کے لیے کھانا لگایا گیا۔ انہوں نے سلمانؓ سے کہا، تم کھاؤ میں روزے سے ہوں۔ انہوں نے کہا، میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک تم بھی شریک نہ ہوگے۔ چنانچہ وہ شریک طعام ہوئے۔ جب رات ہوئی تو ابودرداءؓ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ سلمانؓ نے کہا، ابھی سو رہو، وہ مان گئے۔ وہ دوبارہ اٹھے تو کہا سو جاؤ۔ جب رات کا آخری پہر آ گیا تو سلمانؓ نے ان کو بیدار کیا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے نماز ادا کی۔ اس کے بعد سلمانؓ نے کہا، اے ابودرداء! تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔ اس لیے ہر حق دار کا حق اسی کو ادا کرو۔ دوسرے دن ابودرداءؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ساری باتیں بیان کیں۔ آپ نے فرمایا، سلمان نے سچ کہا۔"(۱)

ریاضاتِ شاقہ

ہر قوم کے غالی مذہبی لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ عبادت میں جتنی زیادہ جسمانی مشقتیں اٹھائی جائیں اور جسم کو اذیت میں مبتلا کیا جائے اتنا ہی زیادہ اللہ خوش اور راضی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے عیسائی رہبان کی ریاضاتِ شاقہ کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ بعض مسلم صوفیاء بھی عیسائی رہبان کے نقش قدم پر چلے ہیں۔ (۲) لیکن اسلام کی تعلیم اس معاملے میں نہایت سادہ، آسان اور مطابقِ فطرت ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

---

(۱) بخاری، کتاب الادب

(۲) ایک صوفی بزرگ بیس سال تک مستقل کھڑے رہے صرف نماز میں تشہد کے لیے بیٹھتے تھے (کشف المحجوب ص۲۹۲) سریؒ ایک بڑے عبادت گزار صوفی گزرے ہیں۔ وہ اٹھانوے برس تک زندہ رہے اور سوائے مرض الموت کے کبھی لیٹے نہیں (احیاء العلوم ج۴ ص۳۴۹) ایک چشتی بزرگ خواجہ ابومحمد اپنے مکان کے ایک گہرے کنویں میں الٹا لٹک کر عبادت میں مصروف رہتے تھے (سیر الاولیاء ص۴۰) مزید معلومات کے لیے قارئین ابن الجوزیؒ کی کتاب "تلبیس ابلیس" ملاحظہ کریں۔

Marfat.com

مَاجَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ (سورہ حج۔۷۸)

''اور اس نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

ایک دوسری جگہ وضو اور تیمّم کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے:

مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۝ (سورہ مائدہ۔٦)

''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔''

ماہ صیام میں بیماری اور سفر کی حالت میں روزے کا حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

يُرِيۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰٮكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۝

(سورہ بقرہ۔۱۸۵)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو اور اللہ نے جو ہدایت تمہیں بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو، اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں صحابہؓ کو تلقین کی ہے کہ وہ دین میں میانہ روی اختیار کریں اور عبادت میں غیر ضروری مشقت سے کام نہ لیں کہ یہ عیسائی رہبان کا طریقہ ہے، فرمایا:

ان الدین یسر، ولن یشاد الدین احد الا غلبه فسددوا وقاربوا وأبشروا الخ (۱)

''دین آسان ہے، جو کوئی دین میں سختی اختیار کرے گا تو وہ اس پر غالب آجائے گا۔ پس راہ راست پر قائم رہو، میانہ روی اختیار کرو اور خوش خبری دو۔''

(۱) رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر

Marfat.com

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن کا امیر بنا کر بھیجا تو دوسری باتوں کے علاوہ یہ نصیحت بھی کی:

یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا (۱)

''تم دونوں آسانی پیدا کرنا، تنگی پیدا نہ کرنا، خوشخبری دینا، نفرت نہ دلانا، اور خوشی سے ایک دوسرے کی تابعداری کرنا، اختلاف نہ کرنا۔''

آسانی اور سادگی ہی اسلام کی روح ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الاهلك المتنطعون، الاهلك المتنطعون، الاهلك المتنطعون (۲)

''سن لو، غلو کرنے والے ہلاک ہوئے، سن لو، غلو کرنے والے ہلاک ہوئے، سن لو، غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔''

اسلام میں وہی عبادت محمود ہے جو آسانی کے ساتھ مگر پابندی سے کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اکلفوا من العمل ماتطیقون فان اللّٰه لا یمل حتی تملوا، فانّ احب العمل الی اللّٰه ادومه وان قل (۳)

''اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو بآسانی کر سکو کیونکہ جب تک تم نہ اکتاجاؤ خدا نہیں اکتاتا۔ خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ کام وہ ہے جو برابر انجام پائے اگرچہ قلیل ہو۔''

حضرت عائشہؓ نے جب رسول اللہ کو بتایا کہ خولاء بنت تویت نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ وہ رات بھر نہیں سوئے گی اور عبادت کرے گی تو آپ نے فرمایا:

لا تنام اللیل؟ خذوا من العمل ماتطیقون، فواللّٰه لا یسأم

---

(۱) رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر

(۲) رواہ مسلم واحمد وابوداؤد

(۳) ابوداؤد، باب: القصد فی الصلوٰۃ

Marfat.com

اللہ حتی تساموا (۱)

''رات میں نہیں سوئے گی؟ اتنا ہی عمل کرو جتنے کی طاقت رکھتے ہو۔ خدا کی قسم اللہ نہیں اکتاتا جب تک کہ تم نہ اکتا جاؤ۔''

انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک رسی دو ستونوں کے درمیان بندھی ہوئی ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ زینب کی رسی ہے۔ دوران نماز جب وہ تھکن محسوس کرتی ہیں یا وقفہ دینا چاہتی ہیں تو اس کو پکڑ لیتی ہیں۔ فرمایا، اس کو کھول دو۔ تم میں سے ہر شخص کو اس وقت تک نماز پڑھنا چاہیے جب تک طبیعت میں تازگی محسوس ہو۔ جب تھک جاؤ یا وقفہ دینا چاہو تو بیٹھ جاؤ۔'' (۲)

ایامِ جاہلیت میں مناسکِ حج کے اندر بعض باتیں رہبانیت کی داخل ہوگئی تھیں، جو دراصل عیسائی رہبان کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ اسلام کے بعد بھی بعض لوگ ان اثرات سے آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ چنانچہ حضرت عقبہؓ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی کہ وہ پیدل چل کر حج کریں گی۔ عقبہؓ نے اس بارے میں رسول اللہؐ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا، خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں۔ (۳)

آپؐ نے دیکھا کہ ایک شخص بڑھاپے کی وجہ سے چل نہیں سکتا، اس کے بیٹے دونوں طرف سے اس کو پکڑے ہوئے چلا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا، خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو۔ (۴) اسی طرح ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا، یہ کون شخص ہے اور وہ کیوں دھوپ میں کھڑا ہے؟ صحابہ نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ نے فرمایا، اس سے کہو

---

(۱) رواہ البخاری، باب: التہجد باللیل، باب: ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ

(۲) ایضاً

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور، باب: من رای علیہ کفارۃ اذا کان فی معصیۃ

(۴) ایضاً مزید دیکھیں بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب: النذر فیما لا یملک وفی معصیۃ

Marfat.com

کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام کرے اور اپنا روزہ پورا کرے۔(۱)

عمار بن یاسرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ نہایت گرمی کے دنوں میں سفر شروع ہوا تھا۔ راستے میں ہم ایک جگہ ٹھہرے۔ ہم میں سے ایک شخص نکلا اور جلدی سے درخت کے سائے میں چلا گیا۔ دوسرے لوگ تو درخت کے سائے میں آرام کر رہے تھے اور وہ اس طرح سویا ہوا تھا جیسے اذیت میں مبتلا ہو۔ رسول اللہ نے دیکھا تو پوچھا، تمہارے ساتھی کو کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا، وہ روزے سے ہے۔ آپ نے فرمایا:

لیس من البر ان تصوموا فی السفر وعلیکم بالرخصة التی رخص اللّٰہ لکم فاقبلوھا(۲)

''یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم سفر میں روزہ رکھو، اللہ کی دی ہوئی رخصت کو لازم جانو اور اس پر عمل کرو۔''

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ہم میں روزہ دار بھی تھے اور بے روزہ دار بھی۔ ہم نے ایک منزل پر قیام کیا۔ دن نہایت گرم تھا۔ جو روزہ دار تھے وہ تو زمین پر پڑ رہے اور جو لوگ روزہ سے نہیں تھے انہوں نے خیمے نصب کیے اور جانوروں کو پانی پلایا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ نے فرمایا:

ذھب المفطرون الیوم بالاجر (۳)

''آج اجر میں بے روزہ دار بازی لے گئے۔''

ابوداؤد روایت کرتے ہیں کہ وہ اور ان کے والد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ امارت میں انس بن مالکؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ نماز پڑھ رہے تھے، نہایت ہلکی نماز گویا کہ مسافر کی نماز ہو۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو والد نے پوچھا: اللہ آپ پر رحم کرے، کیا یہ فرض نماز تھی یا نفل؟ انہوں نے کہا، یہ فرض نماز تھی، اور یہ رسول اللہ کی نماز تھی۔ میں نے اس میں کوئی خطا نہیں کی ہے بجز بھول چوک کے۔ رسول اللہ فرماتے تھے:

لاتشددوا علی انفسکم فشدد علیکم، فان قوما شددوا

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب: النذر فیما لایملك وفی معصیة

(۲) رواہ الطبرانی فی الکبیر باسناد حسن

(۳) رواہ احمد ومسلم وابوداؤد

Marfat.com

علی انفسهم فشد اللّٰه علیهم، فتلك بقایاهم فی الصوامع والدیار: رهبانیة ابتدعوها ما کتبنا علیهم(۱)

''اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ وہ تم پر سختی کرے۔ ایک قوم نے اپنے نفوس پر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی فرمائی۔ یہ صومعے اور خانقاہیں ان ہی کی یادگار ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی: رہبانیۃ ابتدعوھا الخ۔'' (سورہ حدید۔ ۲۷)

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبلؓ ایک قبیلے کے امام تھے۔ حرام (ابن ملحان) نماز سے فارغ ہو کر اپنے باغ کو سینچنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے اور نماز میں شریک ہو گئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ معاذؓ نماز کو طول دے رہے ہیں تو وہ نماز مختصر کر کے اپنے باغ میں چلے گئے تا کہ اس کو سینچیں۔ جب معاذؓ نے نماز ختم کی تو انہیں یہ بات بتائی گئی۔ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ وہ منافق ہے۔ کیا وہ باغ کو سینچنے کے لیے نماز میں عجلت کرتا ہے۔ جب حرام کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے (اور معاذؓ بھی آئے) اور کہا: اے اللہ کے نبی، میرا ارادہ یہ تھا کہ اپنے باغ کو سینچوں۔ چنانچہ میں مسجد میں آیا تا کہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھوں لیکن جب انہوں (معاذؓ) نے نماز کو طول دیا تو میں اپنی نماز مختصر کر کے باغ میں چلا گیا تا کہ اسے سینچوں۔ انہوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ میں منافق ہوں۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا، کیا تو فتنہ پھیلانے والا ہے، کیا تو فتنہ پھیلانے والا ہے؟ (أفتان انت، أفتان انت) ان کو لمبی نماز نہ پڑھایا کرو۔ ''سبح اسم ربك الاعلی اور والشمس وضحاها'' وغیرہ پڑھایا کرو۔''(۲)

دیکھیں کہ ایک شخص طولِ نماز کی وجہ سے اپنی نماز مختصر کر کے جماعت سے الگ ہو جاتا ہے لیکن رسول اللہ اس کو ذرا بھی ملامت نہیں کرتے بلکہ الٹا حضرت معاذ بن جبلؓ جیسے صحابی کو تنبیہ فرماتے ہیں اور یہ سخت الفاظ ارشاد فرماتے ہیں: أفتان انت، أفتان انت؟

اس واقعے سے صاف طور پر دین اسلام کا مزاج معلوم ہو جاتا ہے۔ اور وہ مزاج یہ

(۱) سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب: فی الحسد

(۲) رواہ احمد باسناد صحیح۔ یہ قصہ صحیحین وغیرہ میں بھی لفظی فرق کے ساتھ مذکور ہے۔ دیکھیں بخاری، بـــــاب: اذا طول الامام وکان للرجل حاجة

Marfat.com

ہے کہ عبادت میں غلو سے پرہیز کیا جائے۔ اللہ کو اپنے بندوں سے جسمانی ریاضتیں نہیں، تقویٰ مطلوب ہے۔ یہ غلو ہی تو تھا جس نے ماضی میں قوموں کو ہلاک کیا ہے، ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

ایاکم والغلو، فان اھلک من کان قبلکم الغلو (۱)

''غلو سے بچو، تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو غلو ہی نے ہلاک کیا۔''

اشکال و رسومِ عبادت

ہر قوم میں عبادت کے کچھ طریقے اور مراسم مقرر ہیں جن کی لوگ دورانِ عبادت پابندی کرتے ہیں۔ یہ طریقے اور رسمیں مقصودِ عبادت یعنی خدا کی یاد اور اس کی اطاعت و بندگی کے اظہار کے لیے مقرر کی گئی تھیں۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ عبادت کے اشکال و مراسم ہی کو اصل اہمیت حاصل ہو گئی اور مقصودِ عبادت نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ بھی ہوا ہے کہ اشکالِ عبادت کے اختلاف کی وجہ سے مذہبی نزاعات پیدا ہوئے، ایک قوم نے دوسری قوم کو گم راہ قرار دیا اور بسا اوقات نوبت جدال تک پہنچ گئی۔ آج بھی مختلف قوموں کے درمیان مذہبی اختلافات کی ایک بڑی وجہ عبادت کے اشکال و اعمال کا اختلاف ہی ہے۔

ماضی میں یہود و نصاریٰ نے اس معاملہ میں کافی غلو کا مظاہرہ کیا ہے۔ قبلۂ عبادت کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک نے دوسرے کو گمراہ اور بے دین قرار دیا اور باہم اختلاف و نزاع کی آگ اس شدت کے ساتھ بھڑکی کہ ان کے عبادت خانے بھی اس کے شعلوں سے محفوظ نہ رہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ط لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ٥ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥ (سورہ بقرہ۔ ۱۱۴)

(۱) رواہ مسلم

Marfat.com

''اوران سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کے ذکر سے روکیں اور ان کی ویرانی کے درپے ہوں۔ ان کے لیے زیبا نہ تھا کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں بڑی سزا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں تو جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ موجود ہے۔ اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔''

یہود نے اس کوتاہ اندیشی اور ظاہر پرستی کا مظاہرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی اس وقت کیا جب تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ انہوں نے اس تبدیلی پر کافی شوروغوغا برپا کیا۔ ان نادانوں کو بتایا گیا کہ سمت قبلہ کا اختلاف دین میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اصل اہمیت نیکی کو حاصل ہے اور یہی اس کا مغز و جوہر ہے اس لیے اس کے حصول میں مسابقت کی جائے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ط (سورہ بقرہ: ۱۴۸) اسی سورہ میں آگے چل کر اس حقیقت کو ان لفظوں میں مزید واضح کیا گیا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

(سورہ بقرہ۔ ۱۷۷)

''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، اور نبیوں پر ایمان رکھے۔ اور مال کی حاجت ومحبت کے باوجود اس کو رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے نیز گردن چھڑانے میں خرچ کرتا ہو، اور نماز قائم کرتا ہو اور زکوٰۃ دیتا ہو، اور جو لوگ عہد کر لینے کے بعد عہد کو پورا کرتے ہوں، اور تنگ دستی، بیماری اور جنگ میں ثابت قدم رہتے ہوں۔ ایسے ہی لوگ

Marfat.com

سچے ہیں اور یہی لوگ فی الواقع خدا ترس ہیں۔"

دوسری قوموں کی طرح مشرکینِ عرب بھی مذہبی اعمال و رسوم کی پیروی کو مقصودِ عبادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ دستور کے مطابق وہ حج سے واپسی پر اپنے گھروں میں پیچھے سے داخل ہوتے اور اس کو ایک بڑی نیکی خیال کرتے تھے۔ قرآن نے اس رسم کو بے فائدہ قرار دیا اور بتایا کہ نیکی دراصل تقویٰ ہے:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

(سورہ بقرہ۔۱۸۹)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں پیچھے سے آؤ بلکہ نیکی اس شخص کی ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا، اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔"

ایامِ حج میں عرفات سے واپسی کے بعد حجاج منیٰ میں قیام کرتے ہیں۔ اس قیام کی مدت میں اختلاف ہوا تو فرمایا گیا:

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ:۲۰۳)

"اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو، جو شخص دو دنوں میں اٹھ کھڑا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ رعایت ان کے لیے ہے جو تقویٰ کا لحاظ رکھتے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور جان لو کہ تم اس کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔"

مذکورہ بالا آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ اسلام عبادت کے اشکال و مراسم کی بجا آوری کا حکم تو دیتا ہے کہ ان کے بغیر عبادت کی ادائیگی ممکن نہیں ہے لیکن وہ اس میں غلو کو پسند نہیں کرتا کہ یہ چیز عبادت گزار کو مقصودِ عبادت سے، جو دراصل نیکی اور تقویٰ ہے، غافل کر سکتی ہے۔ اگر مقصدِ عبادت حاصل نہ ہو تو مجرد عبادت کے ظاہری اعمال و رسوم کی ادائیگی

Marfat.com

سے کوئی فائدہ نہ تو اس دنیا میں حاصل ہوگا اور نہ ہی آخرت میں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی واضح کیا کہ ظواہرِ عبادت میں غلو کوئی پسندیدہ چیز نہیں بلکہ منافیِ عبادت ہے۔ عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرہ کے پاس اس حال میں دیکھا کہ لوگ آپ سے مسائل پوچھتے جاتے تھے۔ ایک شخص نے کہا، یارسول اللہ میں نے رمی کرنے سے پہلے قربانی کرلی۔ آپ نے فرمایا، اب رمی کرلو، اس میں کچھ حرج نہیں (رم و لاحرج فیه) دوسرے نے کہا، یارسول اللہ میں نے قربانی سے پہلے سرمنڈوالیا۔ آپ نے فرمایا، اب قربانی کرلو، اس میں کچھ حرج نہیں (انحر و لاحرج) پس آپ سے جس چیز کی بابت پوچھا گیا، خواہ وہ مقدم کی گئی ہو یا موخر، تو آپ نے یہی فرمایا کہ اب کرلو کوئی حرج نہیں (افعل و لاحرج فیه) (۱)

مناسکِ حج میں تقدیم وتاخیر سے متعلق ایک دوسری روایت ملاحظہ ہو:

عن اسامة بن شريك، قال خرجت مع رسول الله حاجًا فكان الناس ياتونه، فمن قال يارسول الله سعيت قبل ان اطوف اواخّرت شيئا، فكان يقول لاحرج الاعلى رجل افترض عرض مسلم وهو ظالم فذالك الذى حرج وهلك (۲)

''اسامہ بن شریکؓ کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لیے نکلا۔ پس لوگ آپ کے پاس آتے، کوئی کہتا یارسول اللہ میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی، کوئی کہتا، میں نے فلاں چیز پہلے کرلی اور فلاں چیز بعد میں کی۔ آپ ان کو جواب دیتے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ حرج کی بات اور ہلاک کرنے والی بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر حملہ کرے۔''

معلوم ہوا کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں پر جو عبادات فرض کی ہیں ان میں اصل اہمیت اعمال ورسوم کو نہیں بلکہ اس کی روح یعنی تقویٰ کو حاصل ہے۔

---

(۱) بخاری ومسلم، مزید دیکھیں، کتاب العلم ا ابن عبدالبر، ج ا ص ۲۴ (حدیث نمبر ۱۲۷)
(۲) مشکوٰۃ، کتاب المناسک

Marfat.com

عبادات کی غایت

اسلام میں جو چار عبادتیں (نماز، زکوۃ، روزہ، حج) فرض ہیں ان کا مقصود، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تقویٰ ہے یعنی دل کی کامل رضامندی سے اللہ کی فرماں برداری۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کی اطاعت و بندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود آدمی کا نفس اور اس کی متلوّن خواہشات ہیں۔ یہ خواہشات بڑی سرکش اور منہ زور واقع ہوئی ہیں۔ اگر آدمی ہمہ وقت بیدار اور ہشیار نہ ہو اور ان بے عناں خواہشات کو مغلوب کر کے نہ رکھے تو یہ نہایت آسانی کے ساتھ قلب و دماغ پر اپنا غلبہ و تسلط جما لیتی ہیں۔ اس غلبہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خود اس کا نفس ہی اس کا معبود بن جاتا ہے اور وہ خواہشات نفسانی کی پیروی میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ (سورہ جاثیہ:۲۳)

''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات نفس کو ہی اپنا معبود بنا لیا ہے۔''

اسلامی عبادات کی سب سے بڑی غرض یہی ہے کہ مومن ہوائے نفس پر قابو یافتہ ہو اور خواہشات کی اطاعت و غلامی کے بجائے خدائے واحد کی دل سے فرماں برداری کرے اور کسی حال میں اس کے حکم سے روگردانی نہ کرے، دوسرے لفظوں میں تقویٰ کی زندگی گزارے۔ مختلف عبادات کے ذکر میں اس حقیقت کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً نماز کے ذکر میں ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ○ (سورہ مریم۔۵۹)

''پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشات نفس کی پیروی کی۔ یہ لوگ عنقریب اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ترک نماز کا لازمی نتیجہ اتباع شہوات ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ قیام نماز کا ایک بڑا مقصد نفس کے غلبہ کو توڑنا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

Marfat.com

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (سورہ عنکبوت:٤٥)

''بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

زکوٰۃ کے ذکر میں ارشاد ہوا ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (سورۃ الیل:١٨)

''اس (نارِ جہنم) سے اس خدا ترس کو محفوظ رکھا جائے گا جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ وہ پاک ہو جائے۔''

اوپر کی آیت میں جس پاکیزگی کا ذکر ہے اس سے مراد بخل اور حرصِ مال کی گندگی سے نفس کا پاک ہونا ہے:

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورہ تغابن۔١٦)

''اور جو شخص حرص نفس کی آلودگی سے محفوظ رکھا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔''

روزہ کے بیان میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (سورہ بقرہ:١٨٣)

''اے ایمان والو! تم پر اسی طرح روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر وہ فرض تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔''

حج کے ذکر میں ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ

(سورہ حج:٣٧)

''اور اللہ کو نہ جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، اس کے پاس جو چیز پہنچتی ہے وہ صرف تمہارا تقویٰ ہے۔''

مشرکینِ عرب کے یہاں یہ دستور تھا، اور یہود میں بھی یہ رسم مروج تھی، کہ وہ جانوروں کی قربانی کر کے اس کا خون عبادت گاہ پر چھڑکتے اور اس کے گوشت کو مذبح پر جلا کر اس کی خوشبو کو خدا تک پہنچاتے اور یہ گمان کرتے کہ خدا اس عمل سے خوش ہوتا ہے اور ان کے گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ قربانی کا مقصد ان ظاہری اعمال و رسوم کی انجام دہی نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد تقویٰ ہے، یعنی اللہ نے جانوروں کی شکل میں جو نعمت ان

Marfat.com

کو بخشی ہے اس پر اس کا شکر بجالائیں اور اس کے نام پر ان کو ذبح کریں تا کہ دلوں سے مال کی محبت نکلے اور فاقہ کشوں کی بھوک مٹانے کا سامان ہو۔

اسلام کے تصورِ عبادت کی اس تفصیل و توضیح سے قارئین کو معلوم ہو گیا کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اس کا تصور عبادت زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ ایک موحدانہ تصورِ عبادت ہے جس میں شرک کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس میں عبادت کے اشکال و مراسم کے بجائے اس کی روح و کنہ (تقویٰ) کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں عبادت کے راہبانہ تصور کی مکمل طور پر نفی کی گئی ہے اور دین و دنیا کی تفریق کے قدیم مذہبی تصور کو ختم کر کے ہر اس کام کو، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، عبادت قرار دیا گیا جو خدا کے حکم کے مطابق اس کی رضا کے لیے کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں پر عبادت کا اطلاق کیا گیا اور ان کو مناسب اہمیت دی گئی ہے۔

لیکن اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اسلام کا یہ وسیع تصور عبادت اب خود مسلم معاشرہ میں ایک اجنبی چیز بن چکا ہے۔ مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کی پیروی میں عبادت کو رسمی پرستش اور اس کے چند ظاہری اعمال و رسوم کی انجام دہی تک محدود کر دیا ہے۔ معاملاتِ زندگی میں خدا کی فرماں برداری اس کے دائرہ سے خارج ہے۔ غربا و مساکین کی خبر گیری سے، جسے اسلام میں عبادت کا درجہ حاصل ہے، اکثر مسلمان بالکل غافل ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات ان کا غیر موحدانہ رویّہ ہے۔ بہت سے مسلمان نمازیں پڑھتے ہیں مگر بزرگان دین کے مزارات پر جا کر وہاں سجدے بھی کرتے ہیں اور ان کو کارساز سمجھ کر حاجت روائی کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اس سے بڑی توہینِ عبادت اور کیا ہوگی۔ مختصر یہ کہ عبادت اب ایک رسمی عمل ہے اور اس کا مقصد صرف حصولِ ثواب ہے نہ کہ تقویٰ اور تزکیۂ نفس۔

Marfat.com

باب دوم

صلوٰۃ (نماز)

Marfat.com

Marfat.com

صلوٰۃ (نماز)

اسلام کی طرح یہودیت اور عیسائیت میں بھی نماز (Prayer) فرض ہے، لیکن اجزائے ترکیبی، اوقات اور طریقۂ ادائیگی کے لحاظ سے ان میں نمایاں فرق ہے۔ صلوٰۃ (نماز) پر گفتگو سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کی نماز کے امتیازی اوصاف واضح ہوں۔

یہودیوں کی نماز

یہودی مذہب میں نماز کی حقیقت خدا کا شکر بجالانا اور گناہوں کی معافی چاہنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا نے زندگی دی اور تورات عطا کی اس لیے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی تعریف کی جائے اور اس کا شکر بجالایا جائے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> Confession and repentance of sin on the one hand, and thanks giving on the other, are perhaps the two most important parts of worship."

> ''یہودی عبادت دو اہم اجزاء پر مشتمل ہے، ایک اعتراف گناہ اور توبہ واستغفار، اور دوسرا اظہار تشکر۔''

یہودی مذہب میں انفرادی اور اجتماعی دونوں نمازیں ہیں۔ انفرادی نماز کسی وقت ادا کی جاسکتی ہے بالخصوص کسی اہم واقعہ کے ظہور یا بیماری سے شفایابی یا سبت (Shabbat) کے

---

(۱) دی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن (نیویارک/لندن ۱۹۸۷) ج ۱۵، ص ۴۴۶، ۴۴۷

Marfat.com

موقع پر روشنی کرتے وقت۔(۱)

اجتماعی نماز دن میں تین بار ہوتی ہے اور یہ عبادت خانوں (Synagogues) میں ادا کی جاتی ہے۔تورات کا عالم (ربّی) ان کو نماز پڑھاتا ہے۔ ہفتہ یعنی سنیچر کے دن زیادہ بڑا اجتماع ہوتا ہے جس میں تورات کو اونچی آواز میں پڑھا جاتا ہے۔اس میں تمام اسرائیلی مرد اور عورت شرکت کرتے ہیں۔

یہودی اپنی نمازوں میں قدرے ترنّم کے ساتھ تورات کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔ دوران نماز وہ کبھی مراقبے میں چلے جاتے ہیں، کبھی زور سے خدا کو پکارتے ہیں، کبھی کھڑے رہتے ہیں، کبھی کھڑے کھڑے جھومتے ہیں، کبھی جھکتے اور سجدہ کرتے ہیں۔نماز کے وقت ان کا رخ یروشلم کی طرف ہوتا ہے۔

عیسائیوں کی نماز

عیسائیوں کی نماز میں واقعۂ صلیب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔معلوم ہے کہ جمعہ کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دی گئی اور اتوار کو، عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق، وہ جی اُٹھے۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی تک عیسائی بطورِ تشکّر روٹی اور شراب نمازوں میں پیش کرتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں، ان کے عقیدہ کے مطابق، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم اور خون کی علامت کی حیثیت رکھتی تھیں۔(۲)

لیکن دوسری صدی عیسوی میں روٹی اور شراب (۳) کی رسم کی ادائیگی سے پہلے انجیل کی تلاوت کی جانے لگی۔ تلاوت کے بعد امام بتاتا کہ ابھی جو تلاوت کی گئی ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔اس کے بعد وہ وعظ کہتا اور لوگوں کو اچھے اعمال کی تلقین کرتا، بعد ازاں عبادت میں شریک لوگ ایک دوسرے کے لیے دعائے خیر کرتے۔ اس کے بعد مقدّس عشاءِ ربّانی

---

(۱) دی انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن، جلد ۱۵، ص ۴۴۵

(۲) ایضاً جلد ۱۵، ص ۴۴۹

(۳) نویں صدی عیسوی سے تمام مغربی چرچوں میں روٹی اور شراب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں تبدیل کر دیا گیا، یعنی یہ میرا جسم اور یہ میرا خون ہے۔(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن، ج ۱۵، ص ۴۴۹)

Marfat.com

(The Eucharist) یعنی روٹی اور شراب کو میز پر رکھا جاتا۔ ان رسوم کی ادائیگی کے بعد نماز ادا کی جاتی تھی۔ (۱)

جس طرح عیسائیوں میں طریقۂ نماز شروع سے غیر متعین رہا اور وہ برابر بدلتا رہا اسی طرح نماز کے اوقات بھی متعین نہیں تھے۔ شروع میں تین وقت کی نمازیں تھیں لیکن ان کا وقت واضح طور پر مقرر نہ تھا۔ ایک روایت ہے کہ صبح و شام اور آدھی رات کے علاوہ دن کے تیسرے، چھٹے اور نویں گھنٹے میں نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ انفرادی نمازیں تھیں۔ شروع میں صبح کی نماز اجتماعی تھی۔ کبھی شام کی نماز بھی اجتماعی طور پر ادا کی جاتی تھی۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی میں صبح و شام کی نمازیں باقاعدہ اجتماعی طور پر ادا کی جانے لگیں۔ سولہویں صدی میں اس میں مزید اصلاح ہوئی اور انفرادی نمازوں کو بھی دن کے دو اوقات میں خاص کر دیا گیا یعنی صبح و شام۔ بیسویں صدی میں یہ اصلاح کی گئی کہ صبح و شام کی اجتماعی نماز کو باقی رکھا گیا لیکن درمیان میں نفل نمازیں بھی رکھی گئیں جن کی ادائیگی نمازی کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس کے علاوہ ہفتہ میں ایک بار اتوار کے روز اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس میں زبور کی تلاوت ضروری ہے۔ (۲)

یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے اس مختصر ذکر کے بعد اب ہم صلوٰۃ یعنی اسلامی نماز کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے لفظ صلوٰۃ کے لغوی اور قرآنی معانی پر ایک اجمالی نظر ڈال لینا ضروری ہے تاکہ اس کے مغز و جوہر تک رسائی ہو سکے۔

صلوٰۃ کے لغوی معنی

لفظ صلوٰۃ باعتبار مادہ نہایت قدیم ہے۔ کلدانی اور عبرانی دونوں میں گو کہ اس کا املا مختلف ہے لیکن تلفظ ایک ہے یعنی صلا۔ اس مادے میں جلانے کا مفہوم غالب ہے۔ چنانچہ عبرانی میں اس کے معنی جلانے اور کباب کرنے کے ہیں۔ (۳) عربی میں بھی اس کے یہی معنی

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن، ج ۱۱، ص ۴۵۰

(۲) ایضاً ص ۴۵۱

(۳) یہودی مذہب میں مذبح پر قربانی کے گوشت کو جلانا ایک بڑی عبادت سمجھا جاتا ہے۔

Marfat.com

ہیں۔اس کے علاوہ آگ میں لکڑی تپا کر اس کو سیدھا کرنے کا مفہوم بھی اس میں داخل ہے۔
قدیم زمانے میں دعا اور عبادت کے وقت آگ یا بخور جلاتے تھے۔اسی مناسبت سے آگے چل کر یہ عمل صلوٰۃ کہلایا۔کلدانی،عبرانی اور سریانی،تینوں زبانوں میں یہ لفظ دعا اور عبادت کے لیے مستعمل رہا ہے۔عربی میں بھی دعا اور عبادت کے لیے اس کا استعمال قدیم ہے۔قرآن مجید میں ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً

(سورہ انفال:۳۵)

''کعبہ کے پاس مشرکین کی نماز محض سیٹی اور تالیاں بجانا تھا۔''

امام راغب صلوٰۃ کے لغوی معنی کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے،برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں۔بولا جاتا ہے: صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور بزرگی سے یاد کیا۔آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب وان کان صائما فلیصل" جب تم میں سے کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو دعوت کو قبول کرنا چاہیے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کرنا چاہیے (یعنی دعوت کرنے والے کے حق مین دعا کرے)۔''(۱)

اس سلسلے میں مولانا فراہیؒ کی تحقیق قابل ذکر ہے:

''صلوٰۃ (نماز) کا اصل مفہوم اقبال الی الشئی ہے یعنی کسی شے کی طرف بڑھنا اور لپکنا۔یہی مفہوم رکوع،تعظیم اور دعا کا بھی ہے۔یہ کلمہ نماز وعبادت کے لیے قدیم زمانہ سے مستعمل ہے۔کلدانی میں دعا اور تضرع کے لیے اور عبرانی میں نماز اور رکوع کے لیے آیا ہے۔''(۲)

انہوں نے مزید لکھا ہے:

''نماز نہ صرف ذریعۂ تقرب بلکہ عین تقرب ہے...میرے خیال میں عربی میں

---

(۱) مفردات راغب،ص ۲۸۵

(۲) رسالہ فی اصلاح الناس،ص ۸

Marfat.com

صلوٰۃ کا اصل مفہوم بھی قربتِ قریبہ ہی کا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا۔ اسی لیے گھوڑ دوڑ کے اس گھوڑے کو جو اگلے گھوڑے کے بعد ہو مصلی کہتے ہیں۔ جو شخص آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو اس کی صالی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اس شخص کے لیے استعمال کیا جائے گا جو آگ میں گھس جائے۔''(۱)

اس لغوی تحقیق کے بعد یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے تا کہ صلوٰۃ کا قطعی مفہوم متعین کیا جا سکے۔ قرآن میں یہ لفظ دعا کے معنی میں ایک سے زیادہ مقامات پر استعمال ہوا ہے، اور دعا توجہ الی اللہ ہی کی ایک صورت ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَايُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ (سورہ توبہ:۹۹)

''اوران بدویوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو قرب الٰہی اور رسول کی دعا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔''

سورہ توبہ ہی میں دوسری جگہ ہے:

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

(آیت:۱۰۳)

''اوران کے لیے دعا کرو، بیشک تمہاری دعا ان کے لیے باعث تسکین ہے، اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

سورہ نور میں بھی یہ لفظ دعا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۔ (آیت:۴۱)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور پرندے بھی

---

(۱) رسالہ فی اصلاح الناس، ص۳۹، ۴۰

Marfat.com

پروں کو پھیلائے ہوئے، اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی دعا اور تسبیح معلوم ہے۔ اور اللہ پوری طرح باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں۔"

اس آیت میں تسبیح کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور صلوٰۃ پر عطف ہے، جس سے مقصود اس کی تشریح ہے۔ تسبیح کے معنی بلند آواز سے کسی کو پکارنے اور اس کی بڑائی بیان کرنے کے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

قبح اللّٰہ وجوہ تغلب کلما
سبح الحجیج و کبّروا اھلا

"خدا قبیلہ بنی تغلب والوں کے منہ کو ہر ایسے موقع پر کالا کرے جب کہ
حاجی لوگ دعا کے ساتھ اپنی آوازیں بلند کریں اور تکبیر و تہلیل کریں۔"

صلوٰۃ بمعنی دعا کی مزید تشریح آیۂ مذکورہ بالا میں "صلوٰۃ الطیر" کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو ایک مشاہداتی حقیقت ہے۔ صبح و شام کے مقررہ اوقات میں چڑیوں کی زمزمہ سنجی دراصل خدا کی تسبیح کی ایک صوتی شکل ہے۔ "صلا" ہی سے تصلیہ ہے یعنی دعا کرنا۔ عرب کا ایک شاعر ابو قیس بن اسلت جاہلی یثربی کہتا ہے:

قوموا فصلو ربکم وتعوذوا
بارکان ھذا البیت بین الاخاشب

"کھڑے ہو کر اپنے رب سے دعا کرو اور اس گھر کے
ستونوں کی پناہ لو جو پہاڑوں کے درمیان ہے۔"

معلوم ہوا کہ صلوٰۃ کے اصلی معنی دعا کے ہیں۔ عبادت خانہ کو بھی صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ عبرانی میں اس کو صلوتا کہتے ہیں۔ (۱) قرآن مجید میں ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ
كَثِيْرًا۔ (سورہ حج: ۴۰)

"اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں، گرجے، کنیسے

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۴۰

Marfat.com

اور مسجدیں، جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، ڈھادیے گئے ہوتے۔''

وہ صلوٰۃ جو ایک مخصوص عبادت ہے یعنی نماز اس کی اصل بھی دعا ہے۔ جس طرح کسی شے کو اس کے اہم جز سے موسوم کرتے ہیں اسی طرح یہ عبادت بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی کہ اس کا بڑا حصہ خدا کی حمد و تسبیح اور اس کی مناجات پر مشتمل ہے۔

لیکن شرع میں جب صلوٰۃ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے اصطلاحی معنی مراد ہوتے ہیں، یعنی ایک مخصوص بدنی عبادت (نماز) جو شب و روز کے پانچ معینہ اوقات میں ادا کی جاتی ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم

قرآن میں ''اقیموا الصلوٰۃ'' کا جملہ بکثرت مقامات پر آیا ہے۔ اس لیے صلوٰۃ کے بعد اقامت کے معنی و مفہوم سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ اقامت کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح کھڑا کرنے کے ہیں کہ اس میں کوئی کجی نہ ہو۔ اگر کسی لکڑی کو بالکل سیدھا کھڑا کر دیا جائے تو کہا جائے گا: اقام العود۔ اسی معنی میں قرآن مجید میں ہے: فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (سورہ کہف: ۷۷) ''وہاں ان دونوں نے ایک دیوار کو اس حال میں پایا کہ وہ بالکل گرا چاہتی تھی پس اس نے وہ دیوار سیدھی یعنی کھڑی کر دی۔'' حدیث میں آیا ہے:

لن يقبضه حتى يقيم به الملة العوجآء (۱)

''اللہ ان (آنحضورؐ) کی روح اس وقت تک قبض نہیں کرے گا جب تک کہ ملتِ عوجاء (ملتِ عرب) کو سیدھا نہ کر دے۔'' (۲)

اقامت کے دوسرے معنی کسی کام کو اس طرح انجام دینے کے ہیں کہ اس کا حق ادا ہو جائے۔ اقامة الشئی: توفية حقه (۳) اس سلسلے میں قرآن کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔ فرمایا گیا:

---

(۱) بخاری، کتاب البیوع

(۲) ملت عرب کی کجی ان کا شرک تھا اور ان کو سیدھا کرنے سے مراد توحید پر ان کو قائم کرنا تھا۔

(۳) مفردات راغب، ص ۴۱۸

Marfat.com

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (سورہ مائدہ:۶۸)

''کہہ دو، اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم تورات، انجیل اور اس چیز کو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے، قائم نہ کرو۔''

اس آیت میں تورات، انجیل اور اس چیز یعنی قرآن کی اقامت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کتابوں کی ٹھیک ٹھیک تلاوت کی جائے، ان کے احکام وہدایات پر کسی کمی وبیشی کے بغیر عمل کیا جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ

(سورہ طلاق:۲)

''اپنے میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنالو اور اللہ کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔''

اس آیت میں اقامتِ شہادت کا مفہوم، جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے، یہ ہے کہ شہادت ٹھیک ٹھیک حق وانصاف کے مطابق سب کے سامنے دی جائے۔ کسی خوف یا طمع کی وجہ سے شہادت میں کتربیونت نہ ہو بلکہ صورتِ معاملہ کو جوں کا توں بیان کر دیا جائے۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ○ (سورہ رحمٰن:۹)

''انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور تول میں کمی نہ کرو۔''

اس آیت میں اقامتِ وزن کا مطلب تول میں انصاف کا حق ادا کرنا ہے، یعنی ترازو مستقیم ہو، باٹ صحیح ہو اور نیک نیتی سے وزن کیا جائے۔ یہ صحیح وزن کے شرائط ہیں۔ اگر ظاہری تول تو ٹھیک ہو، یعنی ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں، لیکن باٹ صحیح نہ ہو تو تول کی یہ ظاہری درستی کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس پر صحیح وزن کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی طرح باٹ تو صحیح ہو لیکن ترازو کے دونوں پلڑے برابر نہ ہوں تو اس کو بھی صحیح وزن نہیں کہیں گے۔ فی الواقع صحیح وزن اور درست تول وہ ہے جس میں باٹ اور ترازو کی ظاہری درستی کے ساتھ جذبۂ نیک نیتی

Marfat.com

بھی شامل ہو۔ باٹ کتنا ہی صحیح ہو، ترازو کتنا ہی مستقیم ہو مگر دل میں کھوٹ ہو یعنی ایمانداری نہ ہو تو ناپ تول میں خرابی کا آجانا ناگزیر ہے۔

اقامت کے مذکورہ لغوی اور قرآنی مفہومات سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ سے محض نماز کی ظاہری ہیئت مراد نہیں بلکہ نماز کو اس کے جملہ ارکان و شرائط کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ (۱) امام راغب نے لکھا ہے:

ولم یامر تعالی بالصلوۃ حیثما امر ولامدح به حیثما مدح الا بلفظ الاقامة تنبیها ان المقصود منها توفیة شرائطها لاالاتیان بهیئاتها (۲)

''اللہ تعالیٰ نے (قرآن مجید میں) جہاں کہیں نماز کا حکم دیا ہے یا اس کی مدح کی ہے تو اس کے لیے اقامت کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا ہے صرف اس امر پر متوجہ کرنے کے لیے کہ اقامت سے مقصود اس کے شرائط کی تکمیل ہے نہ کہ محض اس کی ظاہری ہیئت کی بجا آوری۔''

شرائط نماز میں خصوصیت کے ساتھ تین چیزیں داخل ہیں، محافظتِ نماز، مداومتِ نماز اور تعدیلِ ارکان۔ اگر ان میں سے کوئی شرط بھی ساقط ہو جائے تو اس پر اقامت صلوٰۃ کا اطلاق نہ ہوگا جیسا کہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ ج فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوۃَ ج (سورہ نساء: ۱۰۳)

''پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرو، پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز قائم کرو۔''

اس آیت کا تعلق حالت جنگ کی نماز سے ہے جو ایک رکعت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس مختصر نماز کے لیے اقامت کا لفظ استعمال نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تعدیلِ

---

(۱) تفسیر خازن، ج ۱، ص ۲۷

(۲) مفردات راغب، ص ۴۱۸

Marfat.com

ارکان، جو شرائط نماز میں سب سے اہم شرط ہے، مفقود ہے۔ اس کے علاوہ رکعتوں کی تعداد بھی کم ہے۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ جب اطمینان حاصل ہو جائے تو نماز قائم کرو، یعنی اس کو جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرو۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اقامت کا اطلاق اسی نماز پر ہو گا جس میں جملہ ارکانِ نماز کامل اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کیے جائیں، عدم اطمینان کی حامل نماز پر اقامت کا اطلاق نہ ہو گا۔

اسی مفہوم میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ (سورہ بقرہ:۲۳۹)

''اگر تم کو خطرہ درپیش ہو تو پیدل اور سوار دونوں حالتوں میں نماز ادا کرو، اور جب خطرہ جاتا رہے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس کو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس آیت میں ''کما علمکم'' سے محض نماز کی ظاہری ہیئت کی تعلیم مراد نہیں بلکہ شرائط نماز کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ گویا حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ حالت خوف رفع ہو جانے کے بعد نماز اس کے تمام ارکان سمیت کامل اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کی جائے۔ جو لوگ نماز کی ظاہری ہیئت ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور شرائط نماز سے غفلت برتتے ہیں، یعنی نہ تو نماز اس کے صحیح وقت پر ادا کرتے ہیں (محافظتِ صلوٰۃ)، نہ اس پر مداومت اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے جملہ ارکان اطمینان وسکون کے ساتھ ادا کرتے ہیں، وہ مصلّی تو ضرور ہیں لیکن ان کو مقیمِ صلوٰۃ نہیں کہا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: انّ المصلین کثیر والمقیمین قلیل [1] ''مصلّی (نمازی) تو بہت ہیں لیکن مقیم نماز (یعنی اس کے حقوق ادا کرنے والے) بہت تھوڑے ہیں۔''

نماز با جماعت کا اہتمام بھی اقامتِ صلوٰۃ میں داخل ہے جیسا کہ درج ذیل آیت سے بالکل واضح ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا

---

(۱) مسند احمد

Marfat.com

وَّاجْعَلُوْ بُیُوْتَکُمْ قِبْلَۃً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

(سورہ یونس:۸۷)

''اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی (ہارون) کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرالو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بنالو اور نماز قائم کرو، اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔''

اس آیت میں چند گھروں کو قبلہ بنالینے اور ان میں اقامتِ صلوٰۃ کے حکم سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دراصل قوم موسیٰ کو نماز باجماعت کے اہتمام کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ اقامت کے اس مفہوم کو اور واضح کردیا گیا ہے:

وَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَھُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِکُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَۃٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَکَ الخ

(سورہ نسآء: ۱۰۲)

''اور (اے پیغمبر) جب تم ان میں موجود ہو اور ان کو نماز پڑھا رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو پھر جب وہ سجدہ کرچکے تو پیچھے ہوجائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے تمہارے ساتھ نماز پڑھے۔''

دیکھیں، اس آیت میں جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھانے کا ذکر ہے وہاں اقامت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (وَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ) اور جہاں مقتدیوں کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے وہاں اقامت کے بجائے تصلیہ کا لفظ آیا ہے (فلیصلوا معك) اس سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ اقامت صلوٰۃ میں نماز باجماعت شامل ہے۔ حدیث سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، آنحضورؐ نے فرمایا ہے:

سوّوا صفوفکم انّ تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ (۱)

''صفوں کو سیدھا کرو کیونکہ صفوں کا سیدھا کرنا اقامت صلوٰۃ میں داخل ہے۔''

---

(۱) بخاری ومسلم

Marfat.com

حقیقتِ صلوٰۃ

نماز دراصل خدا کی یاد اور اس سے قلبی و ذہنی تعلق کا ایک محسوس خارجی اظہار ہے۔ جس قدر یہ تعلق قوی ہوگا اسی قدر اس کی یاد بھی قوی ہوگی۔ خدا کی یاد کو قرآن مجید میں ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ○

(سورہ طٰہٰ:۱٤)

''بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ پس تم میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

دوسری جگہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ الخ۔ (سورہ جمعہ:۹)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے (یعنی اذان دی جائے) تو اللہ کے ذکر کی طرف تیز گامی کرو۔''

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ○

(سورہ عنکبوت:٤۵)

''بے شک نماز بری باتوں اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے۔''

ذکر خدا کو قرآن مجید میں بعض مقامات پر خدا کا نام لینا بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَاسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی○ (سورہ اعلیٰ:۱۵)

''کامیاب ہوا وہ شخص جس نے خود کو پاک کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔''

دوسری جگہ ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ الخ

(سورہ بقرہ:۱۱٤)

Marfat.com

''اوران سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا کے گھروں میں اس کا نام لینے سے روکیں۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ (سورہ حج: ۴۰)

''اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ برابر نہ ہٹاتا رہتا تو خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں، جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے، ڈھا دیے گئے ہوتے۔''

نماز کے لیے خدا کا نام لینا ایک قدیم مذہبی تعبیر ہے۔ تورات میں ہے:

''اور ابراہیم وہاں سے کوچ کر کے اس پہاڑ کی طرف گیا جو بیت ایل (بیت اللہ) کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرا اس طرح لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور 'عی' مشرق میں پڑا، اور وہاں اس نے خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اس کا نام لیا۔''(۱)

کتاب پیدائش ہی میں ایک دوسرے مقام پر ہے:

''اسحاق نے وہاں ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا۔''(۲)

ذکر کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کا نام زبان پر آجائے بلکہ یہ بات بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ اس کی بے حد بڑائی بیان کی جائے، اس کی حمد وثنا کے ساتھ اس سے قرب ومحبت کا بے تابانہ اظہار ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (سورہ بقرہ: ۲۰۰)

''جب تم اپنے (حج کے) مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے آباواجداد کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اس کو یاد کرو۔''

---

(۱) کتاب پیدائش، باب ۱۲: ۸۔۹

(۲) ایضاً، باب ۲۶: ۲۵

Marfat.com

دوسری جگہ فرمایا ہے:

فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰکُمْ ج

(سورہ بقرہ:۱۹۸)

''مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اس طرح اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے۔''

ایامِ جاہلیت میں اہل عرب کا معروف دستور تھا کہ وہ حج کے اختتام پر مشعر حرام اور منیٰ میں جلسے منعقد کرتے تھے۔ ان جلسوں میں ہر قبیلہ کے شعراء اور خطباء اپنے اپنے قبائل کے مفاخر و محامد بالخصوص آبا و اجداد کی شجاعت و بسالت اور ان کی فیاضی و سیر چشمی کے واقعات کو شعر و خطابت کی شکل میں خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ آیات مذکورہ میں ان اعمالِ تفاخر سے باز آجانے کے لیے کہا گیا ہے اور ساتھ ہی حکم دیا گیا ہے کہ اب باپ دادا کی بڑائی بیان کرنے کے بجائے خدائے بزرگ و برتر کی عظمت و کبریائی بیان کی جائے اور اجداد کی تعریف سے کہیں بڑھ کر اس کی تعریف و توصیف کی جائے کہ اس کائنات میں وہی ایک ہستی ایسی ہے جو فی الواقع ہر طرح کی تعریف و ستائش کے لائق ہے۔

ذکر کے اس مفہوم کی تائید ان آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں نماز کے لیے تسبیح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِھَا وَمِنْ آنَاءِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّھَارِ الخ (سورہ طٰہٰ:۱۳۰)

''اور اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو آفتاب کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں بھی۔''

دوسری جگہ ہے:

وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ O (سورہ طور:۴۹)

''اور شب میں اور ستاروں کے پلٹنے کے وقت (وقت سحر) اس کی تسبیح کرو۔''

Marfat.com

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ○ (سورہ احزاب:۴۲)

''اور صبح وشام اس کی تسبیح کرو۔''

ان آیات میں نماز پڑھنے کو خدا کی تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے[1]، اور تسبیح کے معنی خدا کی پاکی اور اس کی بڑائی بیان کرنے کے ہیں۔اعشی کہتا ہے:

و سبح علی حین العشیات و الضحیٰ ولا تعبد الشیطان و اللّٰه فاعبدا

''صبح اور شام کے اوقات میں تسبیح کرو اور شیطان کی عبادت مت کرو بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرو۔''

روایت ہے کہ ایک بار معاویہ بن حکم سلمی، جو جلد ہی مشرّف بہ اسلام ہوئے تھے، شریکِ نماز تھے۔کسی مسلمان کو چھینک آئی تو انہوں نے، جیسا کہ انہیں تعلیم دی گئی تھی، یرحمك الله کہہ دیا۔صحابہ نے ان کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔انہوں نے نماز ہی میں کہا: تم لوگ مجھے اس طرح کیوں گھور کر دیکھتے ہو؟ صحابہ نے اپنے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا تب جاکر وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جارہا ہے۔نماز ہو چکی تو آنحضورؐ نے پوچھا، نماز میں کون باتیں کرتا تھا۔ صحابہ نے عرض کیا، معاویہ۔آپ نے ان کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے فرمایا: نماز قرآن پڑھنے، اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی و بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں باتیں کرنا مناسب نہیں۔''[2]

حقیقتِ نماز کا دوسرا قابلِ ذکر پہلو دعا ہے، یعنی قادرِ مطلق اور علیم وخبیر خدا کو پکارنا اور اس سے درخواست اور التجا کرنا۔حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ سے مروی ہے کہ ایک بار

---

(۱) تسبیح قول سے بھی ہوتی اور عمل سے بھی۔قولی تسبیح کا مطلب خدا کی یاد اور اس کی بڑائی بیان کرنا، اور عملی تسبیح کا مطلب اس کی فرماں برداری ہے۔قرآن مجید میں جہاں زمین اور آسمانوں کی تسبیح کا ذکر ہے وہاں اس سے مراد عملی تسبیح ہے، یعنی خدا کے حکم کی تعمیل جو ان کا طبعی وظیفہ ہے۔انسان سے دونوں طرح کی تسبیح مطلوب ہے۔نماز میں قولی اور عملی دونوں تسبیحیں جمع ہیں، جیسا کہ کلمات نماز (مثلاً، اللہ اکبر، سمع اللہ لمن حمدہ، ربنا لک الحمد، سبحان ربی العظیم، سبحان ربی الاعلیٰ) اور رکوع وسجدہ کے اعمال سے بالکل واضح ہے۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ

Marfat.com

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدعاء هو العبادة (۱) ''دعا ہی عبادت ہے'' اور اس کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝ (سورہ مومن: ۶۰)

''تمہارے رب کا ارشاد ہے، مجھے پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے روگردانی کرتے ہیں وہ عنقریب رسوا ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور ارشاد سے حقیقت نماز کے اس دوسرے پہلو کی تائید ہوتی ہے، فرمایا:

''نماز دو دو رکعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشہد اور گریہ وزاری ہے، خشوع وخضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب، اے رب کہنا ہے۔ جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص رہی'' (۲)

صلوٰۃ اور عقیدۂ توحید

حقیقت نماز کے مذکورہ بالا پہلوؤں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ دراصل اسلام کے عقیدۂ توحید کا عملی اظہار ہے۔ سورہ فاتحہ نماز کا ایک لازمی جز ہے اور تمام تر توحیدی تعلیم پر مشتمل ہے۔ اسی سورہ میں یہ فقرے موجود ہیں: ایاك نعبد وایاك نستعین ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔'' ہر نمازی اپنی زبان سے روزانہ کم از کم پانچ باران الفاظ کو دہراتا ہے اور ان کے ذریعہ خدا سے اس کی عبادت واستعانت کا عہد باندھتا ہے اور غیر خدا کی عبادت واستعانت سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ ''وایاك نستعین'' میں ''واؤ'' بیان کا ہے، یعنی ایاك نعبد کی تشریح کے لیے لایا گیا ہے کہ استعانت عبادت کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مافوق الطبعی طور پر خدا کے

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الدعا

(۲) ابوداؤد، باب: صلوٰۃ النہار، ترمذی، باب: ماجاء فی التخشع فی الصلوٰۃ

Marfat.com

علاوہ کسی دوسرے کو حاجات و مصائب میں مدد کے لیے پکارنا اس کی عبادت کے مترادف ہے۔

شرک کی بنیاد ہمیشہ سے اس غلط خیال پر قائم رہی ہے کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ اس کی بعض مخلوقات، مثلاً فرشتے، سیارے اور بعض وفات یافتہ نیک لوگ (انبیاء واولیاء) بھی صاحب قوت ہیں اور وہ بندوں کو نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں، اور یہ اختیار ان کو خدا نے عطا کیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں اس مشرکانہ خیال کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو خدا اس کائنات کا خالق و مالک ہے وہی اس پر مکمل اختیار وتصرّف رکھتا ہے۔ اس کے سوا اس کائناتِ خلقت میں کوئی دوسرا وجود ایسا نہیں جو نظام عالم میں تصرّف تو کجا بذاتِ خود کسی نوع کا کوئی ادنیٰ اختیار و اقتدار بھی رکھتا ہو۔ اور ایسا بھی نہیں کہ خدا نے اپنے اقتدارِ اعلیٰ کا کوئی حصہ اپنی کسی مخلوق کی طرف منتقل کر دیا ہو اور وہ صاحب اختیار بن گئی ہو۔ اس نوع کی شرکتِ اقتدار سے نظامِ جہاں نا آشنا ہے۔ فی الواقع نظام عالم پر ایک ہی خدا غالب و مستولی ہے۔ وہی حاکم و آمر ہے، وہی نافع و ضار ہے، وہی مشکل کشا، حاجت روا اور فریادرس ہے۔ اس کائناتی حقیقت کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

○ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○

(سورہ اعراف: ۵۵)

''سن لو! خلق اور امر دونوں اسی کے لیے خاص ہیں۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، تمام جہانوں کا آقا اور پرورش کنندہ۔ اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو۔ وہ یقیناً حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

○ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ○ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ط وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ط وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ○

(سورہ فاطر: ۱۳)

''وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اقتدار و بادشاہی اسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن کو تم

Marfat.com

پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے بھی مالک نہیں (یعنی بالکل بے اختیار ہیں) اگر تم انہیں پکارو تو وہ (بذات خود) تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر (کسی خدائی ذریعہ سے) سن بھی لیں تو کوئی جواب نہیں دے سکیں گے اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ ایک باخبر کے سوا کوئی دوسرا تمہیں (ان حقائق سے) آگاہ نہیں کر سکتا۔"

○ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا○

(سورہ بنی اسرائیل:۱۱۱)

"اور کہو کہ شکر وستائش کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کے اقتدار وحکومت میں اس کا کوئی ساجھی ہے، اور نہ اس کے عجز کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے، اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔"

○ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ کَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ○ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ○ وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ کَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ○

(سورہ بقرہ ۱۶۵۔۱۶۷)

"اور لوگوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ محبت کرتے ہیں بالکل خدا کی محبت کی طرح۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ خدا سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم دیکھ سکتے اس حالت کو جب عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان کو اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ ساری قوت اور کل اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اللہ نہایت سخت سزا دینے

Marfat.com

والا ہے۔ اس وقت کا خیال کرو جب قائد اپنے پیروؤں سے بیزاری ظاہر کریں گے، اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات کا تانا بانا ٹوٹ چکا ہوگا۔ اور پیرو کہیں گے کہ اے کاش، ہمیں ایک بار دنیا میں واپس جانے کا موقع ملتا تو ہم بھی ان سے اسی طرح بیزاری دکھاتے جس طرح انہوں نے ہم سے بیزاری دکھائی ہے۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال ان کو دکھائے گا جو ان کے لیے موجب حسرت و پشیمانی ہوں گے۔ اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔''

اوپر کی آیات میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ ساری طاقت اللہ کے ہاتھ میں ہے (اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا) یہ حقیقت اس دنیا میں پوشیدہ ہے لیکن آخرت کے دن سب پر ظاہر ہو جائے گی۔ اس وقت ان لوگوں کو بڑی پشیمانی ہوگی جو دنیا میں قوم کے نیک بندوں کے بارے میں یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ صاحب قوت ہیں، مشکلات میں ان کی مدد کرتے ہیں، اور روز آخرت ان کی شفاعت کریں گے۔ لیکن وہاں معاملہ الٹا ہوگا۔ وسیلے کی رسی کٹ چکی ہوگی، دنیوی تعلقات ٹوٹ چکے ہوں گے اور وہ بالکل بے یارو مددگار رہوں گے۔ اپنے جن مقتداؤں کی طاقت اور شفاعت پر ان کو بھروسہ تھا وہ ان سے منہ پھیر لیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ ہم تمہاری مدد سے عاجز ہیں۔ ہم کل بھی بے اختیار تھے اور آج بھی بے اختیار ہیں۔ ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ ہم صاحب اختیار ہیں اور روز آخرت تمہاری مشکل کشائی کریں گے۔ (اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ)

یہ ہوش ربا منظر دیکھ کر وہ کفِ افسوس ملیں گے اور غصّے کے عالم میں کہیں گے کہ اے کاش ہم کو ایک بار اور دنیا میں جانے کا موقع ملتا تو اپنے مذہبی رہنماؤں کو دکھاتے کہ کس طرح اظہار برأت کیا جاتا ہے (وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا) لیکن حسرت و غم کے سوا اور کچھ بھی ان کو حاصل نہ ہوگا اور وہ جہنم کی دائمی سزا سے دوچار ہو کے رہیں گے (كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ)

معلوم ہوا کہ کوئی مخلوق مافوق الفطری قوت (Super natural power) نہیں رکھتی اور

Marfat.com

اسی لیے غیر خدا کو پکارنے سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَايَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ○ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ ۚ وَمَايَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ○

(سورہ نحل: ۲۰، ۲۱)

"اور اللہ کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ وہ مردے ہیں نہ کہ زندگی رکھنے والے، اور نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔"

دوسری جگہ ہے:

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَايَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ

(سورہ رعد: ۱۴)

"اسی کو پکارنا برحق ہے۔ اور اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں وہ ان کی مشکل کشائی نہیں کر سکتے۔ ان کو پکارنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے درآنحالیکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں ہے۔"

جو لوگ نادانی کی وجہ سے غیر خدا کو پکارتے ہیں اور اپنی حاجات و بلایا میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ دراصل ان کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ان کی پکار سنتے ہیں اور سنتے ہی نہیں، ان کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں اور ان کی تردید اس سے پہلے ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں چند اور آیات ملاحظہ ہوں:

○ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَايَضُرُّهُمْ وَلَايَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَايَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَافِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

(سورہ یونس: ۱۸)

"اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکیں اور نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دو (اے پیغمبر): کیا تم اللہ

Marfat.com

کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اسے علم نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔
پاک اور بلند ہے اس کی ذات ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔''

O وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ
فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ O وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ
لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ط يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ O (سورہ یونس:۱۰۷)

اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف میں مبتلا کردے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس تکلیف کو دور کر سکے۔ اور اگر وہ تمہارے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی اس کے فضل کو روکنے والا نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس فضل سے نوازتا ہے۔ وہ بخشنے والا، مہربان ہے۔''

O قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ
الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا O اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى
رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ
عَذَابَهٗ ط اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا O

(سورہ بنی اسرائیل: ۵۶،۵۷)

''کہہ دو کہ تم نے اپنے خیال میں اللہ کے سوا جن کو معبود سمجھ رکھا ہے ان کو (اپنی مشکلات میں) پکار دیکھو، نہ وہ تم سے کسی مصیبت کو دفع کر سکیں گے اور نہ ہی وہ اس کو ٹال سکیں گے۔ جن کو وہ پکارتے ہیں (اور خدا کے ہاں ذریعۂ تقرب سمجھتے ہیں) وہ تو خود اپنے رب کے قرب کے طلب گار ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ اور بے شک تمہارے رب کا عذاب ایسی چیز ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔''

O قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ط
وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ O

(سورہ مائدہ:۷۶)

Marfat.com

(اے پیغمبر) کہہ دو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تم کو نقصان پہنچا سکے اور نہ نفع، اور اللہ ہی سننے والا اور (ہر چیز کی) خبر رکھنے والا ہے۔ (اس کے سوا یہ قدرت کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے)۔"

اس آیت سے ٹھیک پہلے جو آیت ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اور اکل وشرب کی بنیاد پر ان کے بشر ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی مذکورہ آیت ہے (قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا) اس سے بالکل واضح ہے کہ آیت میں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، جن کو عیسائی نفع ونقصان کا مالک سمجھ کر پکارتے رہے ہیں اور آج بھی ان کی ایک بڑی تعداد اس شرک وضلالت میں مبتلا ہے۔

مذکورہ آیت میں جن لفظوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نافع وضار ہونے یعنی کسی کو نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت رکھنے کی تردید کی گئی ہے تقریباً انہی لفظوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نافع وضار ہونے کی بھی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً آیت ذیل ملاحظہ ہو:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ○ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○ (سورہ جن: ۲۱، ۲۲)

"کہہ دو، میں نہ تم کو کوئی ضرر پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ ہدایت کا۔ کہہ دو، مجھے کوئی بھی اللہ سے پناہ دینے والا نہیں بنے گا اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ گاہ پا سکوں گا (اگر میں نے اس کی نافرمانی کی)۔"

کسی کو نفع ونقصان پہنچانا تو درکنار ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے نفع ونقصان کا اختیار بھی حاصل نہ تھا۔ ارشاد ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ

(سورہ یونس: ۴۹)

"کہہ دو، میں اپنی ذات کے معاملے میں بھی کسی نقصان اور نفع پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔"

غور فرمائیں، جب اللہ کے یہ دو جلیل القدر پیغمبر کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتے تو اولیاء واقطاب کے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ ان کو نفع ونقصان کا اختیار

Marfat.com

حاصل ہے کیونکر صحیح ہوگا۔ کیا ان کا رتبہ انبیاء سے بڑھ کر ہے؟ کون مسلمان بقید ہوش وحواس اس بات کو تسلیم کرے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں مسلمانوں کو یہی تعلیم دی ہے کہ وہ صرف اللہ کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھیں۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں (ماشاء اللّٰہ وشئت) آپ نے فرمایا، تو نے تو مجھے اللہ کا شریک (ند) بنالیا، مشیّت صرف اللہ کی ہے۔ (۱)

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ آپ کی دعوت کیا ہے؟ فرمایا، ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ اگر تجھے کوئی تکلیف پہنچے اور تو اس کو پکارے تو وہ تیری تکلیف رفع کرے گا، اگر تو کسی ویرانے میں گم ہو جائے اور اس کو پکارے تو تجھے واپس لادے گا، اگر تو قحط سالی سے دوچار ہے اور اس کو پکارے تو وہ تیرے لیے اُگائے گا۔'' الخ (۲)

امام ترمذی حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص کو اپنی ہر حاجت خدا ہی سے مانگنا چاہیے یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا ہی سے مانگے۔'' یہ روایت بھی ملاحظہ فرمائیں جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

> ''ایک دن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا، آپ نے فرمایا: اے لڑکے، میں تجھے چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں: اللہ کا خیال رکھو وہ تمہارا خیال رکھے گا، اللہ کا دھیان رکھو، اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔ جب مانگو، خدا سے مانگو اور جب مدد کے طالب ہو تو خدا سے مدد مانگو۔ جان رکھو کہ اگر سارے لوگ مل کر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو تجھے نفع نہیں پہنچا سکتے سوائے اس کے جو اللہ نے

---

(۱) بیہقی، کتاب الاسماء والصفات، ص ۱۱۰ (اس میں ند کی جگہ ''عدل'' کا لفظ ہے: اجعلتنی للہ عدلا بل شاء اللہ وحدہ ''کیا تو نے مجھے اللہ کا برابر بنالیا بلکہ ایک اللہ جو چاہے۔'' مزید دیکھیں، تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۷

(۲) مسند امام احمد بن حنبل، ج ۵، ص ۶۴، مزید دیکھیں، الاستیعاب، ابن عبدالبر، ج ۱، ص ۸۷ و تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۳۷۰

Marfat.com

تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر سارے لوگ مل کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بجز اس کے جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور کاغذ کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔"(۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کی پیروی کرتے ہوئے ہر دور میں علماء حق نے مسلمانوں کو بتایا کہ بزرگانِ دین کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا، خواہ بالواسطہ یا بلاواسطہ، فعل شرک ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے ایک سائل کے استفسار میں لکھا ہے:

ومن اعظم الشرك ان يستغيث الرجل بمية او غائب كما ذكره السائل ويستغيث به عند المصائب، يقول يا سيدى فلان، كانه يطلب منه ازالة ضره وجلب منفعه، وهذا حال النصارىٰ فى المسيح وامه واحبارهم ورهبانهم، ومعلوم ان خير الخلق واكرمهم عند الله نبينا محمد صلى الله عليه وسلم، واعلم الناس بقدره وحقه اصحابه ولم يكونوا يفعلون شيئا من ذلك لافى الغيبة ولا بعد مماته (۲)

"یہ ایک بڑا شرک ہے کہ آدمی مردہ یا غائب کو پکارے جیسا کہ سائل نے دریافت کیا ہے، اور مصائب میں اس سے مدد مانگے، کہے یا سیدی فلاں، گویا وہ اس سے اپنی تکالیف کا ازالہ اور نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی معاملہ عیسائیوں کا مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کے بارے میں ہے۔ اور معلوم ہے کہ مخلوق میں فضل اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آپ کی قدر اور آپ کا حق سب سے زیادہ آپ کے اصحاب (صحابہؓ) جانتے تھے لیکن انہوں نے اس قسم کا فعل نہ تو آپ کی زندگی میں کیا اور نہ آپ کی وفات کے بعد۔"

اس تفصیلی گفتگو سے بالکل واضح ہو گیا کہ نماز اور شرک کا اجتماع ممکن نہیں ہے، اس

---

(۱) ترمذی واحمد

(۲) مجموعہ فتویٰ، جامع الفرید، ص ۴۳۹

Marfat.com

لیے کہ نماز توحید ہی کی عملی صورت ہے۔ نماز کا عقیدۂ توحید سے ویسا ہی تعلق ہے جیسا تعلق پھول اور اس کے رنگ و بو میں ہے۔ اگر پھول رنگ و بو سے محروم ہو کر حقیقی معنی میں پھول نہیں رہتا تو توحید کی خوشبو سے خالی نماز بھی ایک بے سود جسمانی عمل ہے۔ اس سے نمازی کو نہ دنیا میں کوئی فائدہ حاصل ہوگا اور نہ ہی آخرت میں بلکہ سخت ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ۔

دین میں صلوٰۃ کا مقام

اسلام میں توحید کی حیثیت بنیاد کی ہے اور دین کی کل عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہے، اور توحید کی عملی شکل، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نماز ہے۔ سورہ بقرہ کی بالکل ابتدا میں فرمایا گیا ہے:

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ الخ

''وہ غیب (اللہ تعالیٰ) پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں''

اس آیت میں "ویقیمون الصلوٰۃ" کا جملہ اس بات کی وضاحت کے لیے لایا گیا ہے کہ نماز ایمان بالغیب میں داخل ہے، یعنی اس کے ایک لازمی تقاضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ دینِ قیّم کا تعارف ان لفظوں میں کرایا گیا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

(سورۃ البیّنۃ: ۵)

''ان کو اسی بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی ٹھیک دین ہے۔''

اس آیت میں جس دینِ قیّم کا تعارف کرایا گیا ہے اس میں نماز اس کے اوّلین جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی بنا پر نماز کو دوسری عبادات پر تقدم حاصل ہے۔ اس تقدم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ہر رکنِ عبادت بعض مخصوص حالات میں یا تو ترک ہو سکتا ہے یا مؤخر کیا

Marfat.com

جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر زکوٰۃ صرف اس شخص پر عائد ہوتی ہے جو بقدر نصاب مال کا مالک ہو۔ روزہ طاقت نہ ہونے کی صورت میں ساقط ہو جاتا ہے اور بیماری یا سفر میں موخّر کیا جاسکتا ہے۔ بیت اللہ کا حج راستے کے امن اور زادِ راہ پر منحصر ہے۔ لیکن نماز ہر عاقل و بالغ مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہے۔ یہ نہ بیماری میں چھوٹ سکتی ہے، نہ سفر اس کو ختم کر سکتا ہے اور نہ ہی زمانۂ پیری اس کی ادائیگی میں مانع ہو سکتا ہے۔ آدمی کھڑا ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھ کر پڑھنا ممکن نہ ہو تو لیٹ کر اشاروں سے پڑھے۔ حالت سفر میں جان و مال کے خوف کی وجہ سے اگر کسی جگہ ٹھہر کر نماز ادا کرنا محال ہو تو جس حال میں ہو، خواہ پیدل خواہ سوار، نماز ادا کرے۔ فرمایا گیا ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالاً اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ○ (سورہ بقرہ:۲۳۹)

پس اگر تمہیں (دشمنوں سے) خوف دامن گیر ہو تو پیدل یا سوار جس حالت میں بھی ہو نماز ادا کرو۔ پھر جب خوف دور ہو جائے تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جیسا کہ اس نے تم کو سکھایا ہے، جس کو تم نہیں جانتے تھے۔''

اتنا ہی نہیں، مسلمانوں کو عین حالت جنگ میں بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے:

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ الخ۔

(سورہ نسآء: ۱۰۲)

''اور (اے پیغمبر) جب تم مسلمان میں موجود ہو (یعنی حالت جنگ میں) اور تم نماز میں ان کی امامت کر رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار لیے رہیں۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمہارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ، جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے، تمہارے ساتھ نماز پڑھے۔''

عین حالت جنگ میں بھی نماز کا معاف نہ ہونا دین میں اس کے بلند مقام اور اس

Marfat.com

کی غیر معمولی اہمیت کی ایک بڑی دلیل ہے۔ عبادات کی مشروعیت کے پہلو سے دیکھیں تو اس سے بھی دین میں نماز کی اہمیت اور اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے نبوت میں جو سب سے پہلا حکم ملا وہ قیامِ نماز کا تھا۔ سورہ علق میں، جو نزول وحی کی ترتیب کے اعتبار سے پہلی سورہ ہے، فرمایا گیا ہے:

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ (سورہ علق:۱۹)

''ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔''

سورہ مزمّل میں، جو اس کے بعد کی سورہ ہے، ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ (سورہ مدثر۔۳)

''اے چادر لپیٹ کر سونے والے! اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤ اور اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کرو۔''

اس سے قریبی زمانہ کی ایک دوسری سورہ کے اندر یہ حکم قدرے تفصیل کے ساتھ آیا ہے:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ (سورہ مزمل:۱-۴)

''اے چادر لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں تھوڑی دیر کے لیے کھڑے رہو، آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ کرلو، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔''

قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات پر بھی نماز کے اہتمام کی ہدایت ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (سورہ طٰہ۔۱۳۲)

''اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو۔''

دوسری جگہ ہے:

قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝

Marfat.com

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ط وَهُوَ الَّذِىْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

(سورہ انعام:۷۱۔۷۲)

''کہہ دو، اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور ہم کو یہ حکم ملا ہے کہ ہم پروردگار عالم کے آگے سر اطاعت خم کریں، اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔ اور وہی ہے جس کے حضور تم سب جمع کیے جاؤ گے۔''

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ

(سورہ عنکبوت۔۴۵)

''جو کتاب تمہاری طرف بذریعۂ وحی بھیجی گئی ہے اس کو پڑھو اور نماز قائم کرو۔''

احادیث سے بھی دین کے اندر نماز کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ اس امر کے قائل ہو جائیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں۔ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ بجز حقِ اسلام کے، اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے محفوظ کر لیں گے اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔''

بخاری و مسلم دونوں میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب نبی اکرمؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو فرمایا:

''تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں۔ انہیں سب سے پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں۔ اگر وہ یہ بات تسلیم کر لیں تو پھر انہیں بتانا کہ خداوند پاک نے رات اور دن میں ان پر پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اسے بھی تسلیم کر لیں تو ان سے کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لے کر ان کے غربا میں تقسیم کی جائے گی۔ پس جب وہ لوگ اس بات کو بھی مان لیں تو خبردار ان کے اعلیٰ درجہ کے مال (چھانٹ چھانٹ کر) نہ لینا اور مظلوم کی آہ سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے اور جناب باری تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔''

Marfat.com

پچھلی شریعتوں کو دیکھیں تو اس سے بھی نماز کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ ہر نبی اور رسول کے دین میں نماز کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ہمارے جدِّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذرّیت کو مکہ کی وادیِ بے آب و گیاہ میں بسایا تو اس کی غرض قیام نماز کے سوا کوئی دوسری چیز نہ تھی، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ الخ (سورہ ابراھیم۔ ۳۷)

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے رب، تا کہ وہ نماز قائم کریں۔''

آگے ان الفاظ میں دعا فرماتے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ○

(سورہ ابراھیم۔ ٤٠)

''اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی میرے پروردگار، اور میری دعا قبول فرما۔''

آپ کا یہ دعا فرمانا کہ الٰہی مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا، جہاں اللہ سے آپ کی غیر معمولی محبت اور تعلقِ خاطر کی علامت ہے وہیں اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک مسلم کی زندگی میں نماز کا کیا مقام ہونا چاہیے اور دنیا میں اس کی تگ و دو اور جاں فشانی کس مقصد کے لیے ہونی چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد کو اللہ کی طرف سے جو احکام دیے گئے ان میں بھی نہ صرف نماز کا حکم موجود ہے بلکہ وہ سرِ فہرست ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ○ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ ○

(سورہ انبیآء۔ ۷۳)

''اور ہم نے اسے اسحاق اور فضل مزید کے طور پر یعقوب عطا کیے۔ اور دونوں ہی

Marfat.com

کو صالح بنایا، اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ ہدایت دکھاتے تھے۔ اور ہم نے ان کو اچھے کاموں کی اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی ہدایت کی، اور وہ ہماری بندگی کرنے والے تھے۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمٰعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ۝ (سورہ مریم۔۵۵)

"اور کتاب میں اسماعیل کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ وعدے کا پکا اور رسول اور نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔"

حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے بعد جو پیغمبر بھی آیا اس کے دین کا سرِ عنوان نماز تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور کی وادیِ مقدس میں جو پہلا فرمانِ خدا ملا وہ یہ تھا:

إِنَّنِي أَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي ۝

(سورہ طٰہٰ۔۱۴)

"بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔"

سورہ یونس میں یہی حکم قدرے تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، فرمایا:

وَأَوْحَيْنَا إِلٰى مُوسٰى وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَّاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَّأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(سورہ یونس۔۸۷)

"اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں چند گھر خاص کر لو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو، اور اہلِ ایمان کو خوش خبری سنا دو۔"

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیدائش کے فوراً بعد قوم یہود کے سامنے جو معجزانہ تقریر کی اس کا ایک اہم جز نماز ہے۔ فرمایا:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَیًّا ۝

(سورہ مریم۔ ۳۱)

"(حضرت عیسیٰ نے) کہا، میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی اور نبی بنایا اور مجھے بابرکت ٹھہرایا جہاں کہیں بھی میں ہوں۔ اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں۔"(۱)

تعمیلِ شریعت کے پہلو سے بھی نماز کی اہمیت بالکل واضح ہے۔ بلاشبہ نماز اللہ کے حکموں کی بجا آوری کو آسان بناتی ہے۔ اس کی حیثیت شہر پناہ کی ہے۔ جو شخص اس شہر پناہ کے اندر داخل ہوا وہ نفس کے فتنوں سے محفوظ ہو گیا، اور جس کو یہ شہر پناہ نہیں ملی اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ نفس کی فتنہ انگیزیوں سے مامون رہ سکے۔ فرمایا گیا ہے:

---

(۱) مقام حیرت ہے کہ ان واضح تعلیمات کے باوجود یہود و نصاریٰ نے نہ صرف قیام نماز میں غفلت دکھائی بلکہ اپنی مقدس کتاب سے اس کا نام و نشان تک حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ چنانچہ موجودہ تورات اور انجیل میں کہیں نماز کا واضح ذکر نہیں ملتا حتیٰ کہ تورات میں اس مقام پر جہاں میثاق بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے نماز کا کوئی ذکر نہیں جب کہ وہ میثاق میں شامل تھی، جیسا کہ قرآن مجید کا بیان ہے۔ (سورہ بقرہ: ۸۳) اس پختہ عہد و میثاق کے بعد بنی اسرائیل کا تارک نماز ہو جانا اور اپنی مذہبی کتابوں سے اس کو محو کر دینا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ دین میں نماز کے مقام اور اس کی اہمیت سے قطعاً غافل ہو چکے تھے۔ ان کی اس غفلت پیہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خواہشات نفسانی کے اسیر و پرستار بن گئے فرمایا گیا ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝

(سورہ مریم۔ ۵۹)

"پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔ پس وہ لوگ عنقریب گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔"

Marfat.com

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝
الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝

(سورہ مومنون: ۱-۹)

''ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں، جو فضول باتوں سے منہ موڑنے والے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے۔ اس معاملے میں ان کو کوئی ملامت نہیں مگر جس نے اس کے علاوہ چاہا تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی پاسداری کرنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی خبر گیری کرتے ہیں۔''

دیکھیں، ان آیتوں کی ابتدا نماز سے ہوئی اور نماز ہی پر اختتام ہوا ہے اور ان کے درمیان میں دین کے چند بنیادی احکام اور اخلاقی باتوں کا ذکر ہے۔ اس اسلوب بیان سے بالکل واضح ہے کہ نماز کے بغیر دین کے بنیادی احکام کی تعمیل اور حسن اخلاق کی حفاظت مشکل ہے۔ ترکِ نماز کا مطلب دین و اخلاق کی پوری عمارت کا انہدام ہے۔ نماز اور اخلاق و شرائع میں اس گہرے تعلق کی وجہ سے قرآن مجید میں جہاں احکام بیان کیے گئے ہیں وہاں بالعموم ان کے آخر میں نماز کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں نکاح و طلاق کے احکام کے بعد فرمایا گیا ہے:

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝

(سورہ بقرہ۔۲۳۸)

''نماز کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان کی نماز کی، اور اللہ کے آگے فرماں بردار کی طرح کھڑے رہو۔''

Marfat.com

اسی طرح سورہ نور میں احکامِ زنا اور عائلی زندگی سے متعلق بعض احکام کے بیان کے بعد ایک حسین تمثیل کا ذکر ہے اور پھر فرمایا گیا ہے:

فِي بُيُوتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۔ (سورہ نور۔ ۳۶،۳۷)

''یہ طاق ایسے گھروں میں ہیں جن کی تعمیر کا خدا نے حکم دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے۔ ان میں صبح و شام ایسے لوگ خدا کی تسبیح کرتے ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت (کے مشاغل) اللہ کے ذکر، اہتمامِ نماز اور ادائیگی زکوۃ سے غافل نہیں کرتے۔''

سورہ نسآء میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک، بیوہ عورتوں سے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت، میراث کے احکام، ارتکابِ فواحش کے بعد کی تعزیری تدابیر، عورتوں کے ساتھ حسنِ معاشرت اور نکاح و طلاق کے اہم مسائل کے متعلق واضح ہدایات، خدائے واحد کی عبادت اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اور انفاقِ مال کے ذکر کے بعد اہل ایمان کو نماز کے متعلق ایک اہم ہدایت دی گئی ہے۔ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ الخ (سورہ نسآء۔ ۴۳)

''اے ایمان والو، نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تا آنکہ جان لو جو تم (اپنی زبان سے) کہتے ہو۔''

اسی طرح سورہ مائدہ میں حرام اور حلال چیزوں کی تفصیل کے بعد فرمایا گیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ الخ (سورہ مائدہ۔ ۶)

''اے ایمان والو، جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو۔''

ہم نے گذشتہ صفحات میں مختلف جہتوں سے نماز کے مقام اور اس کی اہمیت کا جو

Marfat.com

جائزہ لیا ہے اس سے بالکل واضح ہو گیا کہ دین میں اس کی وہی حیثیت ہے جو جسم میں روح کی ہے۔ جس قدر نماز میں ضعف آئے گا اسی قدر دین میں بھی ضعف پیدا ہوگا، اور اگر نماز قوی ہے تو لازماً دین بھی قوی ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نماز کی اس خصوصیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ حضرت عمرؓ اپنے عہدِ خلافت میں تمام عاملوں کو لکھا کرتے تھے:

ان اھم امر کم عندی الصلوۃ فمن حفظھا و حافظ علیھا
حفظ دینہ ومن ضیعھا فھو لماسواھا اضیع (۱)

''میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے بڑھ کر اہمیت نماز کو حاصل ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی اور اس پر مداومت اختیار کی اس نے پورے دین کی حفاظت کی اور جس نے اسے ضائع کیا وہ دوسری چیزوں کو اور بھی ضائع کرنے والا ہوگا۔''

ترکِ صلوٰۃ

دین کے اندر نماز کی اس اہمیت کے پیش نظر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے کہ کوئی مسلمان تارکِ نماز ہوگا۔ لیکن آج بہت سے مسلمان زبان سے اقرارِ ایمان کے باوجود نماز نہیں پڑھتے۔ کیا وہ فی الواقع مسلمان ہیں؟ اس وقت چونکہ مسلم معاشرہ کی ایمانی حالت میں ناقابلِ بیان ضعف آ گیا ہے اس لیے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو آدمی زبان سے اقرار ایمان کرے کم از کم جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھتا ہو اور بعض مذہبی شعائر، مثلاً قربانی و ختنہ وغیرہ، مسلمانوں جیسے رکھتا ہو تو وہ مسلمان ہے۔ لیکن قرآن مجید سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ

(سورہ توبہ۔۱۱)

''اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین اسلام میں داخل ہونے کے لیے تین باتوں پر عمل ضروری ہے، ایک شرک سے توبہ اور توحید کا اقرار، دوسرے قیام نماز اور تیسرے ایتائے زکوٰۃ۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس میں شاید ہی کسی مسلمان کو اختلاف ہو، یعنی یہ کہنے کی

(۱) موطا، کتاب الصلوۃ، رواہ نافع مولیٰ عبداللہ ابن عمرؓ

Marfat.com

جرأت کوئی مسلمان نہ کرے گا کہ خدا کی ذات وصفات میں وحدانیت کا منکر بھی مسلمان ہوسکتا ہے۔ البتہ دوسری اور تیسری بات میں تھوڑا تردد ممکن ہے جب کہ ان کا تارک زبان سے اقرار ایمان کرتا ہو۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ قرآن کے مطلوب مسلمان کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا ہے کہ وہ نماز جیسے بنیادی فرض کا تارک ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور نماز لازم وملزوم ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ (سورہ مائدہ۔ ۵۵)

''تمہارے دوست تو بس اللہ، اس کے رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور فروتنی اختیار کرتے ہیں۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''یہ والذین امنوا سے بدل ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کی عملی تعبیر اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ عطف کے بجائے بدلیت کے اسلوب سے اس کو تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حکمت شریعت کے پہلو سے ایمان اور نماز وزکوٰۃ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے، دونوں بالکل لازم وملزوم ہیں۔ جہاں ایمان ہے نماز اور زکوٰۃ لازماً موجود ہوں گے۔ اگر یہ غائب ہیں تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ایمان بھی غائب ہے۔'' (۱)

احادیث سے بھی اس خیال کی تائید ہوئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

العهد الذی بيننا وبينهم الصلوة فمن تركها فقد كفر (۲)

''ہمارے اور ان کے درمیان جو عہد ہے (یعنی بنائے تعلق) وہ نماز ہے۔ پس جس نے اس کو چھوڑ دیا اس نے کفر کیا (اور اس سے ہمارا تعلق منقطع ہوگیا)''

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

ان بين الرجل وبين الشرك والكفر ترك الصلوة (۳)

---

(۱) تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، جلد ۲ (سورہ مائدہ) ص ۵۴۹

(۲) احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، رواہ بریدہؓ

(۳) مسلم، رواہ جابر بن عبداللہؓ

Marfat.com

''بلاشبہ آدمی اور شرک وکفر کے درمیان جو حدِ فاصل ہے وہ ترک نماز ہے۔''

ان روایات سے بالکل واضح ہو گیا کہ جس شخص نے فرض نماز ترک کر دی اس نے اپنے ''ایمان بالغیب'' کی خود اپنے عمل سے تکذیب کر دی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ نماز خدا پر ایمان کا خارجی اظہار ہے۔ اگر نماز نہیں تو گویا ایمان باللہ بھی موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسا کوئی شخص مسلمان نہیں سمجھا جاتا تھا جو تارکِ نماز ہو۔ اس سلسلے میں تین واقعے قابلِ ذکر ہیں جن کا تعلق عہد نبوت سے ہے۔

ایک واقعے کے راوی ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ: ''حضرت علی نے یمن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دباغت شدہ چمڑے میں سونا بھیجا جس میں ابھی کان کی مٹی لگی ہوئی تھی۔ رسول اللہ نے اسے چار لوگوں، زید الخیر، اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن اور علقمہ بن علاثہ (یا عامر بن طفیل) میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم سے بعض لوگوں کو ناراضی ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ مجھے امین نہیں سمجھتے عجب کہ میں اس ذات کا امین ہوں جو آسمان میں ہے۔ پھر ایک آدمی آیا جس کی آنکھیں ڈھیلے کے اندر، رخسار بڑے اور بھرے ہوئے، پیشانی ابھری ہوئی، داڑھی کے بال گتھے ہوئے، تہ بند پنڈلیوں سے اٹھا ہوا اور سر کے بال منڈے ہوئے تھے۔ اس نے کہا، اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈریں۔ آپ نے اس کی طرف سر اٹھایا اور فرمایا، تیری ہلاکت، کیا میں تمام ساکنانِ زمین سے زیادہ اس بات کا حقدار نہیں کہ اللہ سے ڈروں۔ یہ کہہ کر آپ نے اس کی طرف سے چہرہ پھیر لیا۔ یہ دیکھ کر خالدؓ نے کہا، یا رسول اللہ، کیا میں اس کی گردن نہ اڑا دوں۔ آپ نے فرمایا: شاید نماز پڑھتا ہو (فلعله یکون یصلی) خالد نے کہا: کبھی کبھی پڑھتا ہے، اپنی زبان سے وہ بات کہتا ہے جو اس کے دل میں نہیں ہے (انه ربّ مصلی، یقول بلسانه مالیس فی قلبه) رسول اللہ نے فرمایا: مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے دلوں میں نقب لگاؤں یا ان کے شکم چاک کروں۔ (انی لم أومر أن انقب عن قلوب الناس و لااشق بطونهم)''(۱)

دوسرے واقعے کے راوی بسر بن محجنؓ ہیں۔ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ:

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبلؒ، ج ۳، ص ۴۰۳

Marfat.com

''ایک بار وہ (محجن) رسول اکرمؐ کی ایک مجلس میں شریک تھے۔ اذان ہوئی تو رسول اکرمؐ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور لوگوں کے ساتھ نماز ادا فرمائی اور پھر مجلس میں واپس تشریف لائے۔ وہ (یعنی محجن) مجلس ہی میں بیٹھے رہے، رسول اللہ کے ساتھ شریک نماز نہ ہوئے۔ آنحضورؐ نے پوچھا: تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں ادا کی، کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ (ألست برجل مسلم) انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ، میں دراصل اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا (اس لیے آپ کے ساتھ نماز نہیں پڑھی) آپ نے فرمایا: تم لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ لیتے خواہ پہلے پڑھ چکے تھے۔''(۱)

تیسرے واقعے کے راوی عبیداللہ ابن عدی بن الخیار ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''ایک بار کا واقعہ ہے کہ رسول اکرمؐ صحابہ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی (عتبان بن مالک) آیا اور اس نے رسول اللہ سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے کیا سرگوشی کی یہاں تک کہ اسے رسول اللہ نے ظاہر کردیا۔ وہ شخص ایک منافق آدمی (مالک بن الدخشم) کے قتل کی اجازت طلب کررہا تھا۔ آنحضورؐ نے اونچی آواز میں فرمایا: کیا وہ گواہی نہیں دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں؟ اس شخص نے کہا: کیوں نہیں، لیکن اس کی شہادت، شہادت نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا وہ نماز نہیں پڑھتا؟ اس شخص نے کہا: کیوں نہیں، لیکن اس کی نماز، نماز نہیں ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا: أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ نَهَانِي اللّٰهُ عَنْهُمْ ''ایسے لوگوں کو قتل کرنے سے اللہ نے مجھ کو منع کردیا ہے۔''(۲)

متذکرہ بالا واقعات سے، جن کا تعلق دورِ نبوت سے ہے، کسی ادنیٰ اشتباہ کے بغیر معلوم ہوگیا کہ کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لیے ''شہادتین'' کے اقرار کے ساتھ نماز کا باضابطہ اہتمام ضروری ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں حقیقی معنی میں ایمان موجود ہو اور بندے کے عمل سے اس کا اظہار نہ ہو یعنی وہ تارکِ نماز ہو۔

اس سلسلے میں علماء و فقہاء کی رائے مختلف ہے۔ جو شخص تارک نماز ہو اور اس کو فرض بھی نہ جانتا ہو تو وہ متفقہ طور پر کافر ہے۔ لیکن اگر اس کی فرضیت کا منکر نہ ہو اور محض غفلت

(۱) موطا، کتاب الصلوٰۃ، باب: اعادۃ الصلوٰۃ مع الامام

(۲) موطا، کتاب الصلوٰۃ، باب جامع الصلوٰۃ

Marfat.com

ترکِ نماز کی علت ہے تو علماء و فقہاء کے ایک بڑا گروہ کا خیال ہے کہ وہ کافر نہ ہوگا بلکہ فاسق سمجھا جائے گا، اور اگر وہ اپنی غلطی محسوس کر لے اور اقامتِ صلوٰۃ پر کاربند ہوجائے تو قابلِ معافی ہے ورنہ واجب القتل ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔ لیکن فقہاء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ تارکِ نماز بہرحال کافر ہے۔ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ تارک نماز کو کافر نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن سزا کے طور پر اس کو اس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک کہ وہ نماز نہ شروع کردے۔(۱)

ممکن ہے کہ اس دنیا میں تارک نماز کو قانونی اعتبار سے مسلمان سمجھ لیا جائے اور وہ سزا سے بچ بھی جائے لیکن روز آخرت وہ بہرحال مسلمانوں کے زمرہ سے خارج ہوگا۔ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے:

> ''جس نے نماز کی نگہداشت نہیں کی اس کے لیے (روز قیامت) نہ روشنی ہوگی نہ (اس کے مومن ہونے کی) دلیل بنے گی اور نہ اس کے لیے وجہ نجات ہوگی۔ قیامت میں اس کا حشر قارونؔ، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔''(۲)

قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ جب اہلِ جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ وہ جہنم میں کیوں داخل کیے گئے تو وہ سب سے پہلے اپنے جس جرم کا اعتراف کریں گے وہ ترکِ نماز ہے (وَلَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ: سورہ مدثر۔۴۳) اور اسی سلسلۂ کلام میں فرمایا گیا ہے: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ (آیت۔۴۸) ''پس شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی ان کو کچھ نفع نہ دے گی۔''

قرآن کی یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے ایک تازیانۂ تنبیہ ہے جو تارک نماز ہیں اور پھر بھی سمجھتے ہیں کہ وہ معاف کردیے جائیں گے اور نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے وہ بالآخر جنت میں داخل ہوں گے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ فرض نمازوں کا ترک ایک چیز ہے اور اس میں کمی و کوتاہی دوسری چیز ہے۔ اوّل چیز عدمِ ایمان کی دلیل ہے۔

---

(۱) نیل الاوطار، ج۱، ص۳۶۹

(۲) رواہ احمد، الدارمی والبیہقی، مشکوٰۃ، ج۱، ص۵۹

Marfat.com

جہاں تک تیسری بات کا تعلق ہے یعنی ترکِ زکوٰۃ، اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو باب الزکوٰۃ میں کی گئی ہے۔ قارئین اس کو وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اوقاتِ صلوٰۃ

قرآن مجید اور حدیث دونوں میں اوقاتِ نماز کا ذکر آیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں صرف دو وقت کی نمازیں فرض تھیں یعنی صبح و شام کی نمازیں لیکن ان کے اوقات واضح طور پر متعین نہیں تھے۔ ان نمازوں کے لیے قرآن میں ''بکرہ اور اصیل " (احزاب:٦) ''غدو اور اصال'' (اعراف:۲۴) ''غداوہ اور عشی'' (کہف:۴) جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ''بکرہ، غدو اور غداوہ'' کے معنی صبح اور ''عشی و اصیل'' کے معنی شام کے ہیں۔ صبح اور شام کی نمازوں سے مراد نماز فجر اور نماز عصر ہے۔ سب سے پہلے نماز فجر کا وقت مقرر کیا گیا۔ سورہ طور میں ارشاد ہوا ہے:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ۔

(آیات:٤٨،٤٩)

''اور اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ جس وقت تم اٹھتے ہو، اور شب میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت بھی۔''

ان آیات میں ''ادبار النجوم'' سے نماز فجر کے وقت کا آغاز اور سورہ طٰہٰ کی آیت (۱۳۰): فاصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس الخ سے اس کے آخری وقت کا علم ہوتا ہے۔ اور یہ ''قبل طلوع الشمس'' کے الفاظ سے بالکل ظاہر ہے۔

ابتدا میں عصر کی نماز کے لیے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اصیل اور عشی کے الفاظ استعمال کیے گئے جن کے لغوی معنی دن کے آخری حصے کے ہیں۔ دن کے آخری حصے سے مراد شام کا وقت ہے جو غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک ہوتا ہے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی عصر کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

سورہ روم میں عشاء کو چھوڑ کر تمام اوقات نماز کا ذکر آگیا ہے، فرمایا ہے: فَسُبْحٰنَ

Marfat.com

اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ٥ وَلَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّحِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ (آیات :۱۷،۱۸) ان آیات میں ''حین تصبحون'' سے واضح طور پر فجر، ''حین تمسون'' (۱) سے مغرب، ''عشیا'' سے عصر اور ''حین تظھرون'' سے ظہر کے اوقات کو متعین کیا گیا ہے۔

سورہ طٰہٰ میں نماز کے اوقات کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے: فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِہَا وَمِنۡ اٰنَآءِ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّہَارِ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی (آیات: ۱۳۰) آیت میں اطراف النہار کے الفاظ قابل غور ہیں۔ سورج کی منازلِ گردش کے اعتبار سے دن کے تین ہی کنارے ہوتے ہیں، ایک فجر جب سورج طلوع ہوتا ہے، دوسرا ظہر جب سورج نصف النہار پر ہوتا ہے اور تیسرا مغرب جب سورج غروب ہوتا ہے۔ چنانچہ ''اطراف النہار'' سے بالترتیب فجر، ظہر اور مغرب کے اوقات، ''قبل غروبھا'' سے نماز عصر اور ''من اناء الیل'' سے عشاء کے وقت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ''قبل طلوع الشمس'' کے الفاظ سے نماز فجر کے وقت کو مؤکد کیا گیا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل پہلی سورہ ہے جس میں نماز کے لیے اقامت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اوقات نماز کو بھی بالترتیب بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ٥ وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً

---

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی نے ''حین تمسون'' کا اطلاق عصر اور مغرب دونوں پر کیا ہے۔ اسی طرح ''عشیا'' سے عشاء کا وقت مراد لیا ہے۔ (تدبر، ج ۶، ص ۸۱، تفسیر سورہ روم) لغوی اعتبار سے اس مفہوم کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن قرآن مجید میں عشی کا لفظ زیادہ تر زوال کے وقت کے لیے استعمال ہوا ہے (دیکھیں سورہ ص: ۱۸، ۳۱) اکثر مقامات پر اس کے بالمقابل لفظ کے طور پر ''بکرۃ'' اور ''غداوۃ'' جیسے الفاظ استعمال کیے گئے۔ (سورہ انعام: ۵۲، کہف: ۲۸، مریم: ۱۱) اس بنا پر راقم کی رائے میں ''حین تمسون سے مغرب اور ''عشیا'' سے نماز عصر مراد ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ''حین تمسون'' کے بالمقابل ''حین تصبحون'' کا جملہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''حین تمسون'' کا اطلاق اس وقت پر ہوگا جب ابھی سورج غروب ہوا ہو۔ اور یہی نماز مغرب کا وقت ہے۔

Marfat.com

لَّكَ ۃ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا○ (آیات ۷۸،۷۹)

آیت میں دلوک کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس کے لغوی معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔اس جھکنے میں تین حالتیں آتی ہیں۔پہلی حالت وہ ہے جس میں سورج سمت الراس سے ہٹ کر جھک جاتا ہے۔اس جھکاؤ (دلوک) سے نماز ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے اور عصر سے کچھ پہلے تک رہتا ہے۔دوسری حالت وہ ہے جس میں سورج جھک کر آنکھ کے مدِ مقابل آجاتا ہے۔ یہ نماز عصر کا وقت ہے۔تیسری حالت وہ ہے جس میں سورج پوری طرح جھک کر نیچے آجاتا ہے اور پھر غروب ہوجاتا ہے۔ یہ مغرب کا وقت ہے۔ان تین اوقات کا تعلق دن کی نمازوں سے ہے۔شب کی ایک ہی نماز عشاء ہے۔اس کا وقت ''غسق الیل'' کے الفاظ سے متعین ہوتا ہے۔غسق لیل سے تاریکی کی وہ حالت مراد ہے جب وہ خوب پھیل کر ہر چیز کو اس حد تک ڈھانک لے کہ ناقابلِ شناخت بن جائے۔اور یہ حالت مغرب کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔سورہ یوسف میں ایک جگہ عشاء کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے غسقِ لیل کا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے:

وَجَآءُوۡ اَبَاهُمۡ عِشَآءً یَّبۡكُوۡنَ (آیت:۱۶)

''وہ اپنے باپ کے پاس تیسرے پہر رات گئے روتے ہوئے آئے۔''

شب کے اختتام پر نماز فجر ہے جس کا وقت پو پھٹنے سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ہے۔''فجر'' کے لفظ سے یہ مفہوم بالکل واضح ہے۔''قران الفجر'' سے نماز فجر ہی مراد ہے۔ آیت میں ''ومن الیل فتھجد بہ'' سے نماز تہجد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو ایک نفل نماز ہے اور الفاظِ آیت کے مطابق صرف نبی ﷺ کے لیے مخصوص تھی۔

قرآن مجید میں صرف دو نمازوں کا ذکر ان کے موجودہ ناموں کے ساتھ ہوا ہے، ایک نماز فجر اور دوسری نماز عشاء۔سورہ نور میں ہے:

مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوةِ الۡفَجۡرِ وَحِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَكُمۡ مِّنَ الظَّهِیۡرَةِ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوةِ الۡعِشَآءِ ۃ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّكُمۡ ؕ (آیت:۵۸)

''نماز فجر سے پہلے اور جس وقت کہ تم گرمی کی وجہ سے اپنے کپڑے اتار دیتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد، یہی تین وقت تمہارے لیے پردے کے ہیں۔''

Marfat.com

حدیث میں اوقات نماز کا ذکر زیادہ واضح صورت میں ہوا ہے، اور یہ دراصل قرآن کے مذکورہ مجمل اشارات کی شرح وتفصیل ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے:

''جبرئیل نے دو مرتبہ بیت اللہ کے پاس مجھ کو نماز پڑھائی۔ پہلے دن ظہر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جب کہ ہر چیز کا سایہ ایک جوتی کے تسمے سے زیادہ نہ تھا، پھر عصر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے اپنے قد کے برابر تھا، پھر مغرب کی نماز ٹھیک اس وقت پڑھائی جب روزہ دار افطار کرتا ہے، پھر عشاء کی نماز شفق غائب ہوتے ہی پڑھادی اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن انھوں نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد کے برابر تھا۔ اور عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد سے دوگنا تھا۔ اور مغرب کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ روزہ دار افطار کرتا ہے اور عشاء کی نماز ایک تہائی رات گزر جانے پر، اور فجر کی نماز اچھی طرح روشنی پھیل جانے پر پڑھائی۔ پھر جبرئیل نے پلٹ کر مجھ سے کہا ''اے محمد یہی اوقات انبیاء کے نماز پڑھنے کے ہیں اور نمازوں کے اوقات ان دو وقتوں کے درمیان ہیں۔'' (۱)

ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''ظہر کا وقت اس وقت ہوتا ہے جب سورج ڈھل جائے اور آدمی کا سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے اور یہ اس وقت تک ہے جب تک کہ عصر کا وقت نہ آجائے۔ عصر کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ سورج زرد نہ ہو جائے، اور مغرب کی نماز کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ شفق غائب نہ ہو اور عشاء کی نماز کا وقت آدھی رات تک ہے۔ اور فجر کی نماز کا وقت آثار صبح کے ظاہر ہونے سے آفتاب کے نکلنے تک ہے۔'' (۲)

---

(۱) ابوداؤد، ترمذی

(۲) صحیح مسلم، رواہ عبداللہ ابن عمرؓ

Marfat.com

صلوٰۃ کے اجزائے ترکیبی

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ نماز کے جملہ اجزائے ترکیبی نبی علیہ ﷺ نے اپنی صوابدید سے متعین فرمائے ہیں۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا ماخذ قرآن ہی کی مختلف سورتوں کی آیات ہیں، جیسا کہ درج ذیل سطور سے معلوم ہوگا۔

نیّت

نیّت گو کہ نماز کا جزءِ لازم نہیں لیکن اس میں جو الفاظ کہے جاتے ہیں وہ قرآن مجید کی سورہ انعام سے ماخوذ ہیں:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (آیت ـ ۷۹)

''میں نے اپنا رخ اسی ہستی کی طرف کرلیا جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

قیام

نماز میں قیام کا حکم اس آیت کے مطابق ہے:

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ (سورہ بقرہ:۲۳۸)

''اللہ کے آگے نیازمندانہ کھڑے رہو۔''

تکبیر تحریمہ

تکبیر کے الفاظ یعنی اللہ اکبر، سورہ مدثر کی آیت: وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (۱) (اپنے رب کی بڑائی بیان کرو) سے معناً ماخوذ ہیں۔

ثنا

سُبْحٰنَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ

---

(۱) سورہ مدثر، آیت:۳

Marfat.com

''اے اللہ تو (ہر عیب ونقص سے) پاک ہے۔تو ہی حمد وستائش کا سزاوار ہے، تیرا نام بابرکت ہے، تیری بزرگی نہایت بلند وبالا ہے۔''

ثنا کے یہ الفاظ قرآن مجید کی مختلف سورتوں سے لیے گئے ہیں۔''سبحنك اللهم'' کا جملہ سورہ یونس، آیت ۱۰، ''تبارك اسمك'' کا جملہ سورہ رحمٰن، آیت ۷۸ اور ''وتعلی جدك'' کا جملہ سورہ جن، آیت ۳ سے ماخوذ ہے۔

تعوّذ

ثنا کے بعد تعوّذ (اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم) پڑھنا درج ذیل حکم خدا کی پیروی میں ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○

(سورہ نحل:۹۸)

''پس جب تم قرآن پڑھو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

تسمیہ

تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بجز سورہ توبہ کے، قرآن مجید کی ہر سورہ کے شروع میں مرقوم ہے۔ چنانچہ آدابِ تلاوت میں یہ بات داخل ہے کہ اس کا آغاز اسی جملہ سے ہو۔

قرأت

نماز میں قرآن کی چند آیات کی تلاوت لازمی ہے۔ اس کا آغاز سورہ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اس کی وجہ اس کی عظمت وفضیلت ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِىْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (سورہ حجر:۸۷)

''ہم نے تم کو سبع مثانی اور قرآن عظیم عطا کیے۔''

''سبع مثانی'' سے عام طور پر علماء اور مفسرین نے سورہ فاتحہ مراد لی ہے۔ سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کی کوئی ایک سورہ یا اس کی چند آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے۔ ارشاد ہوا:

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ط

(سورہ مزمل:۲۰)

Marfat.com

''اس نے جان لیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔ پس اس نے تم پر مہربانی کی، جتنا قرآن بآسانی پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو۔''

رکوع

رکوع کا حکم آیتِ ذیل میں ہے:

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (سورہ بقرہ:۴۳) ''اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔'' رکوع کی حالت میں کم از کم تین بار ''سبحان ربّی العظیم'' کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔ اور یہ دراصل خدا کے اس حکم کی تعمیل ہے:

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (سورہ واقعہ:۹۶)

''تم اپنے عظیم رب کے نام کی تسبیح کرو۔''

حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت (فسبح باسم ربك العظيم) نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ لو، یعنی سبحان ربی العظيم کہا کرو۔ اور جب آیت: سبح اسم ربك الاعلىٰ نازل ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ اسے اپنے سجدہ میں رکھ لو، یعنی سبحان ربی الاعلیٰ کہا کرو۔'' (۱)

اس حدیث سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے قرآن کی مختلف سورتوں کی روشنی میں نماز کی ہیئتِ ترکیبی کا تعین فرمایا ہے۔

قیامِ ثانی

سمع الله لمن حمده (اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی حمد کی۔) کے الفاظ، جو رکوع سے اٹھنے کے بعد کہے جاتے ہیں، قرآن کی اس آیت سے جزءً ماخوذ ہیں:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا الخ

(سورہ مجادلہ:۱)

''اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔''

"سمع الله لمن حمده" کہنے کے بعد "ربنا لك الحمد" کہا جاتا ہے۔ قرآن

(۱) مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ

Marfat.com

کی متعدد سورتوں میں ہے کہ ساری تعریف کا مستحق ایک اللہ ہے۔ سورہ فاتحہ کا آغاز ہی خدا کی تعریف سے ہوتا ہے۔ سورہ تغابن میں فرمایا گیا ہے:

وَلَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آیت:۱)

''بادشاہت اسی کی ہے اور تعریف کا سزاوار بھی وہی ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

مذکورہ جملے (ربنا لک الحمد) کی ترکیب اسی نوع کی آیات سے ہوئی ہے۔

سجدہ

"ربنا لك الحمد" کے بعد سجدہ کیا جاتا ہے، اور یہ عمل اس حکم الٰہی کے مطابق ہے:

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (سورہ النجم:٦٢)

''اللہ کے آگے جھک جاؤ اور اس کی بندگی کرو۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ (سورہ حجر:۹۸)

''پس تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور سجدہ گزاروں میں شامل رہو۔''

ایک اور مقام پر ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سورہ علق:۱۹)

''اور سجدہ کر اور اس سے قریب ہو جا۔''

سجدے میں کم از کم تین بار ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کہا جاتا ہے اور یہ جملہ، جیسا کہ رکوع کی وضاحت میں ذکر ہوا، درج ذیل آیت سے لیا گیا ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى الَّذِيْ خَلَقَ (سورہ اعلیٰ:۱)

''اپنے بلند و برتر رب کا نام لو جس نے پیدا کیا۔''

قعدہ

حالتِ قعدہ میں خدا کا ذکر اس ارشاد سے ماخوذ ہے:

Marfat.com

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ الخ

(سورہ نساء:۱۰۳)

''اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر۔''

تشہد

تشہد کے الفاظ قرآن مجید کی مختلف آیات سے لیے گئے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ: سورہ نور آیت ٦١، وَالصَّلوَاتُ: سورہ بقرہ آیت ١٥٧، وَالطَّيِّبَاتُ: سورہ نور، آیت ٦١، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ: سورہ احزاب، آیت ٥٦، سورہ مریم، آیت ٤٧، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا: سورہ رعد، آیت ٢٤، وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ: سورہ نمل، آیت ١٩، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: سورہ ال عمران، آیت ١٨، وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ: سورہ منافقون، آیت ١ اور سورہ فتح آیت ٢٩

دعا

تشہد کے بعد پڑھی جانے والی ایک دعا یہ ہے:(۱)

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

''اے اللہ میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کرے، تو مجھے معاف کردے، تو مجھ پر رحم فرما، بے شک تو ہی معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

اس دعا کے الفاظ قرآن کی مختلف سورتوں سے لیے گئے ہیں، مثلاً:

سورہ قصص، آیت ١٦ (اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا

(۱) اس کے علاوہ دوسری دعائیں بھی نبی ﷺ سے منقول ہیں۔ دیکھیں بخاری ۲/۲۶۳، باب: الدعا قبل السلام، مسلم، فی المساجد ومواضع الصلوٰۃ، ابوداؤد، باب الدعا فی الصلوٰۃ۔

Marfat.com

كَثِيْرًا)، سورہ ال عمران، آیت ۱۳۵ (وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا
اَنْتَ)، سورہ اعراف، آیت ۱۵۱، سورہ حدید، آیت ۲۰
(فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ)، سورہ اعراف، آیت ۱۵۵،
سورہ مومنون، آیت ۱۰۹ (وَارْحَمْنِيْ)، سورہ توبہ،
آیات ۹۱،۹۹،۱۰۲ (اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ)

سلام

سلام کے الفاظ بھی قرآن سے ماخوذ ہیں۔فرمایا گیا ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ الخ (سورہ نحل:۳۲)

''وہ (فرشتے) کہیں گے،تم پر سلامتی ہو۔''

وجوبِ صلوٰۃ کا تدریجی حکم

اوقاتِ نماز کے ذکر میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ابتدا میں پانچ وقت کی نمازیں فرض نہ تھیں، یہ تدریجاً فرض ہوئیں اور واقعۂ معراج کے بعد ان کی تکمیل ہوئی۔اس تدریجی حکم کی ایک وجہ انسان کی نفسیات کا لحاظ تھا۔جوں جوں مسلمانوں کی ایمانی حالت میں پختگی آتی گئی اس کی نسبت سے نماز کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔اس تدریج کی دوسری وجہ حالات وظروف کی رعایت تھی۔شروع میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور کفارِ مکہ کی ایذا رسانی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اس لیے دن کے اوقات میں نماز کی ادائیگی میں بہت سے خطرے تھے۔اس کے علاوہ بہت سے مسلمان کفار کی ایذا رسانی کے ڈر سے اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔ان وجوہ سے ابتدا میں صرف صبح وشام کے اوقات میں عبادت کا حکم دیا گیا، جیسا کہ قرآن کی متعدد آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (سورہ غافر: ۵۵)

''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، صبح اور شام کے اوقات میں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

Marfat.com

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ

(سورہ ق: ۳۹)

''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج کے طلوع اور غروب سے پہلے۔''

لیکن جب حالات میں تھوڑی تبدیلی آئی اور مسلمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تو اس حمد و تسبیح کی ظاہری ہیئت متعین کی گئی اور با قاعدہ نماز کی ادائیگی کا حکم دیا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے صبح اور شب کی نمازوں کی صورت گری ہوئی۔ شب کی طویل نماز کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ

(سورہ مزمل: ۲۰)

''بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم شب میں دو تہائی رات یا نصف رات یا تہائی رات تک قیام کرتے ہو اور ایک گروہ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی (شریک نماز ہوتا ہے)۔''

سورہ مزمل بالکل ابتدائی دور کی سورہ ہے۔ اوپر کی آیت سے بالکل واضح ہے کہ مسلمان صرف شب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے کیونکہ دن کے اوقات میں کفار کے ظلم و ستم کی وجہ سے نماز با جماعت ممکن نہ تھی۔ رفتہ رفتہ شب کی اس طویل نماز کو کم کیا گیا اور اس کو دن کے مختلف اوقات میں رکھا گیا۔ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝

(آیت: ۷۸)

یہ پہلی مکی سورہ ہے جس میں صاف لفظوں میں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے اوقات بھی متعین کیے گئے ہیں، یعنی دلوکِ شمس سے رات کے تاریک ہونے تک۔ دلوک شمس (۱) سے ظہر اور عصر کی نمازیں اور غسقِ لیل سے عشاء کی نماز اور قرآن الفجر سے نماز فجر

---

(۱) دلوک شمس کا مطلب سورج کا نصف النہار پر پہنچ کر مغرب کی سمت میں جھکنا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں۔

Marfat.com

مراد ہے۔ مغرب کا وقت ابھی تک غیر معین تھا جس کو سورہ طٰہ میں متعین کر دیا گیا، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔ اس طرح تدریجاً پانچ اوقات کی نمازیں فرض ہوئیں۔

کیا موجودہ دور میں تدریجاً اقامتِ صلوٰۃ جائز ہے؟

عہد نبوی میں نماز کے تدریجی قیام کی ایک علت حالات کی نامساعدت تھی، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ موجودہ دور میں یہ صورت باقی نہیں ہے۔ تقریباً ہر ملک کے مسلمان اس امر میں آزاد ہیں کہ وہ کسی خوف و خطر کے بغیر نمازِ پنج گانہ ادا کریں۔ لیکن دوسری علت یعنی انسانی نفسیات کی رعایت نہ صرف موجودہ عہد میں بلکہ آئندہ بھی اپنی جگہ باقی رہے گی۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کی جو ایمانی حالت ہے وہ عہد نبوت کے مسلمانوں کی ایمانی حالت سے بدرجہا فروتر ہے اور بعض حالتوں میں معدوم کے درجہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کے لیے پابندی کے ساتھ پانچ اوقات کی نمازوں کی ادائیگی ایک مشکل کام ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تارک نماز ہے۔ بہت سے مسلمان نماز تو پڑھتے ہیں لیکن اس کی محافظت سے قاصر رہتے ہیں۔ بہت سے مسلمان نمازیں پڑھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ جو مسلمان پابندی سے نماز پڑھتے ہیں ان کی نمازیں خشوع و خضوع سے یکسر خالی ہوتی ہیں اور ان میں رسمیت زیادہ ہوتی ہے۔

اس صورت حال کی ایک ہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایمانی حالت حد درجہ کمزور ہے۔ ان حالات میں اس بات پر اصرار کہ جب کوئی خاندانی مسلمان نماز پڑھنا شروع کرے تو وہ لازماً پانچ اوقات کی نماز ادا کرے ایک غیر حکیمانہ اصرار ہوگا۔ اس کو یہ ضرور بتایا جائے کہ ازروئے شرع تو اس پر پانچ اوقات کی نمازیں فرض ہیں لیکن وہ اس حکم پر بتدریج کاربند ہو۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میرے اس خیال پر علماءِ کرام چیں بجبیں ہوں گے اور اس کو اسلامی شریعت میں مداخلت اور تحریف فی الدین قرار دیں گے۔ لیکن جو علماء اسرارِ شریعت پر نظر رکھتے ہیں اور اسلامی احکام کے تدریجی نفاذ کی صحیح علت سے واقف ہیں وہ اس کی تائید کریں گے۔ کیا یہ بات اچھی ہے کہ ایک مسلمان پانچ اوقات کی نمازوں کو ایک کارِ دشوار سمجھ کر چھوڑ بیٹھے یا یہ بات مناسب ہے کہ اس کو ترکِ صلوٰۃ سے روکا جائے خواہ وہ

Marfat.com

ابتدا میں ایک دو وقت کی ہی نماز پڑھے۔ مکمل طور پر نماز چھوڑ دینے کی صورت میں تو اس کی طرف التفات کا امکان بہت بعید ہو جائے گا لیکن نماز سے جڑے رہنے کی صورت میں، خواہ یہ جوڑ تارِ عنکبوت کی مانند کمزور ہو، یہ عین ممکن ہے کہ وہ کسی دن پانچ اوقات کی نمازیں پابندی کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہو جائے۔ بہر حال، علماء اس پر غور کریں کہ فیصلہ ان ہی کا مانا جائے گا۔

اقامتِ صلوٰۃ کے شرائط

دنیا میں ہر کام کے کچھ آداب ولوازم ہیں جن کی پابندی سے وہ کام ٹھیک ڈھنگ سے انجام پاتا ہے اور اس کے فائدے ظاہر ہوتے ہیں۔ عام طور پر مسلمان سمجھتے ہیں کہ نماز کے ظاہری ارکان وواجبات ادا کر لینے سے وہ ادا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک بڑی بھول ہے۔ نماز کے فائدے اسی وقت حاصل ہوں گے جب نماز کے ظاہری لوازم کے ساتھ اس کے باطنی آداب وشرائط کی پابندی کی جائے ورنہ نماز محض ایک جسمانی ریاضت ہوگی اور اس سے کوئی روحانی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ سطورِ ذیل میں ان آداب وشرائط کا ذکر ہے جن کی بجا آوری سے نماز مکمل ہوتی ہے اور اس کے ظاہری وباطنی منافع حاصل ہوتے ہیں۔

خارجی شرائط

نماز کے خارجی شرائط میں طہارت، ستر پوشی، استقبالِ قبلہ، ترتیلِ آیات اور تعدیلِ ارکان جیسے امور قابلِ ذکر ہیں۔

طہارت

طہارت کے اندر کپڑے اور جسم دونوں کی صفائی شامل ہے۔ نبی ﷺ کو آغازِ نبوت میں جو دو بنیادی حکم دیے گئے ان کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝

(سورہ مدثر: ٤)

''اے چادر لپیٹ کر سونے والے! اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤ اور صرف اپنے رب کی بڑائی ظاہر کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو۔''

اس آیت میں ''وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ'' سے مراد قیامِ نماز ہے جو خدا کی توحید اور اس کی بڑائی وبزرگی

Marfat.com

کے اظہار و اعلان کی سب سے جامع اور اعلیٰ شکل ہے۔ اس کے بعد فرمایا: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ یعنی اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو۔ کپڑوں کی صفائی سے مفسرین نے ایک سے زیادہ مفہوم مراد لیے ہیں لیکن ظاہر الفاظ سے عدول کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نماز خدا سے مناجات ہے اس لیے اس حالت میں کپڑے اور جسم کی پاکی نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر آدمی کسی وجہ سے ناپاک ہو تو نماز سے پہلے غسل ضروری ہے، فرمایا:

وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا (سورہ مائدہ:۷)

''اگر تم ناپاکی کی حالت میں ہو تو (غسل کے ذریعہ جسم کی) پاکی حاصل کرو۔ (اور اس کے بعد ہی نماز پڑھو)''

لیکن اگر آدمی ناپاکی کی حالت میں نہ ہو تو نماز سے پہلے غسل کے بجائے وضو کرنا مشروع ہے، جو دراصل غسل کا قائم مقام ہے۔ چنانچہ مذکورہ آیت سے ٹھیک متصل ہی فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (سورہ مائدہ:٦)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو، اور اپنے سروں کا مسح کرو، اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولو۔''

اور یہ آیت اس جملے پر ختم ہوتی ہے:

مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

''اللہ تم کو کسی تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔''

مذکورہ آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ اگر آدمی ناپاکی کی حالت میں نہ ہو تو طہارت کے لیے وضو کافی ہے۔ دوسرے وضو سے جسم کے بعض ظاہری اعضاء کی طہارت

Marfat.com

کے ساتھ قلب وروح کی پاکی بھی مطلوب ہے۔اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔تیسرے یہ کہ غسل کی جگہ وضو کی اجازت خدا کی طرف سے ایک بڑی رعایت اور اس کا انعام ہے جس سے مسلمانوں کو نوازا گیا ہے اور اس کا شکر واجب ہے۔دنیا کی دوسری قوموں کو بوقت عبادت یہ سہولت حاصل نہیں ہے۔(۱)

مقصودِ طہارت

عام طور پر مسلمان وضو کو چند ظاہری اعضائے بدن کی طہارت کا ایک سادہ سا عمل سمجھتے ہیں جب کہ اس کا مقصود اس سے کہیں زیادہ ہے۔وضو میں جسم کے جن حصوں کو دھویا جاتا ہے وہ اس کے کھلے حصے ہیں۔کام کاج یا سفر کے دوران میں زیادہ تر بدن کے یہی حصے گرد یا گندگی سے آلودہ ہوتے ہیں اور وضو کے ذریعہ یہ وقتی آلودگی دور ہوجاتی ہے۔لیکن ساتھ ہی نمازی یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس نے اس عمل کے ذریعے پورے جسم کو پاک کرلیا ہے،اور یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے۔

وضو کا عمل پانی کے استعمال سے جڑا ہوا ہے۔یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ غصے کی حالت میں ٹھنڈا پانی پی لینے سے نفس کی ہیجانی حالت میں قدرے سکون آجاتا ہے،ٹھیک اس طرح جیسے گرم انجن کے اوپر پانی ڈالنے سے وہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا

---

(۱) یہودیوں کے ہاں عبادت سے پہلے غسل ضروری ہے۔اس معاملے میں ان کا غلو اس حد کو پہنچ گیا کہ انھوں نے کھانے سے پہلے بھی نہانا ضروری قرار دے لیا۔یہی تشدد اہل ہنود کے یہاں ملتا ہے۔ان کا مذہبی طبقہ پوجا اور کھانے سے پہلے غسل کو لازمی سمجھتا ہے۔اجودھیا کی بابری مسجد کے تنازعہ میں بہت سے ہندو مذہبی لیڈر گرفتار کیے گئے اور جیل بھیج دیے گئے۔وہاں انھوں نے اس بنا پر بھوک ہڑتال کردی کہ جیل میں کھانے اور پوجا سے پہلے کنویں یا دریا کے پانی سے نہانے کی سہولت حاصل نہیں ہے۔ان کے وکیل نے ۲۹/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرتے ہوئے کہا۔

This meant that the Swami's will have to be continously on fast. since, according to their religious rites, they can not take food (or go to prayer) unless they had taken bath in a river or a well five times a day. (The Hindustan Times, October 30, 1990)

Marfat.com

ہے کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو وہ بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اور پانی پی لے۔

حالت سفر میں اس بات کا مشاہدہ بخوبی ہوتا ہے۔ چنانچہ جس وقت پیاس کی شدت سے ہونٹوں پر پپڑیاں پڑ جاتی ہیں اور چہرہ آگ کی طرح جل رہا ہوتا ہے تو اس وقت ایک مسافر کو دو ہی چیزیں مطلوب ہوتی ہیں، ایک درخت کا سایہ اور دوسرے ٹھنڈا پانی۔ درخت کے سائے میں بیٹھ کر جہاں اس نے ہاتھ منہ دھوئے اور پانی کے چند گھونٹ پیے فوراً ہی اس کے رخسار و بدن کی ساری گرمی کافور ہو جاتی ہے اور طبیعت فرحت و انبساط محسوس کرتی ہے۔

وضو کے عمل سے ایک نمازی کو اسی نوع کا احساسِ سکون حاصل ہوتا ہے بالخصوص اس نمازی کو جو کسبِ معاش میں سخت جدّ و جہد کے بعد بغرضِ عبادت مسجد میں آتا ہے۔ ہر نمازی دل سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور میں پورے انشراحِ قلب سے حاضر ہو، جسمانی کسل مندی اور پراگندہ خاطری کی حالت نہ ہو۔ وضو سے یہ مقصد بڑی حد تک حاصل ہو جاتا ہے۔

طہارت کا ایک باطنی پہلو بھی ہے جو اوّل الذکر سے زیادہ اہم ہے۔ معلوم ہے کہ نمازی سب سے پہلے اپنی ہتھیلیوں کو تین بار دھوتا ہے۔(۱) پھر تین بار کلی کرتا اور ناک میں پانی ڈالتا ہے، پھر تین بار چہرے کو دھوتا ہے،(۲) پھر تین بار دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوتا ہے۔(۳) پھر سر اور کان کا مسح کرتا ہے۔(۴) پھر تین بار دونوں پاؤں ٹخنے تک دھوتا ہے اور آخر میں کہتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ (۵)

---

(۱) بخاری، کتاب الوضوء، عن عثمان وعبداللہ بن زید

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً، عن عبداللہ بن زید

(۴) ایضاً، باب: مسح الراس

(۵) ترمذی، عن ابن عمرؓ

Marfat.com

''اے اللہ تو مجھے توبہ کرنے والوں اور پاکی حاصل کرنے والوں میں سے بنا۔''

اس دعا کے الفاظ سے طہارت کے باطنی مقصود یعنی تزکیۂ نفس پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ وضو میں انہی اعضاء کو دھویا جاتا ہے جن سے مختلف قسم کے خارجی افعال کا صدور ہوتا ہے، اچھے بھی اور برے بھی۔ چنانچہ جن ہاتھوں سے آدمی اپنی روزی کماتا ہے اور لاچاروں کی مدد کرتا ہے انہی ہاتھوں سے قتل وخون بھی ہوتا ہے، دوسروں کو اذیت بھی پہنچائی جاتی ہے اور نامحرم عورتوں کو چھوا بھی جاتا ہے۔ جس منہ سے نیکی کی باتیں ہوتی ہیں اور خدا کی حمد و تسبیح کی جاتی ہے اسی منہ سے بدگوئی اور دروغ بافی بھی ہوتی ہے، جس ناک سے اچھی چیزوں کو سونگھا جاتا ہے اسی ناک سے بری چیزوں کو بھی سونگھا جاتا ہے، آنکھیں جہاں اچھے مناظر دیکھتی ہیں وہاں برے مناظر بھی ان کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ نامحرم عورتوں کی طرف اضطراراً نگاہ کا اٹھ جانا عام بات ہے۔ کان بری آوازیں سنتا ہے اور اچھی بھی، دماغ، جو سر کے اندر ہے، اچھی اور بری دونوں باتیں سوچتا ہے، دونوں پیر بھی اچھے اور برے دونوں کاموں کے لیے اٹھتے ہیں اور اچھے اور برے دونوں مقامات تک جاتے ہیں۔ غرضیکہ اعضاء سے کبھی نادانستہ اور کبھی دانستہ برے افعال صادر ہو جاتے ہیں۔ وضو کے وقت ان اعضاء کا دھونا دراصل ان کے ذریعے کیے گئے گناہوں پر اظہار پشیمانی ہے اور اس بات کا عزم بھی کہ اب یہ اعضاء گناہ سے آلودہ نہ ہوں گے۔ عبداللہ الصابحیؓ نبی علیہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

''جب بندۂ مومن وضو کرتا ہے، پھر کلی کرتا ہے تو اس کے منہ سے سب گناہ دھل جاتے ہیں، پھر جب ناک میں پانی ڈالتا ہے تو ناک کے گناہ دھل جاتے ہیں، پھر جب وہ چہرہ دھوتا ہے تو چہرے کے گناہ دھل جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی دونوں آنکھوں کی پلکوں سے بھی گناہ دھل جاتے ہیں، پھر جب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو دھوتا ہے تو اس کے دونوں ہاتھوں کے گناہ دھل جاتے ہیں یہاں تک کہ دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے بھی گناہ دھل جاتے ہیں، پھر جب وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے سب گناہ نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ دونوں کانوں کے گناہ، پھر جب وہ اپنے دونوں پاؤں دھوتا ہے تو اس کے دونوں پاؤں کے گناہ دھل جاتے ہیں۔(۱)

---

(۱) ایک سچے مومن کے وضو کے اثرات کا ذکر ہے، ہمارے ناقص وضو اور نماز پر اس کا اطلاق نہ ہوگا۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ وضو ایک مومن کا طغرائے امتیاز ہے۔اس دنیا میں بھی وضو سے اس کا چہرہ روشن، تابناک اور تر و تازہ نظر آتا ہے اور روز آخرت اس کی تابانی کا عالم ہی دوسرا ہوگا۔ اس دن جب انسانوں کا جمِ غفیر میدان حشر میں جمع ہوگا تو وضو ہی ایک سچے مومن کی پہچان ہوگی۔حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ:

''رسول اللہؐ ایک بار قبرستان کی طرف تشریف لے گئے اور کہا: مومنوں کے گھر! تم پر خدا کی سلامتی ہو (السلام علیکم) اللہ نے چاہا تو میں بھی تم سے جلد ہی آملوں گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لوں۔ صحابہ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول، کیا ہم لوگ آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم لوگ تو میرے اصحاب ہو۔ میرے بھائی تو وہ ہیں جو بعد میں آئیں گے اور میں حوض پر ان سب سے پہلے پہنچوں گا۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، آپ کے بعد جو لوگ آپ کی اُمت میں آئیں گے آپ ان کو کیسے پہچان لیں گے؟ آپ نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے، اگر کسی آدمی کے پاس ایک گھوڑا ہو جس کی پیشانی اور پیروں میں سفیدی ہو اور وہ سراپا سیاہ رنگ کے گھوڑوں میں موجود ہو تو کیا وہ اپنے گھوڑے کو پہچان نہ لے گا۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، وہ یقیناً پہچان لے گا۔ آپ نے فرمایا: وہ روز قیامت اس صورت میں آئیں گے کہ (وضو کے اثر سے) ان کے چہرے اور پاؤں میں سفیدی ہوگی، اور میں ان سے پہلے حوض پر پہنچوں گا۔ اس دن میرے حوض سے کوئی آدمی بھی لوٹایا نہیں جائے گا جس طرح کھویا ہوا اونٹ لوٹایا نہیں جاتا۔ میں ان کو پکاروں گا: سنو، یہاں آؤ، سنو، یہاں آؤ، سنو، یہاں آؤ (الاھلم، الاھلم، الاھلم) کہا جائے گا، آپ کے بعد انھوں نے (دین کو) بدل ڈالا۔ میں کہوں گا: دور ہو جاؤ، دور ہو جاؤ، دور ہو جاؤ۔''(۱)

ستر پوشی

ستر پوشی کا مطلب بوقت نماز جسم کے ضروری حصّوں کو ڈھانکنا ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں بہت سی جاہلانہ رسمیں جاری تھیں۔ ایک بری رسم یہ تھی کہ وہ ننگے ہو کر خانۂ کعبہ

(۱) موطا، امام مالک، باب: جامع الوضو

Marfat.com

کا طواف کرتے۔ اس برہنگی کی وجہ ان کا یہ خیال تھا کہ لباس زیب و زینت، فخر و غرور اور دنیا پرستی کی علامت ہے اس لیے ایک خدا پرست آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے سامنے دنیوی آلائش سے الگ ہو کر مکمل عاجزی اور خاکساری کے ساتھ جائے، یعنی بے لباس ہو جائے۔ مردوں کی طرح ان کی عورتیں بھی اس عمل میں برابر کی شریک تھیں اور عریاں ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ ہندوستان میں آج بھی ہندو جوگی اور بدھ راہب نیم برہنہ حالت میں رہتے ہیں اور اسی حالت میں اپنے معبودوں کی پوجا کرتے ہیں۔ قوم یہود بھی بوقتِ عبادت مکمل ستر پوشی کو ضروری خیال نہیں کرتی۔ اکثر یہودی معمولی سا لباس پہن کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔

اسلام نے عبادت کے وقت ترک یا تخفیفِ لباس کے مروجہ تصور کی مخالفت کی اور بتایا کہ بوقتِ عبادت ستر پوشی یعنی لباس کے ذریعہ پورے جسم کو ڈھانکنا ضروری ہے۔ اور یہ اہتمام زہد و عبادت کے خلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

يٰبَنِىٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ اعراف: ۳۱)

''اے بنی آدم! عبادت کے موقع پر اپنی زینت (لباس) سے آراستہ رہو۔''

اس آیت میں لباس کے لیے زینت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام میں عبادت کے وقت صرف ستر پوشی ضروری نہیں بلکہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ لباس حتی الوسع عمدہ ہو البتہ اس سے فخر و غرور کا اظہار نہ ہو۔ اگر مجبوری کی حالت میں، مثلاً بیماری اور فقر و غربت وغیرہ، شرم گاہ کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ کھلا رہ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اور مقصودِ عبادت میں اس سے کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔

استقبالِ قبلہ

ضروری ہے کہ عبادت کے اوقات میں نمازی کا رخ خانۂ کعبہ کی طرف ہو، اور یہی استقبالِ قبلہ ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ (سورہ بقرہ: ۱۴۴)

''اور تم جہاں کہیں بھی ہو (بوقت عبادت) اپنا رخ خانۂ کعبہ کی طرف رکھو۔''

Marfat.com

اس حکم کو دیکھ کر بعض غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اس کی پرستش کے ہم معنی ہے۔ اسی طرح بعض کم علم کہتے ہیں کہ کسی خاص طرف رخ کر کے عبادت کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ خدا بس اسی سمت میں موجود ہے حالانکہ وہ غیر محدود اور مطلق ہے۔ فی الواقع خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اس کی پرستش نہیں کہ اسلام میں خدا کے علاوہ کسی اور وجود کی پرستش جائز نہیں ہے، اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا ایک خاص سمت میں محدود و مقید ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥ (سورہ بقرہ:۱۱۵)

''مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں۔ تم جدھر بھی رخ کرو گے ادھر ہی اللہ کا رخ ہے۔ اللہ بے حد وسیع اور زبردست علم والا ہے۔''

عبادت کے وقت خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرنا اس لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کا مرکزِ توحید ہے اور نماز عقیدۂ توحید کی عملی شکل ہے۔ بوقت عبادت اس کی طرف رخ کرنا دراصل اس مرکزِ توحید سے ذہنی و قلبی وابستگی کا اظہار ہے۔ اس سے زیادہ استقبالِ قبلہ کا اور کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی درج ذیل آیت بڑی اہمیت رکھتی ہے:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥

(سورہ بقرہ:۱۴۸)

''ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (عبادت کے وقت اپنا) رخ کرتا ہے۔ پس تم نیکی کی راہ میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تم سب کو جمع کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ استقبالِ قبلہ کا تعلق عبادت کی ایک ظاہری صورت سے ہے نہ کہ اس کی روح سے۔ اس کی روح نیکی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش ہو نہ کہ سمتِ قبلہ کو بنیاد بنا کر باہم جھگڑا کرنا اور اس کو عبادت اور نیکی خیال کرنا، جیسا کہ ماضی میں ظاہر پرست یہودیوں کا طرزِ عمل رہا ہے۔

Marfat.com

ترتیل

ترتیل کا مطلب آیتوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور ہر لفظ کو اس کے صحیح مخرج اور درست تلفظ کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (سورہ مزمل: ٤)

''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

نبی ﷺ کی تلاوتِ قرآن ترتیل کا بہترین نمونہ تھی۔ حضرت انسؓ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپؐ کس طرح قرأت کرتے تھے تو انھوں نے کہا آپؐ ہر لفظ کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ (۱) حضرت ام سلمیٰؓ بیان کرتی ہیں کہ: نبی ﷺ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہرتے تھے۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ کر ٹھہر جاتے پھر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پر وقفہ کرتے اور اس کے بعد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتے۔ (۲)

ترتیل سے جہاں قرآن مجید کی عظمت اور اس کا ادب ظاہر ہوتا ہے وہاں اس سے آیات کے معنی و مفہوم کا سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ ترتیل کا عدم لحاظ سوءِ ادب اور قرآن سے بے تعلقی کی دلیل ہے۔

تعدیلِ ارکان

تعدیل کا مفہوم یہ ہے کہ قیام، رکوع اور سجدے کو کامل اطمینان و سکون کے ساتھ ادا کیا جائے۔ نماز خدا سے مناجات ہے اس لیے اس میں عجلت، بے اطمینانی اور اکتاہٹ کا مظاہرہ مناسب نہیں ہے۔ یہ باتیں آدابِ مناجات کے خلاف ہیں۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں:

''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو پہلے اچھی طرح وضو کرو پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر کہو۔ پھر جو کچھ آسانی کے ساتھ قرآن میں سے پڑھ سکتے ہو اس کو پڑھو۔ پھر رکوع کرو یہاں تک کہ تم کو رکوع میں اطمینان حاصل ہو جائے۔ پھر اپنا سر اٹھاؤ یہاں تک کہ سیدھا کھڑے ہو جاؤ۔ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ سجدے میں اطمینان حاصل

(۱) صحیح بخاری

(۲) ترمذی، ابوداؤد

Marfat.com

ہو جائے۔ پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ پھر پورے اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ اسی طرح تمام نماز میں عمل کرو۔"(۱)

ترمذی کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ "پس جب تم نے اس طرح کر لیا تو تیری نماز پوری ہوگئی اور اگر تم نے اس میں سے کچھ کم کیا تو تم نے اپنی نماز میں سے کم کیا۔"(۲) ایک اور روایت میں آپؐ کا ارشاد ہے: "وہ نماز ناقص ہے جس میں نماز پڑھنے والے نے رکوع اور سجدے میں اپنی پیٹھ سیدھی نہ کی۔"(۳) عدمِ تعدیل کو نبی ﷺ نے چوری کرنے سے تعبیر فرمایا ہے:

"چوریوں میں بدترین چوری نماز کی چوری ہے۔ پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول کوئی نماز کی چوری کیسے کرتا ہے؟ فرمایا: رکوع اور سجدے پورے طور پر ادا نہ کرے۔"(۴)

حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ رکوع اور سجدے جلدی جلدی کر رہا ہے۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو آپ نے فرمایا:

"تم نے نماز نہیں پڑھی اور اگر تم اسی حالت میں مر گئے تو تمہاری موت اس ملت پر نہ ہوگی جسے اللہ نے محمد (ﷺ) کو عطا کی ہے۔"(۵)

ایک بار مسجد نبوی میں ایک شخص داخل ہوا اور جلدی جلدی نماز پڑھ کر آپ ﷺ کی مجلس میں آ بیٹھا۔ آپ نے فرمایا "تم جا کر پھر سے نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی ہے۔ اس نے دوبارہ نماز ادا کی۔ آپؐ نے فرمایا، اب بھی ادا نہیں ہوئی پھر سے پڑھو۔ اور جب تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے کہا: اے اللہ کے رسول، کس طرح پڑھوں؟ آپؐ نے فرمایا "اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرأت کرو، اطمینان و سکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو۔"(۶)

---

(۱) ابوداؤد، بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ (الامور التی لابد منہا فی الصلوٰۃ) ج ۲، ص ۱۱

(۲) ترمذی

(۳) ترمذی، ابواب الصلوٰۃ

(۴) مشکوٰۃ، ص ۸۳

(۵) صحیح بخاری

(۶) بخاری و مسلم، ابوداؤد (کتاب الصلوٰۃ)

Marfat.com

نبی ﷺ کے ان ارشادات سے واضح ہو گیا کہ نماز میں تعدیلِ ارکان کا عدمِ لحاظ اس بات کا ثبوت ہے کہ نمازی کا دل نماز سے غافل ہے اور محض دکھانے کے لیے نماز پڑھی گئی ہے۔

داخلی شرائط

نماز کے داخلی آداب وشرائط میں قنوت، اخلاص، فہم قرآن اور خشوع جیسے امور اہمیت رکھتے ہیں۔ نماز کے مذکورہ خارجی آداب وشرائط کا اہتمام اسی وقت با معنی اور موثر بنتا ہے جب اس کے داخلی آداب کو ملحوظ رکھا جائے اور پورے خلوص کے ساتھ ان کو برتا جائے۔ نماز کے داخلی آداب ولوازم کی تفصیل درج ذیل ہے۔

قنوت

قنوت کا مفہوم یہ ہے کہ نمازی اس طرح نماز میں کھڑا ہو جیسے ایک غلام اپنے آقا کے سامنے نہایت ادب اور غایت درجہ عاجزی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (سورہ بقرہ: ۲۳۸)

''اور خدا کے سامنے نیاز مندانہ کھڑے رہو۔''

نماز پڑھتے وقت ادھر ادھر دیکھنا، ہنسنا، کسی سے بات کرنا، کپڑے اور جسم کے کسی حصے سے کھیلنا، سامنے تھوکنا وغیرہ افعال قنوت کے خلاف ہیں۔ دراصل بندہ حالت نماز میں خدا سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے۔ (۱) اس لیے اس قسم کے افعال آدابِ مناجات کے منافی اور خدا کے حضور میں بے ادبی قرار پائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''نماز میں ادھر اُدھر نہ دیکھا کرو، کیا تمھیں یہ خوف نہیں کہ تمہاری نظر پھر واپس نہ آسکے۔'' (۲) اسی طرح آپ نے ایک بار صحابہ سے کہا: ''نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے مصروفِ کلام ہوتا ہے۔'' (۳)

---

(۱) بخاری کے الفاظ ہیں: ان احدکم اذا صلی یناجی ربہ، دیکھیں، ج ا، باب: المصلی یناجی ربہ

(۲) مسند احمد

(۳) بخاری ومسلم، کتاب الصلوٰۃ والمساجد

Marfat.com

اخلاص

اخلاص کے لفظی معنی کسی چیز کو دوسری چیز سے چھانٹ کر الگ کر دینے کے ہیں۔ نماز میں اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ صرف خدا کی یاد اور اس کی محبت کے جذبے سے نماز پڑھی جائے، ریا اور نمود و نمائش کا اس میں شمہ برابر بھی دخل نہ ہو۔ دکھاوے کی نماز پڑھنے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ٥ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآؤُنَ ٥ (سورہ ماعون)

”خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے جو نماز (کی حقیقت) سے غافل ہیں اور لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔“

سورہ کہف کی آیت (۱۱۰): وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا ”اور وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔“ کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد نمود و نمائش سے اجتناب ہے:

قال الماوردی وقال جمیع اهل التاویل، معنی قوله تعالیٰ (وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا) انه لایرائ بعمله احدا[1]

”ماوردی اور دوسرے اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت (ولا یشرک بعبادة ربہ احدا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کو دکھانے کے لیے عمل نہ کرے یعنی اس کے اندر ریا کا جذبہ نہ ہو۔“

اس کے علاوہ حاجات و بلایا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو پکارنا بھی اخلاصِ عبادت کے منافی ہے اور اس کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَّلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ

---

(۱) الجامع لاحکام القرآن، ج ۱۱، ص ۷۰

Marfat.com

فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ○ (سورہ یونس:۱۰۵،۱۰۶)

''اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت کی طرف کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ اور اللہ کے سوا دوسروں کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچائیں نہ نقصان۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بلاشبہ ظالموں (مشرکوں) میں شمار کیے جاؤ گے۔''

تبتّل

تبتّل کے لفظی معنی منقطع ہونے کے ہیں، یعنی ہر طرف سے توجہ ہٹا کر خدا کی طرف متوجہ ہونا۔ نماز دراصل خدا کی یاد ہے۔ اس یاد کا تقاضا ہے کہ کسی دوسری چیز کی یاد سے ذہن و دل بالکل خالی ہوں۔ فرمایا گیا ہے:

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا○ (سورہ مزمل:۸)

''اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور سب سے کٹ کر اسی کی طرف ہو جاؤ۔''

ایک حدیث میں تبتّل کے مفہوم کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

''جو شخص وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہوا پھر اس نے خدا کی حمد و ستائش اور اس کی تعظیم و تکریم کی، جس کا وہ مستحق ہے، اور اپنے قلب کو صرف اللہ کے لیے فارغ کر لیا (یعنی اس کے سوا ہر چیز کو دل سے نکال دیا) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے گویا اس کی ماں نے اسے ابھی جنا ہو۔'' (۱)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

''جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے، اور نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھو کیونکہ حالت نماز میں تم خدا سے باتیں کر رہے ہوتے ہو۔'' (۲)

قرآن مجید میں ایک لفظ ''حنفاء'' (حنیف کی جمع) استعمال ہوا ہے، جس سے تبتّل کا مفہوم مزید واضح ہو جاتا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ وَیُقِیْمُوْا

---

(۱) صحیح مسلم، باب الاوقات

(۲) طبرانی، فی الاوسط عن ابی ہریرہؓ

Marfat.com

الصّلٰوۃَ الخ (سورہ بینۃ:۵)

''ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اطاعت کو اسی کے لیے خاص کرتے ہوئے بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں۔''

حنیف، حنف سے ہے۔ جس کے معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ اصطلاحاً حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے منہ موڑ کر ذہن وقلب کی پوری یکسوئی کے ساتھ خدا سے وابستہ ہو گیا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کو حنیف کا لقب اسی لیے عطا ہوا کہ آپ ساری دنیا سے کٹ کر صرف خدا کے ہو رہے تھے۔ (۱)

فہمِ قرآن

نماز میں پڑھی جانے والی آیات کو سمجھ کر پڑھنا آداب نماز میں داخل ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''لوگو! تم میں سے ہر شخص خدا سے مناجات کر رہا ہوتا ہے تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل نہ ڈالو۔'' (۲)

ظاہر ہے کہ جو مناجات بے خبری کی حالت میں ہوگی، یعنی مناجات کرنے والا یہ نہ جانتا ہو کہ وہ زبان سے کیا کہہ رہا ہے تو لازماً اس کا کوئی اثر اس کے دل پر نہ ہوگا اور یہ محض طوطے کی طرح کچھ متعین الفاظ کو زبان سے دہرا دینے کا ایک عمل قرار پائے گا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ ؀

(سورہ نساء:۴۳)

''نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب بھی نہ جاؤ یہاں تک کہ (حالت نشہ سے باہر آجاؤ اور) تم زبان سے جو کچھ کہتے ہو اس کو جانتے اور سمجھتے بھی ہو۔''

اسلام کے ابتدائی ایام میں جب ابھی شراب ممنوع نہیں ہوئی تھی، مسلمان حالتِ نشہ میں بھی نماز پڑھ لیتے تھے لیکن آگے چل کر جب حرمتِ شراب کا حکم آگیا تو مسلمانوں سے

---

(۱) دیکھیں، بقرہ:۱۳۵، ال عمران:۶۷، النساء:۱۲۵، الانعام:۷۹، نحل:۱۲۰، الروم:۳۰

(۲) ابوداؤد، صلوٰۃ النبی

Marfat.com

کہا گیا کہ وہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھیں کیونکہ اس حالت میں فہم قرآن تو کجا الٹا یہ خطرہ تھا کہ وہ قرآن کو غلط طور سے پڑھ دیں یا قرآن کے علاوہ کوئی اور بات ان کی زبان سے نکل جائے۔

ایک شراب ہی پر موقوف نہیں، ہر اس حالت میں نماز ممنوع ہے جس سے فہم قرآن میں رکاوٹ پیدا ہو۔ چنانچہ نیند کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ نبی علیہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب نمازی پر نیند کا غلبہ ہو تو اسے سو جانا چاہیے تا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اسے سمجھے۔'' (۱)

خشوع

خشوع کے لفظی معنی جھکنے اور پست ہو جانے کے ہیں۔ نماز میں خشوع کا مفہوم یہ ہے کہ نمازی کا بدن جھکا ہوا ہو، اس کی آنکھیں نیچی ہوں اور اس کے چہرے سے عاجزی وفروتنی ظاہر ہو۔ لیکن حقیقی خشوع وہ ہے جس میں بدن اور اعضائے بدن کے جھکاؤ کے ساتھ نمازی کا دل بھی خاشع ہو۔ دل کے جھکنے سے مراد یہ ہے کہ نمازی کو صحیح معنی میں یہ احساس ہو کہ خدا نہایت عظیم وجلیل اور بے پناہ طاقت وقوت کا مالک ہے اور وہ اس کے مقابلے میں ایک بالکل پست وحقیر وجود ہے، اور وہی ایک خدا اس کا حقیقی ملجا وماویٰ ہے۔ ایک حدیث میں خشوع کی حقیقت اس طرح بیان کی گئی ہے:

> ''نماز دو دو رکعت کر کے ہے اور ہر دو رکعت میں تشہد ہے، تضرع وزاری ہے، خشوع وخضوع ہے، عاجزی ومسکنت ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر یارب، یارب کہنا ہے۔ جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص رہی۔'' (۲)

قرآن مجید میں ان ہی مومنین کو کامیابی کا مژدہ سنایا گیا ہے جو اپنی نماز میں خشوع کا اہتمام کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝

(سورہ مومنون: ۲)

(۱) بخاری، ابوداؤد، عن انسؓ

(۲) ابوداؤد

Marfat.com

''وہ مومن کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

اس آیت میں جس خشوع کو کامیابی کا ضامن بتایا گیا ہے وہ خشوعِ قلب ہے۔ اگر دل میں خشوع ہے تو لازماً جسم کے اعضاء و جوارح میں بھی خشوع کی کیفیت پائی جائے گی۔ اور اگر قلب خشوع سے خالی ہے تو اعضاء سے خشوع کا سچا اظہار ممکن نہ ہوگا۔ عہد نبوی میں ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا اور نماز ہی میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا۔ آپؐ نے دیکھا تو فرمایا: لو خشع قلبه لخشعت جوارحه (۱) ''اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اعضاء میں بھی خشوع پایا جاتا۔''

نبی ﷺ کے مختلف تعوذات میں ایک تعوذ یہ بھی ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ الخ

''اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس قلب سے جس میں خشوع نہ ہو۔''

بہت سے نمازی ارکانِ نماز جلدی جلدی ادا کرتے ہیں اور اس کی وجہ دل میں خشوع کا نہ ہونا ہے۔ ایسے ہی نمازیوں کے متعلق نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

''سب سے برا آدمی وہ ہے جو اپنی نماز چرالیتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ اپنی نماز کیسے چرالیتا ہے؟ فرمایا: نہ رکوع ٹھیک سے ادا کرتا ہے اور نہ سجدہ۔'' (۲)

حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ: ''میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ آدمی نماز سے فارغ بھی ہو جاتا ہے اور اس کو اس کی نماز کا صرف دسواں حصہ نصیب ہوتا ہے اور بعض اوقات نواں، آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، چوتھائی، تہائی اور نصف۔'' (۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''بہت سے کھڑے ہونے والے ایسے ہیں جن کو ان کی نماز سے رنج و مشقت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' (۴)

یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کے دل خشوع سے خالی ہوتے ہیں۔ بہت سے نمازی

---

(۱) ابوداؤد

(۲) مسلم

(۳) ابوداؤد، نسائی

(۴) نسائی، ابن ماجہ

Marfat.com

ظاہر بدن میں خشوع پیدا کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں خشوع نہیں ہوتا اور یہ خشوعِ نفاق ہے یعنی دکھاوے کا خشوع۔ صحابہ نے نبی ﷺ سے خشوعِ نفاق کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: خشوع البدن و نفاق القلب ''بدن تو جھکا ہوا ہو لیکن دل میں نفاق ہو یعنی اس میں جھکاؤ نہ ہو۔'' حضرت عمر فاروقؓ کسی کو گردن جھکا کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے تو گردن کو اونچی کر دیتے اور فرماتے: لیس الخشوع فی الرکاب انما الخشوع فی القلب ''خشوع گردن میں نہیں، قلب میں ہوتا ہے۔''

احادیث و سیر کی کتابوں میں نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کی نمازوں کا ذکر ملتا ہے جو خشوع کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ اس سلسلے میں ایک دو واقعات یہاں لکھے جاتے ہیں۔

رسولؐ کا خشوع

رسول اللہ ﷺ کی نماز خشوع و خضوع سے لبریز ہوتی تھی۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضورؐ کو دیکھا کہ آپ نماز میں ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے۔ (۱)

آپ ﷺ نماز میں خشوع کا اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ اگر کبھی کوئی چیز ادنیٰ درجے میں بھی مانعِ خشوع بنی تو اس سے فوراً قطعِ تعلق کر لیا۔ ایک بار ابوجہمؓ ایک سیاہ چادر، جس کے دو پلے تھے، آپ کی خدمت میں لائے۔ آپ نے اس کو اوڑھ کر نماز ادا کی لیکن نماز کے بعد اس کو اتار دیا اور فرمایا کہ اس کو ابوجہم کے پاس لے جاؤ کہ اس نے مجھ کو میری نماز سے غافل کر دیا اور اس کی جگہ سادی چادر لا دو۔ (۲)

صحابہ کا خشوع

صحابہ رضی اللہ عنھم کی نمازوں میں بھی بدرجۂ اتم خشوع پایا جاتا تھا۔ ایک بار حضرت ابوطلحہؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ دوران نماز میں ایک پرندہ درخت سے اڑ کر اوپر کی طرف جانے لگا۔ ان کو یہ پرندہ اچھا معلوم ہوا، گھڑی بھر تک اسے دیکھتے رہے اور یہ یاد

---

(۱) ترمذی، ابوداؤد

(۲) بخاری و مسلم

Marfat.com

نہ رہا کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ نماز کے بعد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں آج اس فتنے میں مبتلا ہو گیا تھا، اب یہ باغ صدقہ ہے اور آپ کے حوالے ہے۔" (۱)

حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار صبح کی نماز میں ان پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ میں نے تیسری صف کے بعد ان کے رونے کی آواز سنی۔ (۲) علقمہ بن وقاصؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ عشاء کی نماز میں سورہ یوسف پڑھ رہے تھے اور میں آخری صف میں تھا۔ جب یوسف علیہ السلام کا ذکر آیا تو میں نے ان کے رونے کی آواز سنی۔ (۳)

حضرت علیؓ کا حال یہ تھا کہ جب نماز کا وقت آتا تو آپ کانپتے اور چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ ان سے لوگ پوچھتے کہ یا امیر المومنین یہ آپ کا کیا حال ہے؟ فرماتے کہ اس امانت کا وقت آ گیا ہے جس کو اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیش کیا اور اس کے اٹھانے سے سب نے انکار کر دیا اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ (۴)

خصوصیاتِ صلوٰۃ

ہر نمازی کے لیے ضروری ہے کہ وہ برابر یہ دیکھتا رہے کہ اس کی نماز مذکورہ بالا اقامتِ صلوٰۃ کے شرائط کو پورا کر رہی ہے یا نہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں میں نماز کی بعض خصوصیات کا ذکر ہوا ہے جن کو ہم نماز کے صحیح اور غلط ہونے کی کسوٹی قرار دے سکتے ہیں۔ ان میں سے چند اہم خصوصیات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

نماز کی سب سے پہلی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نمازی کو برے کاموں سے روکتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کے نفس کا تزکیہ کرتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: بتاؤ، اگر کسی کے دروازے پر نہر بہتی ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ بار نہائے تو کیا (اس کے بدن پر) کچھ میل کچیل باقی رہے گی۔ صحابہ نے عرض کیا، اے

---

(۱) مالک نے عبداللہ بن ابی بکرؓ سے روایت کیا ہے

(۲) بخاری

(۳) ایضاً

(۴) امام غزالی، احیاء العلوم، ج ۱، ص ۱۶۶

Marfat.com

اللہ کے رسول کچھ بھی میل کچیل باقی نہیں رہے گی۔آپ نے فرمایا، یہی معاملہ پانچ اوقات کی نمازوں کا ہے، اللہ ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔(۱)

یہ حدیث دراصل قرآن مجید کی درج ذیل آیت کی تفسیر ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (سورہ عنکبوت:٥٦)

''بے شک نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (سورہ هود:١١٤،١١٥)

''اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔اور ثابت قدم رہو، بالیقین اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔''

اس آیت میں نماز کے لیے ''حسنۃ'' کے بجائے ''حسنات'' صیغۂ جمع استعمال کیا گیا ہے۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نماز محض ایک نیکی نہیں بلکہ نیکیوں کا خزانہ ہے۔ہم جتنی نیکیوں کا تصور کر سکتے ہیں وہ سب اس ایک عابدانہ عمل میں پوشیدہ ہیں۔یہ ممکن ہی نہیں کہ بندے کی طرف سے یہ عابدانہ عمل واقع ہو اور اس سے نیکیوں کا صدور نہ ہو۔اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک مسلمان نماز پڑھتا ہو اور اس کی برائیاں اس سے دور نہ ہوتی ہوں۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جاڑے کے دنوں میں جب کہ موسم خزاں تھا، باہر تشریف لے گئے۔آپؐ نے درخت کی دو شاخیں پکڑ لیں اور پتے کثرت سے گرنے لگے۔آپؐ نے فرمایا، اے ابوذر! جب کوئی مسلمان محض خدا کی رضا کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس سے اس کے گناہ اسی طرح جھڑتے ہیں جس طرح اس درخت کے پتے گر رہے ہیں (۲)۔

---

(۱) بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ

(۲) مسند احمد، دیکھیں، مشکوٰۃ، ج ا، ص ۵۸

Marfat.com

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو پھر وہ نماز، نماز نہیں، کچھ اور ہے، عمران بن حصینؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر فلاصلوٰة له (۱)

''جس شخص کی نماز نے اسے فحش اور برے کاموں سے نہ روکا اس کی نماز، نماز نہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر لم يزد بها من الله الا بعدا(۲)

''جس کی نماز نے اس کو فحش اور منکر سے نہ روکا اس کی نماز نے اسے اللہ سے اور زیادہ دور کردیا۔''

نماز کی دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ وہ نمازی میں صبر اور ثابت قدمی پیدا کرتی ہے۔ نماز کی اس خصوصیت کا ذکر بعض صورتوں میں آیا ہے: مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًاo اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا o وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًاo اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ o (سورہ معارج:۱۹۔۲۱)

''انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے اور جب اس کو مال و دولت حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے، صرف نمازی اس (عیب) سے مستثنیٰ ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا الخ (سورہ طه: ۱۳۰)

''جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو، آفتاب کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے۔'' الخ

---

(۱) ابن ابی حاتم

(۲) ابن ابی حاتم، طبرانی

Marfat.com

نماز کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی گئی ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ ○ (سورہ بقرہ:۱۵۳)

''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

معلوم ہوا کہ صبر اور صلوٰۃ میں نہایت گہرا رشتہ ہے۔ ایک سچے نمازی سے کسی حال میں بھی بے صبری اور گھبراہٹ کا اظہار نہ ہوگا خواہ حالات کتنے ہی نا مساعد اور صبر آزما ہوں۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی نماز ناقص ہے اور وہ حقیقتِ نماز سے بالکل غافل ہے۔

نماز کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دل کو حبِ مال سے پاک کرتی ہے اور نمازی کو ایثار اور فیاضی سکھاتی ہے۔ ہم نے اوپر سورہ معارج کی جو آیت نقل کی ہے اس میں کہا گیا ہے: اذا مسّه الخير منوعا الا المصلين۔ معلوم ہوا کہ نماز کے ساتھ بخل کا اجتماع محال ہے۔ انفاقِ مال کی مقدار تو کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن اس کا سرے سے نہ ہونا ممکن نہیں ہے۔

نماز کی متذکرہ خصوصیات کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آج ہم مسلمانوں کی نمازیں ان خصوصیات سے یکسر خالی ہیں، اخلاق و اعمالِ حسنہ، صبر و استقامت اور حبِ مال سے بے نیازی کی ادنیٰ جھلک بھی نمازیوں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ وجہ بالکل واضح ہے کہ ہماری نمازیں وہ نہیں جن کے قیام کا حکم خدا کی کتاب میں دیا گیا ہے۔

تعلیماتِ صلوٰۃ

نماز کے ظاہر و باطن پر ایک نظر ڈالیں تو صاف محسوس ہوگا کہ تزکیۂ باطن کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اس ربط و تعلق کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا اور اکثر لوگ تو اس سے بالکل بے خبر ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ نماز ان کو کن باتوں کی تعلیم دیتی ہے اور ان کے قلب میں کس طرح کے جذبات و احساسات اور ان کے دماغ میں کس نوع کے افکار و خیالات پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اسی غفلت شعاری

Marfat.com

اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے میں نے ضروری سمجھا کہ نماز کی تعلیمات کو یہاں قدرے تفصیل سے بیان کروں۔ ان تعلیمات میں سے بعض کا تعلق نماز کی خارجی صورت اور بعض کا اس کے داخلی پہلو سے ہے۔

نماز جن خارجی اجزاء پر مشتمل ہے ان میں اذان، وضو، صف بندی اور امامت زیادہ اہم ہیں۔ ان امور کا مقصود روحانی بنیاد پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تہذیب و تعمیر ہے جیسا کہ اگلی سطروں سے معلوم ہوگا۔

اذان

دوسرے مذاہب میں پرستش کے اوقات میں بالعموم ناقوس بجایا جاتا ہے تاکہ عبادت کرنے والے ایک متعین مقام پر جمع ہوسکیں۔ اس مقصد کے لیے اسلام میں جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ سب طریقوں سے زیادہ مؤثر اور معنی خیز ہے۔ اس طریقے کو اصطلاحاً اذان کہا جاتا ہے، جس کے معنی پکارنے کے ہیں۔

اذان کے الفاظ میں بلا مبالغہ اسلام کی روح جلوہ گر ہے۔ یہ دراصل توحید کا اظہار واعلان ہے۔ مؤذن سب سے پہلے ''اللہ اکبر'' کہتا ہے اور یہ کہہ کر وہ نہ صرف اپنی بڑائی سے دست برداری کا اعلان کرتا ہے بلکہ تمام صاحبانِ اقتدار کی طاقت و بڑائی کی نفی کرتا ہے اور بتکرار اعلان کرتا ہے کہ حقیقی معنی میں کبریائی اور عظمت و بزرگی کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والاصفات ہے۔ اس کے علاوہ اس عالمِ رنگ و بو میں جو شے اور جو مخلوق بھی ہے اس کی پیشانی بندگی کے لیے بنائی گئی ہے۔

خدا کی بڑائی کے اعلان کے بعد مؤذن ''اشھد ان لا الٰہ الا اللہ'' کہہ کر یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ جب اس کائنات میں خدا ہی سب سے بڑی قوت ہے تو پھر لازماً اسی کو انسانوں کا معبود ہونا چاہیے۔ یہ کلمہ تمام معبودانِ باطل کی معبودیت کی نفی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا وجود ایسا نہیں جس کے سامنے انسان اپنی جبینِ نیاز جھکائے کہ ہر وجود مخلوق اور عاجز و بے نوا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے قیام و بقا کے لیے بھی خدا کا محتاج ہے۔

Marfat.com

خدا کی عظمت و معبودیت کی گواہی دینے کے بعد مؤذن اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ معلوم ہے کہ اسلام کی بنیاد توحید اور رسالت کی گواہی پر ہے۔ شہادتین کو اذان کا جز بنا کر اور شب و روز کے پانچ مقررہ اوقات میں ان کو مسجد کے میناروں سے نشر کر کے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اسلام کی بنیاد انہی دو کلمات کی سچی گواہی پر ہے۔

رسالت کو جزوِ اذان بنانے میں ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ گذشتہ قوموں نے اپنے پیغمبروں کی عظمت و بزرگی کے سلسلے میں بڑے غلط خیالات قائم کر لیے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی ایک معنی میں معبود ٹھہرائے گئے۔ ہندوؤں نے رام اور کرشن اور بدھ مذہب کے ماننے والوں نے گوتم بدھ کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صاف لفظوں میں رب (Lord) قرار دیا۔ اسی خطرے کے سدِ باب کے لیے ایک خدا کی معبودیت کے اعلان کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی حیثیت بھی متعین کر دی گئی ہے کہ وہ صرف خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں، وہ کسی معنی میں خدائی اوصاف و اختیارات کے مالک نہیں ہیں۔ بندہ (غلام) کا لفظ خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی رسول خدائی اوصاف و اختیارات کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچا دے اور اس کے مطابق عمل کر کے دکھا دے۔ (۱)

اسلام کے ان دو بنیادی اصولوں کے اعلان کے بعد مؤذن ان تمام لوگوں کو، جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی بلا شرکتِ غیرے معبودیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت و رسالت کا اقرار کر چکے ہیں، مسجد میں آنے کی دعوت دیتا ہے اور ان کو آگاہ کرتا ہے کہ اصلی

---

(۱) مقام عبرت ہے کہ اذان کے ذریعہ شہادتین (اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ) کے مکرر اعلان اور دوران نماز میں ان دو کلمات کے اظہار و اقرار کے باوجود مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اپنے رسول کو خدائی اوصاف و اختیارات کا مالک بنا دیا اور پھر اس کا سلسلہ بزرگان دین تک جا پہنچا۔ اسی قوم میں وہ بدبخت شاعر پیدا ہوا جس نے یہ کفریہ شعر کہا:

وہی جو مستویِ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفٰے ہو کر

Marfat.com

کامیابی نماز یعنی خدا سے جڑنے میں ہے (حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح)۔ جو لوگ مؤذن کی یہ صدا سن کر مسجد میں آتے ہیں وہ گویا اس بات کا عملی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ شہادتین کے زبانی اقرار میں وہ سچے ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ اذان سن کر مسجد میں نہیں آتے وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ شہادتین پر ان کا ایمان محض زبانی ہے اور ابھی تک ان کے قلب و دماغ میں خدا کی معبودیت اور اس کے رسول کی رسالت کا یقین صحیح معنی میں گھر نہیں کر سکا ہے اور انھوں نے دنیا کی کامیابی ہی کو اپنا مطمحِ نظر اور مقصودِ زندگی بنالیا ہے۔

نماز اور کامیابی کی طرف دعوت دینے کے بعد مؤذن ایک بار پھر خدا کی بڑائی کا اعلان یعنی ''اللہ اکبر'' کہہ کر اذان ختم کرتا ہے۔ دیکھیں، اذان کا آغاز بھی خدا کی بڑائی کے اظہار سے ہوا اور اس کا اختتام بھی اسی بات پر ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز دراصل خدا کی عظمت و بزرگی کا اقرار و اعلان اور غیرِ خدا کی بڑائی کی نفی ہے۔

وضو

اذان کی آواز سنتے ہی ایک مومن فوراً کاروبارِ دنیا سے الگ ہو کر مسجد کا رخ کرتا ہے اور سب سے پہلے وضو کرتا ہے۔ وضو کی حقیقت پر ہم اس سے پہلے تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ وضو پاکی اور طہارت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ظاہری اعضاء کی طہارت سے مقصود دراصل قلب و نفس کی طہارت ہے۔ دن میں پانچ بار مختلف اعضاء کا دھونا اپنے اندر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ ایک مسلمان کا نہ صرف جسم پاک و صاف ہوگا بلکہ ضروری ہے کہ اس کا نفس بھی طاہر ہو۔

لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے وضو کو محض خارجی طہارت کا ایک رسمی عمل سمجھ لیا ہے، قلب و نفس کی صفائی کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وضو میں غیر معمولی اہتمام کے باوجود ان کے قلب و نفس کی گندگی دور نہیں ہوتی۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ طہارت نصف ایمان ہے۔ اس لیے ایمان کے ساتھ گندگی کا اجتماع، خواہ وہ گندگی جسم اور کپڑوں کی ہو یا قلب و نفس کی، ممکن نہیں ہے۔

Marfat.com

صف بندی

اذان اور وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر تمام نمازی ایک صف میں قدم سے قدم اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صف بندی کے اس عمل میں کسی طرح کا فرق وامتیاز روا نہیں ہے۔ ہر مسلمان کو، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، عالم ہو یا جاہل، حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا کم تر خاندان سے، ایک ہی صف میں کھڑا ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگر ایک غریب آدمی مسجد میں پہلے پہنچتا ہے تو اس کی جگہ اگلی صف میں ہے اور اگر ایک حاکم بھی تاخیر سے پہنچتا ہے تو اس کو پچھلی صف ہی میں کھڑا ہونا ہے۔ صف بندی کا یہ عمل صاف بتاتا ہے کہ اسلام میں ہر کلمہ گو یکساں عزت واحترام کا حق دار ہے۔

اس کے علاوہ اس عمل میں یہ تعلیم بھی شامل ہے کہ جس طرح اہل ایمان مسجد میں ایک جماعت کی صورت میں منظم اور صف بستہ ہوتے ہیں اسی طرح مسجد سے باہر بھی وہ منظم اور متحد ہو کر ایک امام کی قیادت میں زندگی گزاریں اور ہر طرح کے اختلاف وانتشار سے پرہیز کریں۔ (۱) ان کی صفوں میں کہیں کوئی معمولی دراڑ بھی نہ ہو۔ (۲) جس طرح وہ مسجد میں کسی فرق وامتیاز کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اسی طرح مسجد سے باہر کی زندگی میں بھی ان کے درمیان کسی نوع کا بھید بھاؤ نہ ہو (۳)۔ ہر نمازی دوسرے نمازی کو اپنا بھائی سمجھے (۴)، خواہ دولت، علم اور رتبہ کے اعتبار سے ان میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ (۵)

---

(۱) نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ: ''رسول اللہ ہماری صفوں کو تیر کی طرح سیدھی کرتے تھے۔ ایک دن آپ تکبیر کہنے کے قریب تھے کہ ایک شخص کو سب سے آگے نکلا ہوا دیکھا تو فرمایا: خدا کے بندو! اپنی صفیں ٹھیک کرو یا پھر اللہ تمہارے درمیان پھوٹ ڈال دے گا۔'' (صحیح مسلم)

(۲) ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے ''جب تک تم لوگ مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے (بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب: تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ)

(۳) ارشاد رسولؐ ہے: لا فضل لعربی علی عجمی الا بالتقویٰ ''کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر یہ کہ وہ تقویٰ میں بڑھا ہو۔''

(۴) قرآن میں فرمایا گیا ہے: انما المومنون اخوۃ (سورہ حجرات: ۱۰) ''بے شک مومن آپس میں بھائی ہیں۔''

(۵) صحیح مسلم عن انس بن مالکؓ

Marfat.com

امامت

صف بندی کا عمل مکمل ہونے کے بعد ایک امام کی اقتدا میں نماز باجماعت شروع ہوتی ہے۔ ہر مقتدی کے لیے لازمی ہے کہ وہ امام کے ایک ایک عمل کی مکمل پیروی کرے۔ ایک حدیث میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: (۱) ''امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔'' جو شخص دوران نماز میں امام کی اتباع میں کسی قسم کی کوتاہی کرتا ہے، مثلاً امام سے پہلے سجدہ میں چلا جائے، تو ایسے شخص کے بارے میں ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''اللہ اس پر قادر ہے کہ اس کے سر کو گدھے کا سر بنادے۔'' (۲) لیکن امام کی اتباع کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو بھی اس کی پیروی کی جائے۔ اس سلسلے میں ہدایت دی گئی ہے کہ اگر دوران نماز میں امام سے کوئی غلطی ہو جائے، مثلاً اس کو دو رکعت کے بعد بیٹھنا تھا لیکن کھڑا ہو گیا، تو مقتدیوں کا فرض ہے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہہ کر اس غلطی پر اس کو متنبہ کریں۔

سبحان اللہ کا فقرہ بڑا حکیمانہ فقرہ ہے۔ انسان کی نفسیات میں یہ بات داخل ہے کہ اگر اس کو کسی غلطی پر برسر عام ٹوک دیا جائے تو وہ بالعموم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا اور اس کی تاویل کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے سبحان اللہ کہہ کر امام کو بتایا جاتا ہے کہ اگر تم سے غلطی ہو گئی ہے تو اس میں پشیمانی کی کوئی بات نہیں کہ غلطی انسان سے ہو جاتی ہے۔ غلطیوں سے پاک تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ سبحان اللہ کے الفاظ سنتے ہی امام کو چاہیے کہ وہ کسی پس و پیش کے بغیر اپنی غلطی تسلیم کرلے، یعنی نماز ختم کرنے سے پہلے سجدۂ سہو کرے۔

لیکن اگر امام کو یقین ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی ہے اور مقتدیوں کو سہو ہوا ہے تو وہ اپنے اس یقین کے مطابق نماز مکمل کرے۔ البتہ نماز ختم ہونے کے بعد مقتدیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ امام پر اس کی غلطی واضح کریں اور اس سے نماز دوبارہ ادا کرنے کے لیے کہیں۔ اگر امام اس مطالبے کے باوجود اپنے عمل کی صحت پر اصرار کرے تو مقتدیوں کو چاہیے کہ وہ امام کی بات مان لیں۔ لیکن اگر ان کو یقین ہے کہ امام نے ضرور غلطی کی ہے اور وہ

---

(۱) انما جعل الامام لیؤتم به، دیکھیں ابن ماجہ، ص ۶۱

(۲) بخاری، ج ۱، ص ۹۶، مسلم، ج ۱، ص ۱۸۱

Marfat.com

ہٹ دھرمی سے کام لے رہا ہے تو اس صورت میں جائز ہوگا کہ وہ امام کو بطریقِ احسن امامت کے منصب سے ہٹا دیں بشرطیکہ مقتدیوں کی اکثریت اس کے حق میں ہو۔ اس صورت میں امام پر لازم ہے کہ وہ امامت سے فوراً دست بردار ہو جائے۔ یہ تو ارکانِ نماز میں غلطی کی اصلاح کی صورت ہے۔ اگر امام اس سے بڑی غلطی کا مرتکب ہو جو صریح معصیت کے دائرے میں آتی ہو، مثلاً وہ حالتِ نشہ میں نماز پڑھادے، تو اس صورت میں نمازیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کو امامت سے معزول کر دیں اور کسی دوسرے اہل تر شخص کو امام بنائیں۔

امامت کے معاملے کو مسلمانوں نے ایک معمولی معاملہ سمجھ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر کس و ناکس امام بن جاتا ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ یہ امامتِ صغریٰ ہے اور اسی پر مسلمانوں کی امامتِ کبریٰ موقوف ہے۔ امامت صغریٰ میں خرابی آجانے کی وجہ سے ہی آج امامتِ کبریٰ کا شیرازہ منتشر ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ امام کے انتخاب میں غیر معمولی حزم واحتیاط اور دوراندیشی سے کام لیا جائے۔ مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی لائق شخص کو اپنا امام بنائیں، خواہ وہ امام مسجد ہو یا امام قوم۔ اس سے انحراف قوم کے ساتھ غداری کے مترادف ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ (سورہ نساء:۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں ہی کو دو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

علماءِ تفسیر کہتے ہیں، اور یہ نظم کلام سے بھی واضح ہے، کہ آیت میں ''امانت'' سے مراد منصب اور ذمہ داری ہے۔ منصب اسی شخص کو دیا جائے جو اس کا اہل ہو اور اس کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کر سکتا ہو۔ منصب کی نوعیت کے لحاظ سے اہلیت کا معیار بھی مختلف ہوگا۔ مثلاً، اگر مسجد میں امامت کا معاملہ ہو تو اس کے مطابق اہلیت کا تعین ہوگا۔ لیکن اگر کسی دانش گاہ کا سربراہ یا کسی عدالت کا قاضی یا فوج کا کمانڈر یا ریاست کا حاکم مقرر کرنا ہے تو ان مناصب کی ضرورتوں کے لحاظ سے اہل تر شخص کو مقرر کرنا ہوگا۔ اگر آپ نے عدالت کے قاضی

Marfat.com

کو فوج کا کمانڈر اور فوج کے کمانڈر کو عدالت کا قاضی بنا دیا تو یہ اس منصب کے ساتھ صریح زیادتی ہوگی اور یہ فعل امانت میں خیانت قرار پائے گا۔ اس ضمن میں قرآن مجید کی درج ذیل آیت قابلِ توجہ ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○ (سورہ بقرہ: ۲۴۷)

''ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو حاکم (بادشاہ) مقرر کیا ہے۔ وہ (یہود) بولے کہ وہ ہم پر کیسے حاکم ہو سکتا ہے اور ہم تو اس سے کہیں زیادہ امارت کے حقدار ہیں، اور وہ بہت زیادہ مالدار بھی نہیں ہے۔ نبی نے کہا کہ اللہ نے تم پر حکومت کے لیے اسی کو چنا ہے، اور اس کو علم اور جسم میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے اقتدار عطا کرتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور بہت زیادہ علم رکھنے والا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قومی قیادت کے لیے وہی شخص موزوں ہے جو صاحبِ علم وبصیرت ہو، یعنی قومی امور کے کلّیات وجزئیات دونوں سے کماحقہٗ واقف ہو اور اس میدان میں وسیع تجربہ رکھتا ہو، اور اس کے ساتھ تندرست وتوانا اور جری وحوصلہ مند بھی ہو۔ (بسطۃ فی العلم والجسم) امام مسجد کو جن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے اس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔

امام کی اقتدا کے سلسلے میں یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے کہ یہ اقتدا صرف معروف میں ہے، منکر میں اطاعت واتباع جائز نہیں ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام سے اختلاف ہوتے ہی اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا جائے۔ اختلاف کی صورت میں ہم کو ہدایت دی گئی ہے کہ معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کیا جائے۔

Marfat.com

فرمایا گیا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيلًا ۝ (سورہ نساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی اطاعت کرو جو تم میں سے حاکم ہوں۔ پس اگر (ان حاکموں سے) کسی معاملہ میں اختلاف ونزع پیدا ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم فی الواقع اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اسی میں بھلائی ہے اور صحیح بات تک پہنچنے کے لحاظ سے بھی یہ عمدہ بات ہے۔''

خلافتِ راشدہ کی طرح موجودہ دور میں بھی ''فردوہ الی اللہ والرسول'' کا مطلب مسلمانوں کی مجلسِ شوریٰ اور اس کا امیر ہے۔ امیر ہی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی روشنی میں اصحابِ شوریٰ کے مشورہ سے ہر اس اختلاف کا تصفیہ کرے گا جو مسلمانوں کے درمیان کسی معاملے میں واقع ہوگا۔ مجلسِ شوریٰ کا فیصلہ تمام مسلمانوں کے لیے واجب الاطاعت ہے۔ اس سے روگرانی کا مطلب جماعت سے روگردانی ہوگی۔ ایک حدیث میں اس طرز عمل کو جاہلیت کی موت مرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔(۱)

اگر ایک طرف امیر کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے تو دوسری طرف امیر پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے(۲)، سخت گیری اور تشدد سے حتی الامکان پرہیز کرے، ہر شخص پر اس کی فطری استعداد اور جسمانی طاقت کے مطابق ہی کسی کام کی ذمہ داری ڈالے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمام لوگوں کے ساتھ یکساں اور عادلانہ برتاؤ

---

(۱) بخاری

(۲) نبی ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (سورہ ال عمران:۱۵۹) ''یہ اللہ کا ہی فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خو ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔''

Marfat.com

کرے، کسی طرح کا فرق وامتیاز روا نہ رکھے۔ فرمایا گیا ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔

(سورہ نساء:۵۸)

''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ (سورہ مائدہ:۸)

''انصاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔''

نماز جن داخلی اجزا پر مشتمل ہے ان میں سورہ فاتحہ،، رکوع وسجدہ اور ان میں پڑھے جانے والے تسبیحی کلمات قابل ذکر ہیں۔ نماز کے ان داخلی اجزا، بالخصوص سورہ فاتحہ، کی تعلیمات بھی اس کے خارجی اجزا کی طرح بے حد اہم ہیں۔ ان تعلیمات کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

سورہ فاتحہ

اس سورہ کا آغاز خدا کی حمد وستائش سے ہوتا ہے۔ جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ''الحمد'' میں الف لام تعریف کا اور ''للہ'' میں لام اختصاص کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعریف صرف خدا کے لیے مخصوص ہے، اس کے علاوہ اس کائنات مادی میں کوئی دوسرا وجود ایسا نہیں جو بالذات حمد وستائش کے لائق ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی مخلوق کی مطلق تعریف جائز نہیں ہے۔ اس تعریف کو ہر حال میں خدا کی تعریف کے تابع ہونا چاہیے۔ چنانچہ اگر کسی مخلوق کی تعریف کرنی ہی ہو تو یوں کہا جائے ''تعریف کے قابل خدا کی ذات ہے جس نے اپنے فلاں بندے کو غیر معمولی خوبیاں عطا کی ہیں۔ یاد رکھیں کہ جس آدمی کے پاس جو کمال اور خوبی ہے وہ خدا ہی کی عطا کی ہوئی ہے اس لیے تعریف کی اصل مستحق خدا کی بلند و برتر ذات ہے نہ کہ آدمی جو فی الواقع محتاج و بے نوا ہے۔

خدا کی حمد وستائش کے بعد آپ کہتے ہیں: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ''اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔'' ان الفاظ کے ذریعے

Marfat.com

آپ خدا سے دو باتوں کا عہد کرتے ہیں، ایک یہ کہ خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے آگے آپ کی پیشانی نہیں جھکے گی، دوسرے یہ کہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلائیں گے۔ اس زبانی اور قلبی اقرار کے بعد اگر آپ نے کسی مخلوق کے سامنے اپنا سر جھکایا اور اس کو مافوق الطبعی طور پر حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اس سے کسی طرح کی مدد مانگی تو گویا آپ نے خدا سے باندھے ہوئے عہد کو توڑ دیا۔ خدا کی خالص عبادت اور اسی سے استعانت کا عہد باندھنے کے بعد آپ سیدھی راہ (صراط مستقیم) پر چلنے کی درخواست کرتے ہیں (اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ) لیکن کن لوگوں کی سیدھی راہ؟ ان لوگوں کی سیدھی راہ جن پر اللہ نے فضل وانعام کیا ہے (انعمت علیھم) اسی کے ساتھ آپ اللہ سے اس کے غضب میں مبتلا اور گم راہ لوگوں کی راہ سے دور رہنے کی استدعا کرتے ہیں (غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَاالضَّآلِّیْنَ)۔

قرآن مجید کی تشریح کے مطابق "انعمت علیھم" سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین مراد ہیں (سورہ نساء: ۶۹) اور "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" سے یہود و نصاریٰ (سورہ مائدہ: ۶۰، ۷۷) ایک حدیث میں بھی اس کی صراحت آئی ہے۔ (۱) کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ خدا کے نیک بندوں کی سیدھی راہ کیا تھی جس پر چل کر وہ خدا کے انعام واکرام کے مستحق ٹھہرے، اور وہ کون سا راستہ تھا جس پر چل کر یہود خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے اور عیسائی سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔ اگر آپ نے فکر وعمل کی ان دو مختلف راہوں کو نہ جانا اور پہچانا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت سے آپ کو کچھ حاصل نہ ہوا اور آپ کی دعا رائگاں گئی۔ (۲)

رکوع وسجدہ

رکوع اور سجدہ کی حقیقت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دراصل نمازی کی طرف سے عجز وفروتنی کا اظہار اور خدا کی عظمت وکبریائی کا اقرار ہے۔ اگر نماز پڑھ کر بھی نمازی کے اندر

---

(۱) تفسیر طبری، ج ۱، ص ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵ مزید دیکھیں، تفسیر مظہری، ج ۱، ص ۱۰

(۲) قارئین، راقم کی کتاب ''سورہ فاتحہ، ایک تحقیقی مطالعہ'' ملاحظہ کریں۔

Marfat.com

عجز و انکسار پیدا نہ ہوا اور اس کے دل و دماغ میں خدا کی بڑائی کا نقش نہ بیٹھا تو گویا اس نے نماز پڑھی ہی نہیں اور رکوع و سجدہ کے مفہوم کو نہیں جانا۔ نماز اور غرور و استکبار، نماز اور غیر خدا کے در پر جبیں سائی ناقابلِ تصور ہے، ایمان و نماز کے ساتھ ان قبیح باتوں کا اجتماع محال ہے۔

تحیات و سلام

نماز کا اختتام تحیات و سلام پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم سب سے پہلے ہادی برحق علیہ السلام کے لیے خدا سے برکت و سلامتی کی دعا کرتے ہیں پھر اپنے لیے اور شریک نماز اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے۔ آخر میں اپنی خطاؤں اور لغزشوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ سے عفو و بخشش کی درخواست کرتے ہیں اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا نہیں جو ہماری خطاؤں کو معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔

اعمالِ قعدہ، جو اوپر مذکور ہوئے، بتاتے ہیں کہ ایک مومن کی دعا اور مناجات کا واحد مرکز خدا کی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کو پکارنا اور اس سے مناجات کرنا توحید کے منافی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا سے صرف اپنے لیے رحمت و سلامتی کی دعا مانگنا خودغرضی کی بات ہے۔ دینی اخوت کا تقاضا ہے کہ جملہ اہل ایمان کے لیے سلامتی کی دعا مانگی جائے۔ اس دعا کا آغاز نبی علیہ السلام کی ذات بابرکت سے ہو کہ آپ ہمارے ہادیِ برحق اور محسنِ اعظم ہیں۔ آپ ہی کے ذریعے ہم مسلمانوں کو دین اسلام کی دولت ملی۔

نماز کی متذکرہ بالا تعلیمات پر دوبارہ ایک نظر ڈال لیں اور پھر سوچیں کہ ہم میں سے کتنے نمازی ان تعلیمات سے باخبر ہیں اور ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نمازیوں کی اکثریت ان تعلیمات سے ناواقف ہے اور اسی ناواقفیت کی وجہ سے نماز ایک رسمی عمل بن کر رہ گئی ہے۔

موجودہ صلوٰۃ کی بے اثری

نماز کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط (سورہ عنکبوت)

''نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

Marfat.com

اب سوال یہ ہے کہ آج نماز پڑھنے کے باوجود بہت سے نمازی برے کاموں سے پرہیز کیوں نہیں کرتے؟ ان کے اخلاق اور معاملات دونوں میں نمایاں طور پر خرابیاں ملتی ہیں حتیٰ کہ ان کی ایک بڑی تعداد شرکِ جلی تک میں مبتلا ہے۔ اس کے وجوہ درج ذیل ہیں۔

حقیقتِ عبادت سے بے خبری

نماز کی بے اثری کا ایک اہم سبب حقیقتِ عبادت سے بے خبری ہے۔ اکثر لوگ عبادت کو محض پرستش اور پوجا کا ایک ظاہری عمل سمجھتے ہیں کہ چند مقررہ اوقات میں کچھ اعمال و رسومِ عبادت بجالائے جائیں۔ جس نے ایسا کرلیا وہ عبادت گزار ہے۔ رہے اعمالِ زندگی تو یہ ضروری نہیں کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق انجام پائیں بلکہ الٹا یہ سمجھا جاتا ہے کہ پرستش کے ظاہری اعمال کے ذریعہ عبادت گزار کے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا غلط تصوّرِ عبادت ہے جس میں دوسری قوموں کے ساتھ مسلمان بھی مبتلا ہوگئے ہیں۔ نماز اور پوجا اب تقریباً مترادف لفظ بن چکے ہیں۔ لیکن اسلام میں عبادت کا مفہوم، جیسا کہ کتاب کے شروع میں تفصیل سے بیان ہوا، نہایت وسیع ہے۔ ظواہرِ پرستش کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن وہ بہرحال مقصودِ عبادت نہیں ہیں۔ مولانا عبدالباری ندوی لکھتے ہیں:

> ''عبادت کے اچھا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسی چیز کی کسر نہ رہے۔ لوگ عموماً غلطی کرتے ہیں اور صرف صورت و نقل ہی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ مثلاً نماز میں قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ، قومہ وغیرہ جو فقہاء نے ضبط کردیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے ٹھیک لکھا ہے اور جو فقہ کا موضوع تھا اس کے موافق لکھا ہے۔ لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا ہے کہ عبادت سے متعلق تمام امور اسی میں منحصر ہیں۔''(۱)

ہم اس سے پہلے آپ کو بتا چکے ہیں کہ عبادت کے معنی جہاں پستی اور جھکاؤ کے ہیں، یعنی ظاہری اعضاء کا جھکاؤ، وہاں اس میں دل کا جھکاؤ یعنی خدا کی خالص اطاعت و بندگی کا مفہوم بھی داخل ہے (اطاعت مع الخضوع) بلکہ یہی اس کا حقیقی مفہوم ہے۔ عبادت کے اس

---

(۱) تجدیدِ تصوف و سلوک، ص ۲۱

Marfat.com

مفہوم کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جو نماز مطلوب ہے اس میں سچے دل سے خدا کی فرماں برداری کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (بقرہ:۲۳۸) ''اور اللہ کے آگے فرماں بردارانہ کھڑے رہو۔'' اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوسکتا کہ مسجد میں غلام کی صورت بنالی جائے اور مسجد سے باہر نکل کر خود مختاری کا مظاہرہ ہو۔ جس طرح مسجد کے اندر خدا کی غلامی مطلوب ہے اسی طرح مسجد کے باہر بھی نمازی کا رویّہ غلام جیسا ہونا ضروری ہے۔ خود لفظ صلوٰۃ کے اندر فرماں برداری کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى۔ (سورہ قیامہ:۳۱)

تقابل قرآن مجید کا ایک معروف اسلوب ہے جو لفظ و معنی دونوں کی وضاحت کے لیے بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دیکھیں کہ مذکورہ آیت میں ''صدق'' کے بالمقابل ''کذب'' اور ''صلّٰی'' کے بالمقابل ''تولّٰی'' ہے۔ تولّی کے معنی منہ پھیرنے اور سرکشی کے ہیں اس لیے لازماً تصلیہ کے مفہوم میں، جس سے ''صلّٰی'' مشتق ہے، فرماں برداری کا مفہوم بھی شامل ہوگا۔

اب اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کے باوجود تسلسل کے ساتھ خدا کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ حقیقی معنی میں نمازی نہیں ہے اور حقیقتِ عبادت سے وہ شخص بالکل ناواقف ہے۔

تصوّرِ ثواب

نماز کی بے اثری کا دوسرا بڑا سبب تصورِ ثواب ہے جس نے نماز ہی نہیں، دوسری عبادات کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کی روح و غایت، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ذکرِ خدا اور تزکیۂ نفس ہے۔ اور نماز ہی کیا، تمام عبادات کی یہی اصلی غایت ہے لیکن بدقسمتی سے مسلمان اس غایتِ نماز کو چھوڑ کر تصوّرِ ثواب پر کاربند ہیں، یعنی نماز پڑھنے سے ان کو فلاں فلاں نعمتیں حاصل ہوں گی، مثلاً جنت کے باغات و نہریں اور حور و قصور، اور دنیوی زندگی میں فارغ البالی اور ترقی وغیرہ۔ مسلمان اس بات کو نہیں جانتا کہ نماز پر ثواب کا جو وعدہ ہے وہ اس

Marfat.com

صورت میں ہے جب نماز اس طرح پڑھی جائے جس طرح اس کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی جو بنیادی غرض ہے یعنی تقویٰ وہ کسی نہ کسی درجے میں اس کو حاصل ہو۔ صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝

(سورہ مومنون: ۲)

''وہ نمازی کامیاب ہوئے جو اپنی نمازوں میں خشوع رکھتے ہیں۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ جو لوگ محض حصولِ ثواب کے لیے خشوع سے خالی نمازیں پڑھتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی محرومی ہے اور آخرت میں بھی وہ ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

عربی زبان سے ناواقفیت

نماز کی بے اثری کا تیسرا بڑا سبب عربی زبان سے ناواقفیت ہے۔ اس ناواقفیت کے عواقب کی وضاحت کے لیے ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔ اگر ایک آدمی سے، جو انگریزی زبان نہ جانتا ہو، کہا جائے: There is a snake تو اس جملے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا، نہ ہی اس کے اعضاء و جوارح پر کوئی اضطرابی کیفیت طاری ہوگی اور نہ ہی وہ کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کرے گا۔ صرف اس لیے کہ اس کو ایک ایسی زبان میں خطرے سے آگاہ کیا گیا جس سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ اسی طرح اگر کسی طالب علم سے کہا جائے: You have passed in the examination تو یہ جملہ سن کر نہ تو اس کی باچھیں کھلیں گی اور نہ ہی اس کا چہرہ جوشِ مسرت سے گلنار ہوگا۔ لیکن اگر یہی بات اس زبان میں کہی جائے جس کو وہ سمجھتا ہو تو اس کی خوشی کا عالم ہی دوسرا ہوگا۔

خوف اور خوشی کی ان دو مثالوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان کے احساسات و جذبات تک رسائی کا ایک بڑا ذریعہ زبان ہے۔ نماز میں سورہ فاتحہ کے علاوہ، جو دیباچۂ قرآن ہے، دیگر قرآنی آیتیں، کئی دعائیں اور تسبیحی فقرے پڑھے جاتے ہیں اور اس میں نمازی کا لب و لہجہ مناجاتی ہوتا ہے۔ اب اگر نمازی اپنی مناجات کے معنی و مفہوم سے ناواقف ہے تو اس میں نہ تو جذبِ دروں شامل ہوگا اور نہ ہی اخلاص، بس طوطے کی طرح

Marfat.com

عالمِ بے خبری میں الفاظ کی بے سود تکرار ہوگی اور اس کا بھی احتمال ہے کہ الٹا اس کو نقصان پہنچ جائے۔ مثلاً نماز میں ایک خدا کی عبادت اور اسی سے استعانت کا عہد ان لفظوں میں کیا جاتا ہے: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے نمازی اس عہد پر قائم نہیں رہتے۔ اس عہد شکنی کی ایک بڑی وجہ عربی زبان سے ان کی ناواقفیت ہے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ انھوں نے دوران نماز میں خدا سے کوئی عہد و پیمان باندھا تھا۔ اگر وہ آیت کا مفہوم سمجھتے تو عین ممکن تھا کہ عہد شکنی سے ڈرتے اور اس سے باز آجاتے۔

ترکِ صلوٰۃ کے نتائج

مسلمانوں میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو نماز کی حقیقت اور اس کے حقیقی اغراض و مقاصد سے بے خبر ہے اور صرف حصولِ ثواب کے لیے نمازیں پڑھ لیتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ لیکن ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتا۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ نماز، اگر وہ واقعی نماز ہے، کوئی سادہ اور معمولی عبادتی عمل نہیں ہے۔ اس کا فرد اور جماعت دونوں سے گہرا تعلق ہے، عقاید اور اخلاق و معاملات سب پر اس کے واضح اثرات پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترکِ نماز کے نتائج سے ان کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ ان نتائج کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اعتقادی نتائج

ہم اس سے پہلے مکرر لکھ چکے ہیں کہ نماز دراصل عقیدۂ توحید کا عملی اظہار ہے۔ اس لیے ترکِ نماز کا پہلا نتیجہ نہ صرف خدا سے قطعِ تعلق کی صورت میں نکلتا ہے بلکہ بسا اوقات اس سے شرک کی راہ کھلتی ہے۔ آج بہت سے مسلمان شرک میں مبتلا ہیں تو اس کی ایک اہم وجہ ان کا تارکِ نماز ہونا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے مسلمان نماز پڑھنے کے باوجود شرک سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ حقیقتِ نماز سے ان کی ناواقفیت ہے۔ اور اس صورت حال کے ذمہ دار دنیا پرست علماء ہیں جن کی ایک بڑی تعداد شرکی افعال کی ہم نوا ہے۔ جھوٹے قصوں اور موضوع روایتوں کے ذریعہ انھوں نے جاہل مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال

Marfat.com

بٹھادیا ہے کہ بزرگانِ دین خدا کے مقرب ہیں، غیر معمولی روحانی طاقت رکھتے ہیں اور امور عالم میں ان کو تصرف کا اختیار حاصل ہے۔ چنانچہ اس خیال کے تحت بہت سے ناخواندہ و نیم خواندہ مسلمان نماز پڑھنے کے باوجود حاجات و بلایا میں وفات یافتہ بزرگان دین سے طالبِ مدد ہوتے ہیں۔ اسی ضلالت میں کبھی یہود و نصاریٰ مبتلا رہ چکے ہیں۔ فرمایا گیا ہے:

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (سورہ توبہ: ۳۱)

''انھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب (کارساز) بنالیا ہے۔''

ان کے علماء اور درویشوں کی دنیا پرستی کا جو حال تھا وہ بھی ملاحظہ فرمالیں:

يٰـاَيُّهَا الَّـذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّـاسِ بِـالْبَاطِـلِ وَيَـصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ يَـكْـنِزُوْنَ الـذَّهَـبَ وَالْـفِـضَّةَ وَلَا يُـنْـفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ (سورہ مائدہ: ۳٤)

''اے ایمان والو، بہت سے علماء اور درویش لوگوں کے مال ناحق طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونے اور چاندی کا ڈھیر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔''

آیت میں ''يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کا مطلب یہ ہے کہ عیسائی علماء اور درویش لوگوں کو توحید کی راہ سے روکتے تھے اور اس کی وجہ ان کی دنیا پرستی تھی، جیسا کہ آگے کے جملہ ''وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الخ'' سے بالکل واضح ہے۔

اخلاقی نتائج

قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر انسان کی اخلاقی کمزوریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ○ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ○ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ○ (سورہ معارج: ۲۲)

Marfat.com

''انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو آہ وفریاد کرنے لگتا ہے۔ اور جب فارغ البالی حاصل ہوتی ہے تو وہ بخل کرتا ہے۔''

ان آیات میں انسان کی جن خلقی کمزوریوں کا ذکر ہوا ہے ان پر وہی لوگ قابو پاتے ہیں جو پابندِ نماز ہیں، جیسا کہ آگے کی آیات میں فرمایا گیا ہے:

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ o وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ o وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ o وَالَّذِيْنَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ o اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ o وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ o اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ o فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ o اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ o

(سورہ معارج: ۲۲-۳۵)

''مگر نمازی، جو پابند نماز ہوتے ہیں (ان کمزوریوں سے محفوظ ہوتے ہیں)، اور جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقررہ حق ہے، جو روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں، اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور باندیوں کے جن سے خود کو محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ چاہے تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ولحاظ رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں، اور اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جنت میں باعزت رہیں گے۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک نمازی کو جن صفاتِ حسنہ سے متصف ہونا چاہیے،

Marfat.com

دوسرے لفظوں میں حقیقی نماز ایک آدمی کے اندر جن اخلاقی خوبیوں کو پیدا کرتی ہے ان میں غربا پروری، یقین آخرت اور اس دن جواب دہی کا شدید احساس، عفت و پاکدامنی، امانت داری، پاسِ عہد اور حق گوئی جیسی اعلیٰ اخلاقی قدریں شامل ہیں۔ کھلی بات ہے کہ جو شخص تارکِ نماز ہوگا اس کے اندر ان اخلاقی اوصاف کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ایک آدمی تارکِ نماز ہو اور اس پر خواہشات نفسانی کا غلبہ نہ ہو، تارک نماز ہو اور آخرت کا یقین اور اعمال کے محاسبہ کا خوف اس میں موجود ہو، تارک نماز ہو اور مال و زر کی محبت میں گرفتار نہ ہو، تارک نماز ہو اور بندگان خدا کے حقوق غصب نہ کرتا ہو، تارک نماز ہو اور دروغ گوئی، خیانت، بدعہدی اور ناانصافی کا مرتکب نہ ہو۔ ترکِ نماز کے بعد اس نوع کے اخلاقی معائب سے پہلوتہی ممکن نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ

(سورہ مریم: ۵۹)

''پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کی۔''

اب اگر نماز پڑھ کر بھی کوئی شخص نفس کا غلام ہے تو وہ حقیقی معنی میں نماز پڑھتا ہی نہیں ہے۔ موجودہ دور میں اہتمامِ نماز کے باوجود نمازیوں میں اخلاقی معائب کی کثرت کی وجہ، جیسا کہ بتکرار لکھا گیا، حقیقتِ نماز سے ان کی بے خبری ہے۔

معاشرتی نتائج

نماز باجماعت کے اہتمام سے مسلمانوں کو جو معاشرتی فوائد حاصل ہوتے ہیں یا ان کو حاصل ہونے چاہئیں، ان میں خصوصیت کے ساتھ اتحاد و اتفاق، محبت و غم خواری اور اخوت و مساوات قابل ذکر ہیں۔ ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر ایک امام کے پیچھے دن میں پانچ بار نماز ادا کرنا جہاں فکر و عمل کی وحدت ظاہر کرتا ہے وہاں نمازیوں کے اندر ایک امّتِ واحدہ ہونے کے تصور کو بھی ابھارتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر نمازی، اور تارک نماز مسلمان بھی، غایتِ نماز کے اس پہلو سے غافل اور بے خبر ہیں، جس کی وجہ سے نہ صرف مسلم

Marfat.com

معاشرہ نماز کے مذکورہ فوائد سے محروم ہے بلکہ خاندانی اور نسلی امتیاز، طبقات اور برادریوں کا وجود اور باہم بغض وحسد جیسی قبیح سماجی برائیاں اب مسلم سماج کا لازمی جز بن چکی ہیں۔

سیاسی نتائج

نماز باجماعت کے نظام پر غور کریں تو دو باتیں بالکل واضح طور پر معلوم ہوں گی، ایک نظم و مساوات اور دوسرے اطاعت امیر (امام)۔ اور یہی دو اُمور کسی قوم کی سیاسی شیرازہ بندی میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نماز باجماعت کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس انقلاب پر غور کرتے ہیں جسے اسلام نے عرب کے دورِ جاہلیت میں برپا کیا۔

معلوم ہے کہ تمام عرب متفرق قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور سیاسی اعتبار سے ان میں کوئی وحدت نہ تھی۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد و خود مختار تھا۔ دوسرے لفظوں میں جزیرۃ العرب کے لوگ ایک منظم شہری ریاست کے تصور سے بالکل نا آشنا تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی بالادستی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہر قبیلے کا سردار خود کو دوسرے قبائل کے سرداروں سے بلند و برتر سمجھتا تھا۔ قبائلی عصبیت کا اس قدر زور تھا کہ معمولی معمولی باتوں پر تلواریں نیام سے باہر آجاتی تھیں۔

بنی تغلب اور بنی بکر کے درمیان لڑائی، جو تاریخ میں حرب بسوس کے نام سے مشہور ہے، صرف اس بات پر شروع ہوئی کہ بسوس نامی عورت کی اونٹنی مخالف قبیلہ کی چراگاہ میں داخل ہوگئی اور اس نے پناہ یافتہ پرندوں کے انڈے توڑ دیے تھے۔ کلیب نام کے ایک شخص نے جوشِ غضب میں اس اونٹنی کو ہلاک کردیا۔ اونٹنی کا ہلاک ہونا تھا کہ دونوں قبیلوں میں خوں آشام جنگ چھڑ گئی جو چالیس سال تک جاری رہی۔ خود نبی ﷺ کی زندگی میں، نبوت سے پہلے، قبیلۂ قریش اور قبیلۂ قیس کے درمیان جو معرکۂ کارزار گرم ہوا وہ سالوں جاری رہا۔ یہ لڑائی تاریخ میں حرب فجار کے نام سے معروف ہے۔ یہی حال مدینہ کے دو عربی قبائل اوس وخزرج کا تھا۔ غرضیکہ سارے ہی قبائل جنگ جوئی کو پیشۂ آبا بنائے ہوئے تھے۔ شعراءِ جاہلیت کا کلام ان کے اس جنگ جویانہ رویّے کا آئینہ دار ہے۔ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:

Marfat.com

اذا استنجدوا لم يسئلوه من دعاهم　　لاية حــرب ام بــاىّ مكـــان

''میں ان بہادروں میں سے ہوں کہ جب ان سے کوئی طالب مدد ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کس جنگ کے لیے اور کہاں؟''

ایک دوسرا شاعر فخریہ لہجے میں کہتا ہے:

واحياناً على بكر اخينا　　اذا مالم نجد الا أخانا

''اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا ہے تو خواہش جنگ کی تسکین کے لیے ہم اپنے برادر قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔''

ایک حماسی شاعر کی دعا ملاحظہ ہو:

اذا المهرة الشقرة ادرك ظهرها　　فشب الاله الحرب بين القبائل

''میرا گھوڑا اسواری کے قابل ہو جائے تو اللہ قبیلوں میں آتش جنگ بھڑکا دے تاکہ میں اپنے گھوڑے اور شمشیر کے جوہر دکھا سکوں۔''

خود قرآن مجید میں عربوں کی باہمی عداوت کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (سورہ ال عمران:۳:۱۰۳)

''اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تم پر کی کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پس اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور اس کی مہربانی سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔''

غور فرمائیں کہ نظم و اطاعت کے تصور سے نا آشنا، وحشی اور جنگ کے خوگر عربوں کو رسول اللہ ﷺ نے کس طرح متحد کیا اور انھیں ایک امیر کے تحت زندگی گزارنے کا سبق کیونکر سکھایا۔ بلاشبہ اس بے نظیر اتحاد کے پیدا کرنے میں دوسری باتوں کے علاوہ نماز باجماعت کے نظام نے مرکزی کردار ادا کیا۔ پانچ اوقات کی نمازوں نے تمام عرب مسلمانوں کو اس طرح ایک لڑی میں پرو دیا کہ نہ گورے کو کالے کے ساتھ کھڑا ہونے میں کوئی عذر تھا اور نہ امیر غریب کے پہلو سے پہلو ملانے میں کوئی کسر شان سمجھتا تھا۔ یہ بھی نماز ہی کا فیض تھا کہ امام امیر ہو یا غریب، گورا ہو یا کالا، خاندان قریش کا ہو یا کسی معمولی قبیلے یا خاندان سے تعلق رکھتا ہو اس کی اطاعت و اتباع کو ہر نمازی اپنے اوپر لازم جانتا تھا۔

Marfat.com

نماز باجماعت کے اس فیضان کو پیش نظر رکھیں اور پھر مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیں تو سخت حیرت و پشیمانی سے دوچار ہوں گے۔ مسلم معاشرے میں آج نہ تو اتحاد و اخوت کا ماحول باقی ہے اور نہ ہی اطاعت امیر کا کوئی ادنیٰ مظاہرہ کہیں نظر آتا ہے۔ اختلاف وانتشار اب مسلمانوں کا قومی امتیاز بن چکا ہے۔ اس ملی انتشار کی ایک بڑی وجہ بحیثیت جماعت مسلمانوں کا تارک نماز ہونا ہے۔ بدقسمتی سے جو لوگ نماز پڑھتے ہیں وہ نظم واجتماع کے تصور سے بالکل بے گانہ ہیں۔ انھوں نے دوسری قوموں کی طرح نماز کو محض پوجا پاٹ کا ایک رسمی عمل قرار دے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسجد میں ایک امیر (امام) کے پیچھے صف بستہ ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں لیکن مسجد سے نکلتے ہی امام اور صف بندی کے عمل کو بالکل بھول جاتے ہیں حالانکہ نماز باجماعت کا ایک بڑا مقصد، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مسلمانوں کے اندر نظم واجتماع اور اتباعِ امیر کے تصور کو فروغ دینا ہے۔

اُخروی نتائج

ابھی تک ہم نے ترک نماز کے جن اثرات ونتائج کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق دنیوی زندگی سے تھا، ترک نماز کا اُخروی نتیجہ اس کے دنیوی نتائج سے کہیں زیادہ ہولناک ہے، یعنی دخولِ نار۔ فرمایا گیا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ٥ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ٥ فِيْ جَنّٰتٍ ؕ يَتَسَآءَلُوْنَ ٥ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ٥ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ٥ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ٥ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ٥ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ٥ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ٥ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ٥

(سورہ مدثر: ۳۸ تا ۴۸)

''ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گرو ہوگا، بجز داہنے ہاتھ والے جو باغوں میں

Marfat.com

ہوں گے، مجرموں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔ سوال کریں گے، تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ جواب دیں گے، ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے، اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی فضول بحثیں کیا کرتے تھے، اور ہم روز جزا کو جھٹلایا کرتے تھے یہاں تک کہ ہم کو موت آ گئی۔ اس وقت شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کو کچھ نفع نہ دے گی۔''

اس آیت کے مطابق مجرموں کو جو چیزیں دوزخ میں لے گئیں ان میں ایک ترکِ نماز ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ تارک نماز مسلمان کے لیے نہ کوئی مغفرت ہے اور نہ ہی شفاعت۔ لیکن موجودہ دور کے نمازی مسلمان اس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ روز آخرت خدا کی مغفرت اور شفاعت کے مستحق صرف وہ نمازی ہوں گے جو حقیقی معنی میں نماز پڑھنے کے ساتھ غربا و مساکین کی مدد کرتے ہیں اور آخرت کی جوابدہی کا دل سے یقین رکھتے ہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے بالکل واضح ہے۔

صلوٰۃ باجماعت

اسلام میں فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کو تنہا کی نماز سے افضل بتایا گیا ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

صلوة الجماعة تفضل صلوة الفذ بسبع وعشرين درجة (۱)

''جماعت کی نماز تنہا کی نماز پر ستائیس درجہ فضیلت رکھتی ہے۔''

ایک مرتبہ ایک نابینا صحابی نے رسول اللہ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی مسجد تک لانے والا نہیں ہے، کیا میں گھر میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ جب وہ واپس جانے لگے تو بلوایا اور کہا: کیا تم اذان کی آواز سنتے ہو؟ نابینا صحابی نے عرض کیا: جی ہاں، اذان کی آواز سنتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: فاجب ''تو جماعت میں شریک ہوا کرو۔'' (۲)

اس واقعے سے نماز باجماعت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی

---

(۱) بخاری، ج۱، ص۸۹، عن عبداللہ ابن عمرؓ

(۲) صحیح مسلم، ج۱، ص۲۳۲

Marfat.com

معقول عذر کے بغیر ترکِ جماعت کسی مومن کا شیوہ نہیں، یہ تو ایک منافق کا طرزِ عمل ہے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: ''دورِ رسالت میں جو آدمی نماز با جماعت ادا نہیں کرتا تھا اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ یا تو وہ منافق ہے یا کسی بیماری کی وجہ سے شریکِ جماعت نہیں ہو سکا ہے۔''(۱)

عبداللہ ابن مسعودؓ ہی سے مروی ہے کہ جس شخص کو اس بات سے خوشی ہو کہ وہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ سے ایک کامل مومن کی حیثیت سے ملاقات کرے تو اسے چاہیے کہ وہ پانچ اوقات کی نماز جماعت سے ادا کرے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم منافقوں کی طرح کسی عذر کے بغیر مسجدوں کو چھوڑ کر اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے تو اپنے نبی کی سنت کو ترک کرو گے اور اگر اپنے نبی کی سنت ترک کرو گے تو گم راہ ہو جاؤ گے۔''(۲)

ایک بار کا واقعہ ہے کہ نبی ﷺ نماز عشاء ادا کرنے کے لیے مسجد میں تشریف لائے تو کچھ لوگوں کو مسجد سے غائب پایا۔ آپ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں پھر نماز کے لیے اذان دی جائے، میں کسی کو حکم دوں کہ وہ نماز پڑھائے اور میں ان لوگوں کے یہاں جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوئے اور ان کے گھروں کو ان کے ساتھ آگ لگا دوں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر ان کی عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور اس ارادہ کو عملی جامہ پہناتا۔''(۳)

کیا تارکِ جماعت منافق ہے؟

مذکورہ بالا روایت میں تارکِ جماعت کو منافق کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ رسالت میں مسلمانوں کی ایک جماعت تھی، جس کو حدیث میں ''الجماعت'' کہا گیا ہے اور جس سے بالشت بھر نکلنے اور اسی حالت میں مرجانے کو کفر کی موت سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ایک امام تھا جس کی اطاعت واتباع تمام مسلمانوں پر واجب تھی۔ یہی صورت خلافتِ راشدہ

(۱) صحیح مسلم
(۲) صحیح مسلم، ج۱، ص۲۳۲
(۳) صحیح مسلم، باب: فضل الصلوٰۃ بجماعۃ وبیان التشدید فی التخلف عنہا

Marfat.com

میں تھی۔ نماز با جماعت مسلمانوں کے نظم اجتماعی کی ایک روشن علامت تھی، اس نظم سے گریز کے معنی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے کہ تارکِ جماعت کا دل حقیقی ایمان سے خالی ہے۔ اس نے محض دکھانے کے لیے ظاہری ایمان واطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کسی تارکِ جماعت کو منافق کہنا صحیح ہوگا؟ راقم کے خیال میں ایسے شخص کو منافق کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور عہدِ رسالت اور عہد صحابہ سے بالکل مختلف ہے۔ آج مسلمانوں کا کوئی ایک مرکزِ اجتماع نہیں ہے اور وہ متعدد جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک امام کی جگہ ان کے بہت سارے امام وقاید ہیں، اس کے علاوہ مسجد کے امام اور باہر کے امام وقاید الگ الگ ہیں۔ جو لوگ مسجدوں میں نماز با جماعت ادا کرتے ہیں وہ بھی جماعت وامامت کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ ان حالات میں کسی تارکِ جماعت کو منافق کہنا اس پر بڑا ظلم ہوگا۔ اگر کوئی مسلمان جماعت سے نماز پڑھنے کے بجائے اپنے گھر یا دکان پر نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی البتہ وہ جماعت کے ثواب اور اس کے اجتماعی فوائد سے محروم ہوگا۔ لیکن ترکِ جماعت کو معمول بنانا صحیح نہ ہوگا۔ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں کہ نماز با جماعت اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہے۔ اس لیے ہر نمازی کی کوشش یہ ہو کہ وہ جماعت سے ہی نماز ادا کرے۔

نماز با جماعت کے مصالح

اجتماع کا، جیسا کہ عام مشاہدہ ہے، انسان کے قلب ودماغ اور اس کی نفسیات پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ایک آدمی کے رونے اور ہنسنے اور دس آدمیوں کے رونے اور ہنسنے میں بڑا فرق ہے۔ اجتماع کے اس نفسیاتی پہلو کے پیش نظر اسلام میں عبادات کو اجتماعی طور پر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

نماز، جو دراصل خدا کے ذکر اور اس سے مناجات کا ایک عمل ہے، جب اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہے تو وہ زیادہ مؤثر بن جاتی ہے۔ جس وقت بہت سارے سر ایک ساتھ خدا کے حضور میں جھکتے اور بہت سارے ہاتھ بیک وقت دعا کے لیے اٹھتے ہیں تو اس سے رحمتِ خداوندی جلد جوش میں آتی ہے۔ قحط کے دنوں میں بارش کے لیے جو اجتماعی دعا کی جاتی ہے،

Marfat.com

اور جس کو نمازِ استسقاء کہتے ہیں، اس کا مقصود یہی ہے کہ جب ہزاروں پریشاں حال بندے دل کے پورے جوش وخروش کے ساتھ خدا کے آگے گریہ وزاری کریں گے تو اس کی رحمت کا بادل بہت جلد نمودار ہوگا۔

نماز باجماعت کی ایک اہم غایت اہل ایمان کی تنظیم بھی ہے، یعنی مسلمانوں کے اندر دینی اخوت، ملّی وحدت، نظم وضبط اور ایک امیر کی اطاعت واتّباع کے جذبات بیدار کرنا تا کہ ایک ایسی صالح جماعت وجود میں آئے جو خیر کے فروغ اور منکر کے استیصال کے لیے جدّ وجہد کرے، جیسا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (ال عمران:۱۱۰)

''تم ایک بہترین جماعت ہو، جو لوگوں کے لیے اٹھائی گئی ہے، تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اجتماعی زندگی میں نماز باجماعت کے تنظیمی کردار کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے یہودیوں کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ معلوم ہے کہ وہ قدیم مصر میں کثرتِ تعداد کے باوجود غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان میں اجتماعی شعور کا فقدان تھا جس کے باعث ان کی نہ تو کوئی تنظیم تھی، نہ کوئی مرکزِ اجتماع اور نہ ہی کوئی قاید۔ اپنی بے عملی کی وجہ سے انھوں نے نماز بھی ضائع کر دی تھی۔ ان حالات میں جب موسیٰ علیہ السلام نبی بنائے گئے تو ان کو سب سے پہلے ایک مرکزِ اجتماع کے قیام اور اس میں نماز باجماعت کی ادائیگی کا حکم ملا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَن تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(سورہ یونس:۸۷)

''اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرالو اور اپنے (ان) گھروں کو قبلہ بنالو اور (ان میں) نماز قائم کرو، اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دے دو۔''

Marfat.com

اس آیت میں ''وبشر المومنین'' کا جملہ معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اہل ایمان ایک مرکزِ اجتماع پر جمع ہو کر نماز باجماعت کے ذریعہ خدا سے اپنا تعلق جوڑ لیں گے تو بہت جلد ان کی طرف خدا کی رحمت متوجہ ہوگی اور فرعون کے مظالم سے ان کو نجات مل جائے گی۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جب مصری یہودیوں کا ایک مرکز اجتماع بن گیا اور وہ موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں منظم ہو گئے تو نہایت قلیل عرصے میں ان کے قومی مصائب کا خاتمہ ہو گیا۔

بنی اسرائیل کی اس سرگزشت سے یہ تاریخی نکتہ معلوم ہوا کہ اقوام بالخصوص مغلوب قوموں کی زندگی میں اجتماع و تنظیم ہی قوت کا اصلی خزانہ ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہندستان میں، اور دوسرے مسلم ملکوں میں بھی، نماز باجماعت کے قیام کے باوجود مسلمانوں کی اجتماعی زندگی ناقابل بیان حد تک خراب وخستہ ہے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ ہم نے نماز باجماعت کی حقیقت گم کر دی ہے۔ ہماری حالت منتشر بھیڑوں کی سی ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے بے شعوری کی حالت میں مسجدوں میں جمع ہوتے ہیں اور پھر جدا ہو جاتے ہیں۔ نہ امام کو خبر کہ امامت کیا چیز ہے اور نہ ہی مقتدیوں کو معلوم کہ امام کی اقتدا و اتباع کے کیا معنی ہیں۔ امام اور مقتدی دونوں حدیثِ ذیل پر غور کریں تو نماز باجماعت کی حقیقت ان پر واضح ہو جائے گی۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

> ''کسی گاؤں یا میدان میں تین آدمی ہوں اور جماعت سے نماز ادا نہ کریں تو ان پر شیطان غالب آ جاتا ہے لہذا جماعت کو لازم کرو۔ اس لیے کہ بھیڑیا اسی بکری کو کھاتا ہے جو اپنے گلے سے دور رہتی ہے۔''(۱)

نوافل

نمازیں دو طرح کی ہیں، ایک فرض اور دوسری نفل۔ فرض سے مراد، جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے، وہ نمازیں ہیں جن کی ادائیگی ہر عاقل و بالغ مسلمان پر شب و روز کے پانچ اوقات میں واجب ہے، اور نفل سے مراد وہ نمازیں ہیں جو فرض کے علاوہ ہیں اور وہ واجب نہیں ہیں

(۱) مشکوٰۃ، رواہ احمد، ابوداؤد و نسائی

Marfat.com

لیکن ان کا پڑھنا باعثِ ثواب ہے۔ فرض نمازوں کی شرعی حیثیت اور ان کی رکعتوں کی تعداد سے ہر مسلمان واقف ہے اور ان میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے اس لیے میں یہاں اپنی گفتگو صرف نوافل تک محدود رکھوں گا۔

فقہاءِ اسلام نے نفل یعنی زائد از فرض نمازوں کو سنّت، مستحب اور تطوّع کے خانوں میں تقسیم کیا ہے اور سنت کی بھی دو قسمیں ہیں، سنّتِ مؤکدہ اور سنّتِ غیر مؤکدہ۔ سنّت سے مراد وہ نفل نمازیں ہیں جن کو نبی ﷺ نے پابندی کے ساتھ پڑھا ہے، مثلاً فرض نمازوں کے پہلے اور بعد کی سنتیں۔ مستحب سے مراد وہ نفل نمازیں ہیں جن کو آپ نے ادا تو کیا ہے لیکن ان کی پابندی نہیں کی ہے، مثلاً گھر سے نکلنے کے وقت کی نماز۔ تطوّع سے وہ نفل نمازیں مراد ہیں جو سنّت اور مستحب کے علاوہ ہیں۔ راقم کے خیال میں سنّت کو مؤکدہ اور غیر مؤکدہ میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ مؤکدہ کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کا تارک گنہ گار ہے حالانکہ سنن کا تارک گنہ گار نہیں ہے، جیسا کہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا۔ اسی طرح مستحب کی اصطلاح بھی غیر ضروری ہے۔ فرض کے علاوہ جو نمازیں بھی آپ ﷺ نے ادا فرمائی ہیں وہ سب نفل اور از قسمِ تطوّع ہیں۔

نوافل کی حقیقت

نوافل دراصل فرض نمازوں کی محافظ ہیں۔ اذان کے ساتھ ہی ایک طرح سے نماز کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اذان کی آواز سنتے ہی ہر مسلمان اپنے دنیوی مشاغل سے فارغ ہو کر نماز کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔ وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ مسجد کا رخ کرتا ہے۔ اگر مسجد پہنچ کر وہ فوراً ہی فرض نماز پڑھنا شروع کر دے تو عین ممکن ہے کہ بعض دنیوی خیالات جن میں وہ تھوڑی دیر پہلے تک گھرا ہوا تھا، غیر شعوری طور پر اس کے ذہن میں در آئیں اور نماز میں خلل واقع ہو۔ فرض نماز کو اس امکانی خطرے سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اس سے پہلے تھوڑا وقفہ دیا جائے تا کہ اس دوران نہ صرف اعضاء و جوارح پر سکون ہو جائیں بلکہ نفل نماز کے ذریعہ دل و دماغ دنیوی خیالات اور وساوس سے ممکن حد تک پاک ہو جائیں۔ بشری کم زوریوں کے سبب سے اس اہتمام کے باوجود عین ممکن تھا کہ فرض نماز میں کوئی کمی رہ

Marfat.com

جائے اس لیے اس کے بعد بھی نفل رکھی گئی ہے تاکہ وہ فرض نماز کی کمی کو دور کر دے۔ نبی ﷺ کے ایک ارشاد سے نوافل کی اس حیثیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے جس چیز کا محاسبہ کیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اگر وہ درست نکلی تو وہ کامیاب و کامراں ہوگا۔ اور اگر وہ نادرست نکلی تو نامراد ہوا۔ اور اگر اس کے فرائض میں کوئی کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''میرے بندے کے اعمال میں کچھ نفل نمازیں ہیں۔ پھر ان سے فرائض کی کمی کو دور کیا جائے گا۔ یہی معاملہ باقی دوسرے اعمال کے ساتھ کیا جائے گا۔'' (۱)

صدقہ اور نفل نماز میں یک گونہ مماثلت ہے اور اس سے بھی نوافل کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ امام راغب اصفہانی نے صدقہ کی لغوی تشریح میں لکھا ہے کہ: ''صدقہ وہ ہے جس کو انسان اپنے مال میں سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ۔ لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ واجب کے لیے۔'' (۲)

معلوم ہوا کہ صدقہ ایک زائد مالی عبادت ہے اور وہ بندے پر واجب نہیں ہے۔ (۳) یہی معاملہ نوافل کا ہے، وہ بھی ایک زائد عبادت ہے اور اس کا ترک و اختیار بندے کی رضا و رغبت پر ہے۔ جس طرح صدقہ دینا رضائے الٰہی کا موجب ہے اسی طرح نوافل خدا کے ہاں تقرب کا ذریعہ ہیں۔ جس طرح صدقہ کے لیے کوئی حد و مقدار متعین نہیں اسی طرح نوافل کی تعداد بھی غیر متعین ہے۔

نوافل کی فضیلت حدیث میں

کسی کام کو حکم سمجھ کر کرنا ایک چیز ہے اور اس کو حکم سمجھے بغیر کرنا بالکل دوسری چیز

(۱) ترمذی ونسائی

(۲) دیکھیں، مفردات راغب

(۳) بشرطیکہ وہ زکوٰۃ ادا کر رہا ہو۔ اگر زکوٰۃ ادا نہ کر رہا ہو تو پھر انفاق واجب ہے، خواہ اس کو صدقہ کہیں یا کوئی دوسرا نام دیں (مصنف)

Marfat.com

ہے۔ حکم کی پیروی مواخذہ سے بچا سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس سے خدا کا تقرب بھی حاصل ہو۔ خدا کی رضا اور اس کے قرب کا معتبر ذریعہ وہ عبادتیں اور اعمالِ حسنہ ہیں جنہیں بندہ اپنی مرضی اور خوشی سے پورے جذب و شوق کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ نوافل کا شمار ان ہی عبادتوں میں ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''کوئی بندہ میرا تقرب حاصل کرنا چاہے تو اس کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ میرے فرائض کی پابندی کرے۔ فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل بھی ادا کرتا رہے تو اسے رفتہ رفتہ میری محبت حاصل ہوگی تا آنکہ وہ میرا محبوب بندہ بن جائے گا۔ اور جس بندے سے مجھے محبت ہو جاتی ہے میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر مجھ سے سوال کرتا ہے تو اسے عطا کرتا ہوں۔ اور اگر میری پناہ چاہتا ہے تو اسے اپنی پناہ اور حفاظت میں رکھتا ہوں۔''(۱)

ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روز آخرت نبی ﷺ کی شفاعت کے اصل مستحق وہ اہل ایمان ہوں گے جو بکثرت نوافل ادا کرتے رہے ہوں گے۔ (۲) نبی ﷺ کے ایک خادم ابوفراس ربیعہ ابن کعب الاسلمی روایت کرتے ہیں کہ:

> ''میں شب میں رسول اللہؐ کے پاس حاضر رہتا تھا۔ آپ کے وضو اور دیگر ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ ایک روز آپ نے فرمایا: کچھ مانگو۔ میں نے عرض کیا کہ جنت میں آپ کی قربت چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اس کے علاوہ اور کچھ نہیں؟ میں نے عرض کیا: نہیں، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا: تو تم سجدوں کی کثرت سے میری مدد کرو۔''(۳)

---

(۱) صحیح بخاری۔

(۲) اس سے موجودہ دور کے مسلمانوں کی بے روح نوافل مراد نہیں بلکہ وہ نمازیں مراد ہیں جو خشوعِ قلب کے ساتھ محبت خدا کے جذبے سے سرشار ہو کر پڑھی جاتی ہیں۔

(۳) صحیح مسلم

Marfat.com

نوافل کے باب میں صحابہ کا طرزِ عمل

نوافل کے بارے میں متعدد حدیثیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ فرض نمازوں کے پہلے اور بعد میں نمازیں پڑھتے تھے اور آپ نے صحابہؓ کو ان نفل نمازوں کی فضیلت بھی مختلف مواقع پر بتائی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنھم اجمعین اتباعِ رسول میں نہایت مخلص اور پرجوش واقع ہوئے تھے اس لیے آپ علیہ کی زبانِ مبارک سے کسی عمل کی فضیلت سن کر وہ فوراً اس پر عمل پیرا ہو جاتے تھے۔ جوشِ عبادت اور قیامِ لیل سے ان کی بے پناہ رغبت کا ثبوت قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ الخ۔ (سورہ مزمل: ۲۰)

''تمہارا رب جانتا ہے کہ تم، اور تمہارے ساتھی اہل ایمان کا ایک گروہ بھی، دو تہائی رات سے کچھ کم، اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (عبادت میں) کھڑے رہتے ہو۔''

چونکہ صحابہؓ نے نبی علیہ کو فرض نمازوں کے علاوہ بھی نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھا تھا اور آپ کی زبان مبارک سے ان کی فضیلت سنی تھی اس لیے وہ ان زائد از فرض نمازوں (نوافل) کو بھی پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے نہ تو ان نمازوں کو موکدہ اور غیر موکدہ کے خانوں میں تقسیم کیا اور نہ ہی ان کو فرض اور واجب سمجھ کر ادا کرتے تھے بلکہ اپنی مرضی اور خوشی سے پڑھتے تھے۔

نوافل کی شرعی حیثیت

نوافل (سنن) کی تمام فضیلتوں کے باوجود، جن کا اس سے پہلے ذکر ہوا، ان کی حیثیت لازمی نہیں، اختیاری ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے علماء وفقہاء نے سنن کی ادائیگی کو اُمت پر لازمی قرار دیا اور ان کو موکدہ اور غیر موکدہ کے خانوں میں تقسیم کر کے سننِ موکدہ کے ترک کو فعل گناہ بتایا۔ سوال یہ ہے کہ اگر سنن کی ادائیگی لازمی اور ان کا تارک گنہ گار ہے تو

Marfat.com

پھر نفل اور فرض نمازوں میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ نمازوں کو نفل اور فرض کے ناموں سے موسوم کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔

بلاشبہ نبی علیہ السلام کا ہر فعل امت کے لیے لائق اتباع اور باعثِ خیر و برکت ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انسانی طبائع میں اختلاف ہے اور جسمانی اور روحانی استعدادوں میں بھی فرق ہے، اس لیے ہر شخص سے یہ توقع رکھنا یا اس پر لازم کر دینا کہ وہ عبادت سے متعلق نبی علیہ السلام کی ہر سنت کی تقلید کرے صحیح نہ ہوگا۔ نماز کے بارے میں رسول اللہ علیہ السلام کا واضح ارشاد ہے: ''نماز ایک خیر ہے رکھی ہوئی پس جو کوئی چاہے اس میں سے زیادہ لے لے اور جو چاہے کم۔'' (۱) اس سلسلے میں قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے بھی واضح رہنمائی ملتی ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (سورہ اعراف: ۴۲)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، اور ہم ہر ایک کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلف ٹھہراتے ہیں، وہ جنت والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تکلیفِ مالا یطاق نہیں دیتا۔ ہر صاحب ایمان سے اتنا ہی عمل مطلوب ہے جتنا وہ اپنی فطری استعداد اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے انجام دینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے عبادت کے سلسلے میں اپنی امت پر ایسا کوئی بار نہیں ڈالا جس کی وہ متحمل نہ ہو سکے۔ اس کا ایک ثبوت تراویح کی نسبت آپ کا طرز عمل ہے۔ روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رمضان کے خیر مقدم میں ایک مؤثر خطبہ دیا اور فرمایا:

''اس مہینے میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار راتوں سے افضل ہے۔ اس مہینہ کی راتوں میں تراویح پڑھنا خدا نے نفل کر دیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں کوئی کام اپنی خوشی سے بطور خود کرے گا اس کا اجر و ثواب دوسرے مہینوں کے فرض سے

(۱) ابوداؤد

Marfat.com

زیادہ ہے۔"(۱)

تراویح کو نفل (تطوع) کہا گیا ہے اور اسے اپنی مرضی اور خوشی سے ادا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ماہ صیام کی تین شب یعنی تیئس، پچیس اور ستائیس رمضان المبارک کو تراویح کی نماز جماعت سے پڑھائی۔لیکن اس کے بعد نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں تشریف نہ لائے۔صحابہ کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا:

> "خدا تمہارے ذوق وشوق میں برکت دے۔میں اس اندیشہ سے باہر نہیں آیا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کردی جائے اور تم ہمیشہ اس کی پابندی نہ کرسکو۔تم اسے اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو کیونکہ نفل نمازوں کا گھروں پر پڑھنا زیادہ باعثِ اجروثواب ہے۔" (۲)

اس روایت میں بھی تراویح کو نفل نماز کہا گیا ہے اور اسے گھروں میں پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔اس روایت سے فرض اور نفل نمازوں میں جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہوجاتا ہے۔اور وہ یہ کہ فرض کی ادائیگی ہر حال میں لازم ہے لیکن نفل فرض سے زائد چیز ہے اور اس کی ادائیگی باعثِ اجر ہے، لازمی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا تارک گنہ گار ہوگا۔اسی لیے تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ"میں اس اندیشہ سے باہر نہیں آیا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض کردی جائے اور تم ہمیشہ اس کی پابندی نہ کرسکو۔"یعنی اس کے فرض ہوجانے کے بعد اس کے ترک کی صورت میں گنہ گار ٹھہرو۔

کتبِ حدیث میں محدثینِ کرام نے زائد از فرض نمازوں کے لیے جو عنوان باندھا ہے اس میں ایک لفظ تطوع ہے۔مثلاً بخاری میں ہے: باب ماجاء فی التطوّع مثنیٰ مثنیٰ امام بخاری نے ایک دوسرا عنوان بھی قائم کیا ہے: باب التطوّع بعد المکتوبہ۔(۳)

اس عنوان میں "بعد المکتوبہ" کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ یہاں تطوع سے مراد نفل نمازیں یعنی سنتیں ہیں۔صحیح مسلم میں نوافل کے لیے عنوان قائم کیا گیا ہے: ثنتی عشرۃ

---

(۱) مشکوٰۃ، رواہ سلمان فارسیؓ۔ روایت طویل ہے میں نے اس کا صرف ایک حصہ نقل کیا ہے۔

(۲) صحیح مسلم

(۳) اس باب کے تحت دن ورات میں کل دس رکعت سنتوں کا ذکر ہے۔

Marfat.com

رکعة تطوعا غير فريضة (۱)''بارہ رکعتیں زائد (غیر حکمی) فرض کے علاوہ۔'' تطوّع کا مفہوم کسی کام کو اپنی مرضی اور خوشی سے کرنا ہے۔ نوافل کے لیے تطوع کا لفظ استعمال کر کے بتایا گیا ہے کہ ان کی ادائیگی نمازی کی مرضی اور خوشی پر موقوف ہے، اس پر لازمی نہیں ہے۔ طلحہ بن عبیداللہؓ سے روایت ہے کہ اہل نجد کا ایک آدمی رسول اللہ کے پاس آیا اور اسلام کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا:

> ''دن اور رات میں پانچ بار نماز ادا کرنا (اسلام کا پہلا رکن ہے) اس نے کہا: کیا اس کے علاوہ بھی کچھ فرض ہے (هل علی غیرهن)؟ آپ نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تم اپنی مرضی سے کچھ کرو (لا، الا ان تطوع) اسی طرح اس نے دوسرے ارکان اسلام کے متعلق پوچھا اور آپ نے ہر بار وہی جواب دیا جو اوپر مذکور ہوا۔'' (۲)

اس حدیث سے تطوّع کے مفہوم کی وضاحت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نوافل دراصل زائد از فرض نمازیں ہیں اور وہ واجب نہیں، اختیاری ہیں۔ نوافل کا تعلق دراصل اہلِ ایمان کے ایک خاص طبقہ سے ہے نہ کہ عام مسلمانوں سے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ: ''نوافل وہ نمازیں ہیں جن کو رسول اللہ نے ان لوگوں کے لیے جو درجۂ احسان پر فائز ہیں اور سابقینِ امّت میں سے ہیں، فرض نماز کے علاوہ، جس کی ادائیگی ہر خاص و عام پر واجب ہے، مسنون بنایا۔ پس جو شخص جس قدر اس کی کثرت کر سکتا ہو کرے جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے: ''استقامت اختیار کرو اور تم ہرگز احاطہ نہ کر سکو گے، اور جس قدر اعمال کی طاقت رکھتے ہو اسی قدر کرو۔'' (۳) نوافل کے باب میں ہمارے علماء و فقہاء نے جو غلو آمیز رویّہ اختیار کیا ہے وہ سراسر حکمتِ دین کے منافی ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''تشریع کے مقاصد جلیلہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دین میں تعمق کا دروازہ بند کر دیا جائے تا کہ لوگ کسی عمل کو اپنے اوپر خوب لازم نہ کر لیں پھر ان کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس کو عبادتِ سماویہ میں سے سمجھ لیں اور اسے اپنے اوپر فرض قرار دے

---

(۱) مسلم، ج۱، ص۲۵۱

(۲) موطا، باب: جامع الترغیب فی الصلوٰۃ

(۳) حجۃ اللہ البالغہ، ج۲، باب: الاقتصاد فی العمل، ص۶۰-۶۲

Marfat.com

لیں۔ اور پھر ان کے بعد جو لوگ آئیں ان کے نزدیک ظن یقین بن جائے اور جس عبادت کی فضیلت کا احتمال تھا اب لوگوں کو اس کی فرضیت پر اطمینان ہو جائے اور اس طرح دین میں تحریف ہو جائے۔"(۱)

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو دینی اعمال میں غلو اور تشدّد کو پسند نہیں کرتا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ دین آسان ہے اور جو شخص دین میں تشدد کی راہ اختیار کرے گا دین اس پر غالب آ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اُمّت کو میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

"انہی وجوہ کی بنا پر رسول اللہ نے اپنی امت پر لازم کر دیا ہے کہ وہ عمل میں میانہ روی اختیار کریں اور اس قدر تجاوز نہ کریں جس سے ملال اور دل میں اشتباہ پیدا ہو یا ضروری تدابیر متروک ہو جائیں۔ ان باتوں کو نبی ﷺ نے صراحۃً اور اشارۃً دونوں طرح بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا "اللہ تعالیٰ کو اعمال میں سب سے زیادہ وہ اعمال پسند ہیں جو ہمیشہ کیے جائیں اگرچہ ان کی مقدار کم ہی کیوں نہ ہو۔"(۲)

اس بنا پر ماننا ہوگا کہ اعمالِ دینیہ میں قلّت سے کثرت کی طرف مراجعت حکمتِ دین اور فطرتِ انسانی دونوں کے مطابق ہے۔ اس راہ میں صحیح طرز عمل یہ ہوگا کہ پہلے مسلمانوں کو فرائض کی ادائیگی کی طرف راغب کیا جائے۔ جب وہ فرائض کو ٹھیک ڈھنگ سے ادا کرنے لگیں اور یہ بالکل ظاہر ہو جائے کہ ان کے دل و دماغ میں یکسوئی اور لذتِ عبادت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس وقت ان کو نوافل کی ترغیب دی جائے۔ لیکن یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ زائد از فرض عبادت ہے اور بندے کی رضا اور رغبت کے ساتھ مطلوب ہے۔ جو شخص نوافل ادا کرے گا وہ اجر کا مستحق ہوگا اور جو ادا نہ کرے گا وہ محرومِ اجر تو ہوگا لیکن گنہ گار نہ ہوگا۔ لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا کا یہی مطلب ہے۔ اس سے تجاوز کرنا دین میں غلو اور تشدد کی راہ کھولنا ہے جو مصالحِ دین کے سراسر خلاف ہے۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، باب: الاقتصاد فی العمل، ص ۶۰-۶۲

(۲) ایضاً

Marfat.com

نوافل کی تعداد

فرض نمازوں کے پہلے اور بعد میں جو نوافل (سنتیں) پڑھی جاتی ہیں ان کی تعداد مختلف روایتوں کے مطابق بارہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:

> ''آپ (نبی ﷺ) میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعت ادا فرماتے تھے پھر باہر جا کر نماز پڑھاتے تھے پھر واپس آ کر دو رکعت پڑھتے تھے۔ اسی طرح مغرب کی نماز پڑھا کر گھر تشریف لاتے اور دو رکعت پڑھتے، پھر عشاء کی نماز پڑھاتے تھے اور گھر آ کر دو رکعت پڑھتے پھر فجر میں بھی دو رکعت پڑھتے۔'' (۱)

ظہر سے پہلے کی سنت میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ظہر سے پہلے اور ظہر، مغرب، عشاء اور جمعہ کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں۔'' (۲) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے نماز ظہر سے پہلے دو رکعت نفل ادا فرمائی ہے۔ امام بخاری اور دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں نوافل کے لیے جو عنوان قائم کیا ہے اس میں مثنیٰ مثنیٰ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوافل کو دو دو رکعتوں کے ساتھ ہی پڑھنا چاہیے۔ چار رکعت والی روایت کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپؐ نے کبھی ظہر سے پہلے چار رکعتیں ادا فرمائی ہوں۔

ہندی مسلمان فرض نمازوں سے پہلے اور ان کے بعد جو نوافل ادا کرتے ہیں ان کی تعداد اٹھارہ ہے کیونکہ علماء نے چھ غیر مؤکدہ سنتوں کو بھی شامل کر دیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ زیادہ تر کمزور روایتیں ہیں۔ بہر حال نوافل کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے۔ ہر شخص حسب توفیق اپنی مرضی سے جتنی نوافل ادا کرنا چاہے ادا کر سکتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، ابوداؤد۔ ترمذی میں حضرت ام حبیبہؓ سے جو روایت بیان کی گئی ہے اس میں بھی سنتوں کی تعداد بارہ ہے۔ دیکھیں ج ا ص ۵۶

(۲) (بخاری ۳/۲۱۱ فی التطوع: باب التطوع بعد المکتوبۃ۔ بخاری کے باب الصلوٰۃ یوم الجمعۃ وقبلھا میں بھی یہی روایت مذکور ہے۔

Marfat.com

ایک اہم نفل نماز

نماز وتر کا شمار ایک اہم نفل نماز کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو کبھی ترک نہیں کیا حتی کہ سفر میں بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے۔ ایک روایت میں آپ نے فرمایا ہے کہ:

> ''اللہ نے تم کو ایک اور نماز بطور عطیہ دی ہے، وہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور وہ وتر ہے۔ اللہ نے اس کو نماز عشاء کے بعد سے طلوع فجر سے پہلے رکھا ہے۔''(۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ وتر ایک مستقل نماز ہے جو عشاء اور فجر کے درمیان رکھی گئی ہے۔ لیکن یہ واجب نہیں ہے، اس کی حیثیت نماز تہجد کی سی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ اس کو نماز فجر سے پہلے تہجد کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھتے تھے۔(۲)

اکثر روایتوں میں نماز وتر کی رکعتوں کی تعداد تین بیان کی گئی ہے، بعض روایتوں میں ایک رکعت کا بھی ذکر ہے۔(۳) وتر میں جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے بڑی جامع دعا ہے۔ لیکن افسوس کہ مسلمان نماز کی دیگر دعاؤں کی طرح اس دعا کے مفہوم سے بھی بالعموم ناواقف ہیں۔ یہ دعا اس کے ترجمہ کے ساتھ ملاحظہ ہو:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ وَنُثْنِيْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ وَنَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ۔ اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْ رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ، اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ۔

---

(۱) ترمذی، ابوداؤد، عن خارجہ ابن حذیفہؓ

(۲) دیکھیں مسلم، ج ا ص ۲۶۱ و نسائی، ج ا ص ۲۴۹

(۳) اصل یہ ہے کہ وتر بھی سنت ہے۔ دو رکعت سنت میں ایک رکعت کا اضافہ کر کے اس کو وتر کرلیا جاتا ہے۔

Marfat.com

''خدایا! ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تجھ سے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، تجھ پر ایمان لاتے ہیں، تیرے ہی اوپر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور تیری بہترین تعریف کرتے ہیں، ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں، ناشکری نہیں کرتے۔ جو لوگ تیرے نافرمان ہیں ہم ان سے قطعِ تعلق کرتے ہیں، ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ خدایا، ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تیری ہی لیے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں، اور ہماری سعی وتلاش کا محور ومرکز تیری ہی ذات ہے، ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ یقیناً تیرے عذاب سے صرف کفار دوچار ہوں گے۔''

ایک غلط رواج

ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلمان نوافل گھروں میں پڑھنے کے بجائے مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ اس میں بہت سے مفاسد ہیں۔ نبی ﷺ کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ آپ ہر فرض نماز کی سنت، خواہ وہ پہلے ہو یا بعد میں، گھر پر ادا فرماتے تھے، جیسا کہ اس سے پہلے نوافل کے ذکر میں بیان ہوا۔ آپ کے اصحاب کا بھی یہی طریقہ تھا۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں:

''عبداللہ ابن عمرؓ جب مسجد میں آتے اور لوگ نماز سے فارغ ہو چکے ہوتے تو وہ فرض نماز شروع کر دیتے تھے، اس سے پہلے کچھ نہیں پڑھتے تھے۔''(۱)

نبی ﷺ نے تاکید فرمائی ہے کہ نوافل کو گھروں میں پڑھا جائے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: اجعلوا من صلاتکم فی بیوتکم (۲) ''تم لوگ کچھ نمازیں اپنے گھروں میں بھی پڑھا کرو۔'' ایک دوسری روایت میں ہے: ''اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔'' نسائی، ترمذی اور ابوداؤد میں کعب بن عجرہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ بنی عبدالاشہل کی مسجد میں تشریف لائے اور یہاں مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے لوگوں کو نوافل پڑھتے

(۱) موطا، باب: العمل فی جامع الصلوٰۃ

(۲) نسائی، فی صلوٰۃ اللیل، باب: الحث علی صلوٰۃ البیت

Marfat.com

دیکھا تو فرمایا۔ ''یہ نماز گھر کی ہے۔''(۱)

آپ ﷺ کے ان ارشادات سے بالکل واضح ہے کہ مسجدوں میں صرف فرض نمازیں پڑھی جائیں، نوافل کو گھروں میں ادا کیا جائے، البتہ اگر کوئی مجبوری حائل ہو تو مسجد میں پڑھ سکتے ہیں لیکن اس کو معمول بنانا صحیح نہ ہوگا۔ گھروں میں نوافل کے پڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے وہاں نماز کا ماحول بنتا ہے اور خدا کی برکت و رحمت نازل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ریا اور نمود سے، جو اخلاصِ عبادت کے منافی ہے، حفاظت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک ارشاد قابل ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''خبردار، اپنے راست بازی کے کام آدمیوں کو دکھانے کے لیے نہ کرو، نہیں تو تمہارے باپ (رب) کے پاس جو آسمان پر ہے تمہارے لیے کچھ اجر نہیں ہے۔ ...اور جب تم دعا کرو تو ریا کاروں کی مانند نہ بنو کیونکہ وہ عبادت خانوں میں دعا کرنا پسند کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پاچکے۔ بلکہ جب تو دعا (یعنی عبادت) کرے تو اپنی کوٹھری میں جا اور دروازہ بند کر کے اپنے باپ (رب) سے جو پوشیدگی میں ہے دعا کر۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھے بدلہ دے گا۔''(۲)

امامت

دین میں نماز باجماعت کی اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ امام اس شخص کو بنایا جائے جو مسلمانوں کی جماعت میں علم اور عمل دونوں کے لحاظ سے سب سے بہتر ہو۔ نبی ﷺ کے طرز عمل اور آپ کی تعلیمات سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

مرض وفات میں آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا(۳) حالانکہ حضرت ابی بن کعبؓ موجود تھے جو سب سے اچھے قاری تھے۔ خود نبی ﷺ

---

(۱) ترمذی، فی الصلوٰۃ، باب: ماذکر فی الصلوٰۃ بعد المغرب انہ فی البیت افضل

(۲) متی، باب: ۶، آیات ۱تا۶

(۳) بخاری، ج ۱، ص ۹۳

Marfat.com

نے ان کے بارے میں فرمایا ہے: اقرء کم ابی بن کعب۔ ''تم میں سب سے اچھے قاری ابی بن کعب ہیں۔'' حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امام بنانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ قوم کے ایک معمر، خداترس اور صاحب علم وعمل آدمی تھے۔ امام بخاری نے اسی نکتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کیا ہے: باب اهل العلم والفضل احق بالامامة ''اہل علم وفضل امامت کے زیادہ حق دار ہیں۔'' بخاری ہی میں مالک بن جویرثؓ سے ایک روایت ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

''نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ پس جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی اذان دے اور تم میں کا بڑا (اکبرکم) امامت کرے۔''(۱)

''اکبرکم'' سے علم اور عمر میں بڑائی مراد ہے۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ امام علم کے ساتھ عمر میں بھی تمام نمازیوں سے بڑا ہو۔ لیکن صاحب علم وفضل کی برتری بہرحال مسلم ہے۔ ایک دفعہ کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لیے آپؐ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ تم میں جس کو قرآن سب سے زیادہ یاد ہو وہ نمازوں میں تمہاری امامت کرے۔ چنانچہ ان میں جو شخص سب سے کم سن تھا وہی امام مقرر ہوا کیونکہ اس کو قرآن زیادہ یاد تھا۔(۲)

حضرت ابومسعود انصاریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جماعت کی امامت وہ شخص کرے جو ان میں سب سے زیادہ کتاب اللہ کا پڑھنے والا ہو (یعنی جو شخص کتاب اللہ کا علم اور اس سے تعلق سب سے زیادہ رکھتا ہو) اگر اس میں سب یکساں ہوں تو پھر وہ شخص امامت کرے جو سنت کا زیادہ علم رکھتا ہو، اور اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو وہ امامت کرے جس نے ہجرت پہلے کی ہو۔ اور اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو پھر وہ شخص امامت کرے جو عمر میں بڑا ہو۔''(۳)

معلوم ہوا کہ امام کا صاحب علم بالخصوص عالم قرآن ہونا ہر چیز پر مقدم ہے۔ آج

---

(۱) بخاری، ج ۱، ص ۸۸

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اس لیے فرمایا کہ جس کو قرآن زیادہ یاد ہو وہ امامت کرے۔

(۳) بخاری، ج ۱، ص ۱۰۰

Marfat.com

بدقسمتی سے ہر نمازی خود کو امامت کا اہل سمجھتا ہے، علماء پر قرّاء (قاریوں) کو برتری حاصل ہے اور علم و سیرت کے مقابلے میں صورت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز ایک بے روح رسمی عمل بن کر رہ گئی ہے اور نماز با جماعت کے سارے مصالح ضائع ہو چکے ہیں۔

امام کے فرائض

امام کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ آغاز نماز سے پہلے درج ذیل امور کا ہمیشہ لحاظ رکھے:

(۱) خوب اچھی طرح دیکھ لے کہ صفیں درست ہیں یا نہیں، اگر درست نہ ہوں تو درست کرائے۔ صفوں کا سیدھا ہونا اقامتِ صلوٰۃ میں داخل ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

سووا صفوفكم فان تسوية الصفوف من اقامت الصلوة (۱)

''اپنی صفوں کو سیدھا رکھو اس لیے کہ صفوں کا سیدھا رکھنا اقامتِ صلوٰۃ میں سے ہے۔''

صفوں کی درستی کے معنی یہ ہیں کہ ایک نمازی کا کندھا دوسرے نمازی کے کندھے سے ملا رہے، آگے پیچھے نہ ہو۔ ابو مسعود انصاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے کندھوں کو پکڑتے اور فرماتے، سیدھے رہو اور مختلف نہ رہو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے (فتختلف قلوبكم)۔'' (۲)

جس طرح کندھے سے کندھا ملنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قدم بالکل قریب قریب اور ایک دوسرے کی سیدھ میں ہوں اور درمیان میں جگہ خالی نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اپنی صفوں کو خوب ملاؤ اور قریب قریب کھڑے ہو اور گردنیں ایک دوسرے کے برابر کے رخ پر رکھو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، شیطان کو دیکھتا ہوں کہ وہ صفوں کے درمیان داخل ہوتا ہے گویا وہ بھیڑ کا بچہ ہے۔'' (۳)

---

(۱) بخاری، ج ۱ص ۱۰۰

(۲) مسلم، ج ۱ص ۱۸۱

(۳) ابو داؤد، ج ۱ص ۱۱۳۔ یہ دراصل اتحاد و اخوت کی تعلیم ہے جو مسلمانوں نے ضائع کر دی ہے۔

Marfat.com

(۲) امام یہ بھی دیکھ لے بلکہ پہلے سے ہدایت دے کہ اگلی صف میں صرف وہ لوگ کھڑے ہوں جو عاقل و دانا ہوں اور پھر اسی نسبت سے دوسری صفوں کی ترتیب قائم ہو۔ عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''تم میں سے وہ لوگ میرے قریب کھڑے ہوں جو عقل و شعور میں بالغ ہوں (اولوالاحلام والنھی) پھر وہ جو ان سے ملتے ہوں۔ نبی ﷺ نے یہ بات تین بار ارشاد فرمائی۔''(۱)

(۳) صفوں کی درستی کے بعد امام نماز پڑھائے اور اس بات کا خیال رکھے کہ وہ زیادہ طویل نہ ہو کہ نماز میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے:

''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے اس لیے کہ جماعت میں ضعیف، بیمار، بوڑھے ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور جب تنہا نماز پڑھے تو جتنا چاہے طول دے (فلیطول ما شاء)''(۲)

امام اپنے مذکورہ فرائض کو اسی وقت ٹھیک طور پر انجام دے سکتا ہے جب مقتدی کو بھی معلوم ہو کہ اس کے فرائض کیا ہیں۔ مقتدی کے فرائض میں اوّلین چیز امام کی مکمل اطاعت ہے۔ رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ، سلام غرضیکہ ہر فعل نماز میں امام کی پیروی نمازیوں پر واجب ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ایک روز ہم لوگوں کو نماز پڑھائی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، اے لوگو! میں تمہارا امام ہوں۔ پس رکوع، سجدہ اور قیام میں مجھ پر سبقت نہ کرو۔''(۳)

امام کی مخالفت کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ: کیا وہ شخص ڈرتا نہیں جو اپنا سر امام سے پہلے اٹھالیتا ہے کہ اللہ اس کے سر کو

---

(۱) مسلم ج ۱ص ۱۸۱، معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں قیادت کے منصب پر اس شخص کو فائز ہونا چاہیے جو صاحب علم و فضل ہو اور صاحب کردار بھی، اور اس کے قریب جو لوگ ہوں وہ بھی علم و کردار کے لحاظ سے بلند حیثیت رکھتے ہوں۔

(۲) بخاری، ج ۱ص ۹۷

(۳) مسلم، ج ۱ص ۱۸۰

Marfat.com

گدھے کا سر بنا دے۔" (یحول اللّٰہ راسہ راس حمار)(۱)

امام کی پیروی اس حد تک ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص تاخیر سے آئے تو امام جس حال میں ہو فوراً اس کی اقتدا کرے۔(۲) مثلاً اگر وہ سجدہ میں ہے تو فوراً ہی سجدے میں چلا جائے۔(۳)

تین بڑی اجتماعی نمازیں

معلوم ہے کہ اسلام میں انفرادی نمازوں کے مقابلے میں اجتماعی نمازوں کو، جو دن کے پانچ اوقات میں ادا کی جاتی ہیں، زیادہ اہمیت حاصل ہے یہ دراصل نمازیوں کا یومیہ پنجگانہ اجتماع ہے۔ ہفتہ کے اختتام پر ایک بڑی اجتماعی عبادت ہوتی ہے، یعنی نماز جمعہ۔ یہ ہفتہ وار اجتماع قصبہ یا شہر کی سب سے بڑی مسجد (مسجدِ جامع) میں ہوتا ہے تاکہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایک جگہ جمع ہو کر نماز پڑھیں اور اجتماع کے روحانی اور مادی فائدے حاصل کریں۔ اس طرح یومیہ اور ہفتہ وار اجتماعی عبادت کا سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ماہ صیام کے ختم ہونے پر ایک زیادہ بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع کا نام نمازِ عید الفطر ہے۔ یہ گویا سالانہ اجتماع ہے۔ اس بڑے اجتماع کے دو مہینے دس دن کے بعد ایک اور بڑا اجتماع منعقد ہوتا ہے جو نمازِ عید الاضحیٰ کے نام سے موسوم ہے۔

صلوٰۃ جمعہ

اسلام سے پہلے جمعہ کے دن کو یوم العروبہ کہا جاتا تھا۔ اس دن کا نام جمعہ اس لیے رکھا گیا کہ یہ ہفتہ کے اجتماع کا دن ہے اور مسلمان اس دن بڑی تعداد میں جمع ہو کر نماز ادا

---

(۱) مسلم، ج ا ص ۱۸۱

(۲) ترمذی ج ا ص ۷۶

(۳) ترمذی، ج ا ص ۷۶، ابن ماجہ ص ۶۱۔ امام کی اقتداء کی یہ ہدایت صرف مسجد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں مسجد سے باہر کی زندگی بھی داخل ہے۔

Marfat.com

کرتے ہیں۔(۱) نمازِ جمعہ کب واجب ہوئی اس میں اختلاف ہے۔امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ مکہ ہی میں رسول اللہ ﷺ کو نماز جمعہ کی اجازت مل گئی تھی لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔لیکن جب مسلمان بڑی تعداد میں ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے تو رسول اللہ نے مصعب بن عمیرؓ کو، جو مدنی مسلمانوں کے معلّم تھے، ہدایت کی کہ وہ جمعہ کے دن سورج ڈھلنے کے بعد مسلمانوں کو جمع کر کے نماز پڑھائیں۔(۲)

نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلا جمعہ بنو سالم بن عوف کی بستی میں پڑھا۔(۳) بخاری میں عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد دوسری مسجد، جس میں سب سے پہلے جمعہ کی نماز ادا کی گئی، بحرین کے جواثی نامی شہر میں واقع مسجد عبدالقیس تھی۔(۴)

صلوٰۃِ جمعہ کی اہمیت

اسلام میں نمازِ جمعہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔یہود و نصاریٰ کے یہاں سنیچر اور اتوار کے دن بالترتیب بابرکت خیال کیے جاتے ہیں اور وہ اس دن اپنے اپنے معبدوں میں جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں۔یہ دن ایک طرح سے ان کے مذہبی وقومی شعار کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔اسلام میں یہی حیثیت جمعہ کے دن کو حاصل ہے۔قرآن مجید کی ایک سورہ کا نام ہی سورۃ الجمعہ ہے اور اس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس ہفتہ وار اجتماع میں پورے عبادتی جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوں۔ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

(سورہ جمعہ:۹)

''اے ایمان والو! جب تمہیں جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر

---

(۱) دیکھیں، لسان العرب بذیل مادہ جمع، مفردات القرآن (راغب) بذیل مادہ

(۲) الدر المنثور، ج ۶ ص ۲۱۸، روح المعانی، ج ۲۸ ص ۱۰۰، بیضاوی ۲/۳۳۳

(۳) سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۴۹۴ (یہ جمعہ بطن وادی کی مسجد میں ادا کیا گیا۔الدر المنثور، ج ۶ ص ۲۱۸)

(۴) بخاری، ج ۱ ص ۱۲۲

Marfat.com

کی طرف تیز گامی دکھاؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اس میں تمہارے لیے بھلائی ہے اگر تم جانو۔"

نماز جمعہ میں صرف شرکت ہی ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے اہتمام بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ اس دن غسل کو واجب کیا گیا ہے۔ ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ مسلمان پر واجب ہے (غسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم)" (۱)

اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جو روایت ہے اس میں غسلِ جنابت کے الفاظ بھی ہیں (۲) یعنی یہ غسل اس طرح لازمی ہے جس طرح جنابت کی حالت میں غسل لازمی ہوتا ہے۔ اس دن صاف ستھرے کپڑے پہننا اور خوشبو لگانا بھی اہتمامِ جمعہ میں داخل ہے۔ ایک روایت کے مطابق نبی ﷺ نے ایک جوڑا کپڑا جمعہ کے لیے مخصوص فرما دیا تھا۔ (۳)

نماز جمعہ کی اس اہمیت کی وجہ سے مسلمانوں کو ترکِ جمعہ سے منع کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جس نے تین جمعہ کسی عذر اور بیماری کے بغیر چھوڑ دیا تو اللہ اس کے قلب پر مہر کر دے گا۔ (۴) ایک دوسر حدیث میں ارشاد ہوا ہے: "لوگ ترکِ جمعہ سے باز آ جائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر مہر لگا دے گا اور وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے۔" (۵) تارکینِ جمعہ کے بارے میں نبی ﷺ کا یہ سخت ترین قول بھی مروی ہے: "میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ایک آدمی کو نماز پڑھانے کا حکم دوں پھر جا کر ان لوگوں کے گھروں کو ان کے ساتھ آگ لگا دوں جو نماز جمعہ چھوڑ کر بیٹھ رہے ہیں۔" (۶)

---

(۱) موطا، باب العمل فی غسل یوم الجمعة (اخرجہ البخاری و مسلم)

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً، باب الھیئة وتخطی الرکاب واستقبال الامام یوم الجمعة

(۴) ایضاً، کتاب الصلوٰة، باب القراءة فی صلوٰة الجمعة والاحتباء ومن ترکھا من غیر عذر (اخرجہ ابوداؤد والترمذی وغیرھم)

(۵) صحیح مسلم

(۶) ایضاً، بخاری میں بھی یہ روایت ہے لیکن نماز جمعہ کی تصریح کے ساتھ نہیں ہے۔ (دیکھیں، ج ۱، ص ۸۹) بعض رواجوں میں نماز عشاء کا ذکر ہے۔

Marfat.com

تنہا اس روایت سے بالکل واضح ہے کہ نماز جمعہ کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے۔ جو شخص کسی عذر کے بغیر نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتا وہ محض ترک جمعہ کا قصوروار نہیں ٹھہرتا بلکہ اپنے اس عمل سے مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

صلوٰۃ جمعہ کی اہمیت کے وجوہ

اسلام میں نماز جمعہ کی اہمیت کی ایک وجہ تو خود اس دن کی فضیلت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

> ''سب سے عظیم دن (سید الایام) اللہ کے نزدیک جمعہ کا دن ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ دن یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ سے بھی بڑا ہے۔ اس کی پانچ خوبیاں ہیں۔ اس دن اللہ نے آدم کو پیدا کیا، اسی دن اللہ نے ان کو زمین پر اتارا اور اسی دن انہیں کو وفات دی۔ اس دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں بندۂ مسلم اللہ سے جو چیز بھی مانگتا ہے اللہ اسے عطا کرتا ہے بشرطیکہ وہ حرام شے نہ ہو۔ اسی دن قیامت آئے گی۔ مقرب فرشتے، ہوائیں، دریا، پہاڑ اور شجر سب اس دن خائف رہتے ہیں۔'' (۱)

نماز جمعہ کی اہمیت کی دوسری وجہ اس کا تعلیمی و تذکیری پہلو ہے۔ اگر کوئی مسلمان پابندی کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک ہو تو وہ بآسانی توحید، عبادات اور اخلاق و معاملات سے متعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بقدرِ ضرورت واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عام لوگوں کی دینی تعلیم کا اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن آج اماموں کے جہل و غفلت اور عام مسلمانوں کی بے توجہی کی وجہ سے خطبۂ جمعہ کا تعلیمی و تذکیری پہلو بالکل مفلوج و معطل ہے۔

نماز جمعہ کی اہمیت اس پہلو سے بھی ہے کہ یہ مسلمانوں کا ہفتہ وار اجتماع ہے جس میں وہ بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ اس اجتماع سے ان میں باہم اتحاد و اتفاق اور دینی اخوت کے رشتے مضبوط ہوتے ہیں اور ایک امام کی قیادت میں زندگی بسر کرنے کا درس

---

(۱) مسند احمد، ۳/۴۳۰، ابن ماجہ (۱۰۸۴) حدیث حسن ہے۔

Marfat.com

ملتا ہے۔لیکن اس مادی فائدے سے بھی مسلم سماج بڑی حد تک محروم ہو چکا ہے۔

خطبۂ جمعہ کی اہمیت

کم ہی مسلمان اس بات سے واقف ہوں گے کہ نماز جمعہ میں، جو دراصل ظہر کی جگہ پر ہے، چار کے بجائے دو رکعتیں کیوں رکھی گئی ہیں؟ اس تخفیف کی وجہ خطبہ ہے جو دو رکعت کا بدل ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ خطبہ جزءِ نماز ہے۔قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ الخ۔ (سورہ جمعہ:۹)

''اے ایمان والو! جب تمہیں جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف تیز گامی دکھاؤ۔''

علماء تفسیر کہتے ہیں کہ آیت میں ''ذکر'' سے مراد خطبہ ہے۔احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔حضرت ابوہریرہؓ سے ایک حدیث مروی ہے جس کے آخری الفاظ ہیں:

فاذا خرج الامام حضرت الملائکة یستمعون الذکر (۱)

''جب امام (جمعہ کے دن خطبہ دینے کے لیے) نکلتا ہے تو فرشتے ذکر (خطبہ) سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔''

اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ سلف سے شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ مذکورہ آیت، قرأت فی الصلوۃ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اور بعض کا خیال ہے کہ اس کا تعلق خطبہ سے ہے۔امام احمدؒ کا بیان ہے کہ یہ نماز اور خطبہ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس پر لوگوں کا اجماع ہے۔(۲) اس ذکر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ابن شہابؒ فرماتے ہیں:

فخروج الامام یقطع الصلوٰۃ و کلامه یقطع الکلام (۳)

''امام کا (خطبہ دینے کے لیے) نکلنا نماز کو اور اس کا خطبہ (ہر طرح کی) گفتگو کو ختم

---

(۱) موطا، کتاب الصلوۃ، باب العمل فی غسل یوم الجمعۃ، مزید دیکھیں، بخاری، ج ۱، ص ۱۲۷

(۲) فتاوی ابن تیمیہؒ، ج ۲۳، ص ۲۶۹

(۳) موطا، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی الانصات یوم الجمعۃ والامام یخطب

Marfat.com

کر دیتا ہے۔"

ایک روایت میں ہدایت کی گئی ہے کہ نمازی خطبہ کی طرف کان لگائے رکھیں اور خطیب کے وعظ وتذکیر کو پوری توجہ اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ سنیں۔(۱) دوران خطبہ میں ہر طرح کی گفتگو سے منع کیا گیا ہے یہاں تک کہ کسی بولنے والے کو زبان سے منع کرنا بھی ممنوع ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

اذا قلت لصاحبك انصت و الامام يخطب يوم الجمعة فقد لغوت (۲)

"جمعہ کے دن جب امام خطبہ دے رہا ہو تو تمہارا کسی پہلونشین سے یہ کہنا کہ "چپ رہو" ایک لغو بات ہے۔"

ہدایت کی گئی ہے کہ اگر کسی کو گفتگو سے منع کرنا ضروری ہو تو اشارے سے منع کیا جائے۔ حضرت نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ نے دو آدمیوں کو خطبہ کے دوران میں بات چیت کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی طرف کنکری پھینک کر خاموش ہو جانے کے لیے کہا۔(۳) ثعلبہ بن ابی مالک القرضیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ منبر پر آکر بیٹھ جاتے اور مؤذن اذان کہتا اور ہم لوگ بیٹھے بات چیت کرتے رہتے لیکن مؤذن جیسے ہی اذان سے فارغ ہوتا اور حضرت فاروقؓ خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے تو ہم لوگ خاموش ہو جاتے اور پھر ہم میں سے کوئی گفتگو نہ کرتا تھا۔(۴)

ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جس نے جمعہ کے دن خطبہ کے دوران بات چیت کی وہ اس گدھے کی طرح ہے جس پر بوجھ لدا ہوا

---

(۱) بخاری، باب الاستماع الی الخطبہ عن ابی ہریرہؓ

(۲) موطا، کتاب الصلوۃ، باب: ماجاء فی الانصات یوم الجمعۃ والامام یخطب۔ مزید دیکھیں، بخاری ج۱، ص ۱۲۸ و مسلم ج۱ص ۲۸۱

(۳) موطا، باب: ماجاء فی الانصات یوم الجمعۃ والامام یخطب

(۴) ایضا

Marfat.com

ہو (اور وہ اپنی آواز نکال رہا ہو) اور جو شخص اس سے کہے کہ "خاموش رہو" اس کا جمعہ ہی نہیں۔ (۱) یہ اور متذکرہ بالا دوسری روایات سے خطبۂ جمعہ کی اہمیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

خطبۂ جمعہ کی غرض وغایت

خطبۂ جمعہ کی واحد غرض ذکر و نصیحت ہے اور یہ بات نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کے طرز عمل سے بالکل ثابت ہے۔ ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ:

کان للنبی خطبتان یجلس بینھما، یقرأ القرآن ویذکر الناس۔ (۲)

"نبی ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے جن کے درمیان میں آپ بیٹھتے، قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحتیں کرتے تھے۔"

نبی اکرم ﷺ جب خطبہ دیتے تو آپ پر وہ تمام کیفیتیں طاری ہوتی تھیں جو ایک مخلص اور خیر خواہ داعیِ دین پر طاری ہونی چاہئیں۔ حضرت جابرؓ نے آپ کے خطبہ کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

کان النبی اذا خطب احمرت عیناہ وعلا صوتہ حتی کانہ منذر جیش یقول صبحکم ومساکم۔ (۳)

"نبی ﷺ جب خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور آواز بلند ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی لشکر سے ڈرا رہے ہوں کہ صبح کو اس کا حملہ ہونے والا ہے یا شام کو۔"

نبی ﷺ اپنے خطبوں میں خدا کی حمد و ثنا کے بعد اسلام کے بنیادی اصول اور شریعت کی تعلیم دیتے اور اگر امر و نہی کا کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو امر و نہی فرماتے، غرضیکہ

---

(۱) مشکوٰۃ، ج ۱، ص ۱۲۳

(۲) صحیح مسلم، عن جابر بن سمرۃؓ

(۳) صحیح مسلم

Marfat.com

مصالحِ امت کا ہر طرح سے لحاظ فرماتے تھے۔(۱)

عبداللہ بن ابی اوفیؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز لمبی اور خطبہ مختصر ہوتا تھا۔(۲) ایک روایت میں آپ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا امام کے تفقہ کی دلیل ہے۔(۳)

خطبۂ جمعہ کے مصالح سے غفلت:

خطبۂ جمعہ کی اس اہمیت اور اس کی غرض و غایت کو سامنے رکھیں اور پھر ہندوستان کی مساجد میں جو تحریری خطبے پڑھے جاتے ہیں ان پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی نگاہ سے خطبۂ جمعہ کی حقیقت بالکل اوجھل ہو چکی ہے۔ ان خطبوں کو عہد نبوی اور عہد صحابہ کے خطبوں سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ اکثر خطیبوں کی جہالت و بے خبری کا عالم یہ ہے کہ وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا چیز پڑھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کب کی ختم ہو چکی اور مسلم بادشاہ کب کے پیوندِ خاک ہوئے لیکن ہمارا خطیب اب بھی اپنے خطبوں میں ان کے ملک و اقتدار کی بقا کے لیے دعا کرتا ہے (خلد اللّٰہ ملکه و سلطانه)۔ خطبۂ جمعہ کے مصالح سے مسلمانوں کی غفلت و کوتاہ اندیشی کا ماتم کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> ''جمعہ کا اجتماع اور خطبہ مسلمانوں کے لیے فلاحِ دارین کا وسیلۂ عظمیٰ تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک بار لوگوں کو ان کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایات و ارشادات کی دعوت دی جائے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک دائمی ذریعہ ہو۔
>
> خطبہ دراصل ایک وعظ تھا جیسا کہ وعظ ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کے بعد خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام کا بھی یہی حال رہا... لیکن اب خطبہ کے معنی یہ رہ گئے ہیں کہ عربی زبان میں ایک چھپی ہوئی کتاب جو بازار سے خرید لی جائے اور الف لیلہ کی طرح

---

(۱) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، ج ۱، ص ۱۱۵

(۲) نسائی، ج ۱، ص ۲۰۹

(۳) صحیح مسلم، ج ۱، ص ۲۸۶

Marfat.com

اسی میں سے ایک خطبہ غلط سلط پڑھ کر سنا دیا جائے... بسا اوقات غریب پڑھنے والا بھی نہیں جانتا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں... پھر سننے والوں کی مصیبت کا کیا پوچھنا، کوئی اونگھتا ہے، کوئی اپنے ساتھیوں سے صبح کے بازار کا بھاؤ پوچھتا ہے۔

یہ تمسخر انگیز تذلیل و تحقیر ہے اس مذہب عظیم کے اعمال دینیہ کی جس کے داعی اول نے اپنے خطبات و مواعظ سے ایک بادیہ نشیں قوم کو روم و ایران کے تمدن کا مالک بنا دیا۔"(۱)

کیا خطبۂ جمعہ غیر عربی زبان میں دینا جائز ہے؟

خطبۂ جمعہ کا جو مقصد ہے، یعنی تعلیم و تذکیر، وہ صرف اس صورت میں کما حقہٗ پورا ہو سکتا ہے جب خطبہ سامعین کی مادری زبان میں دیا جائے۔ لیکن اندھی تقلید میں مبتلا بہت سے علماء کا خیال ہے کہ عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں خطبۂ جمعہ دینا جائز نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ماضی میں خطبۂ جمعہ غیر عربی زبان میں نہیں دیا گیا جب کہ بہت سے ملکوں میں مسلمانوں کی زبان عربی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر آج غیر عربی زبان میں خطبہ دینے کو صحیح مان لیا جائے تو کل کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ نماز بھی نمازیوں کی مادری زبان میں ادا کی جائے۔

یہ دونوں ہی دلیلیں قلتِ فہم پر مبنی ہیں۔ ماضی میں اگر خطبہ غیر عربی زبان میں نہیں دیا گیا تو یہ کوئی وحی نہیں ہے، جس کی ہر حال میں پیروی کی جائے۔ میں کہوں گا کہ اس باب میں اسلاف کا طرز عمل صحیح نہیں تھا اس لیے آج بھی اس غلط رواج کو جاری رکھنا کوئی دانشمندی کی بات نہ ہوگی۔ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ نماز جمعہ کے اہتمام کے باوجود مسلمان اس کے روحانی اور مادی دونوں فائدوں سے محروم ہیں۔

رہی دوسری دلیل تو وہ اور بھی زیادہ لچر ہے۔ نماز میں قرآن مجید کی سورتیں پڑھی جاتی ہیں اور ان کا کوئی بدل ممکن نہیں جب کہ خطبہ کا بڑا حصہ انسانی کلام پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا بدل کوئی دوسری زبان بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر نمازی کے لیے ممکن ہے کہ وہ نماز میں پڑھی جانے والی چھوٹی چھوٹی سورتوں کے معنی و مفہوم کو سمجھ کر ان کو زبانی یاد کر لے۔ لیکن

---

(۱) الھلال، بحوالہ تحقیق سید و سادات، مولفہ محمود احمد عباسی ص ۲۵۴-۲۵۷

Marfat.com

خطبے کی عبارتیں طویل ہوتی ہیں اور حالات وضروریات کے لحاظ سے ان کے مضامین بدلتے رہتے ہیں یا بدلنے چاہئیں اس لیے عام لوگوں کے لیے نہ تو ان کی تفہیم ممکن ہے اور نہ آسانی کے ساتھ ان کو یاد ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ غیر عربی زبان میں خطبہ دینے سے کسی فتنہ کا دروازہ کھل سکتا ہے محض ایک واہمہ ہے۔ جو لوگ اس قسم کے واہمے میں مبتلا ہیں وہ اسلام اور مسلمان دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں اور اس کی وجہ اندھی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس معاملے میں معتدل طرز عمل یہ ہوگا کہ پہلا خطبہ سامعین کی مادری زبان میں دیا جائے اور دوسرا خطبہ عربی میں ہو۔ اس کام کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ نماز جمعہ کا خطیب ایسا شخص ہو جو عربی زبان جانتا ہو اور ساتھ ہی سامعین کی مادری زبان میں تقریر کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ جہلاء یا نیم خواندہ مولویوں کو خطیب بنانا نماز جمعہ اور اس کے خطبہ کے استخفاف کے ہم معنی ہے۔

کیا دیہات میں نماز جمعہ جائز ہے؟

اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ احناف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز جمعہ بڑے شہروں کے ساتھ مخصوص ہے اور دیہات میں اس کی ادائیگی صحیح نہیں ہے۔ امام ثوریؒ کا بھی یہی خیال ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک ہر اس بستی میں جمعہ ادا کیا جاسکتا ہے جہاں آبادی زیادہ ہو اور بازار ہو۔ امام اوزاعیؒ کا خیال ہے کہ نماز جمعہ ہر اس مسجد میں جائز ہے جہاں پانچ اوقات میں نماز باجماعت ہوتی ہے۔ فقہ شافعی کے مطابق صرف اس بستی میں نماز جمعہ پڑھی جاسکتی ہے جہاں دور تک مکانات بنے ہوں اور لوگ ان میں مستقل طور پر سکونت رکھتے ہوں اور چالیس یا اس سے زیادہ عاقل وبالغ مرد اس میں موجود ہوں۔

راقم کے خیال میں چونکہ نماز جمعہ ایک ہفتہ وار اجتماع ہے اس لیے ہر مسجد میں اس کو ادا کرنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ شہر یا قصبہ یا بڑے دیہات کی اس مسجد میں نماز جمعہ ادا کی جائے جو سب سے بڑی ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان وہاں جمع ہوسکیں اور وعظ ونصیحت سے مستفید ہوں۔ چھوٹے دیہات میں صرف اسی صورت میں نماز جمعہ پڑھی جاسکتی ہے

Marfat.com

جب شہر یا قریبی قصبے تک پہنچنے میں کوئی واقعی دشواری حائل ہو، مثلاً طولِ مسافت اور راستے کی خرابی وغیرہ، بشرطیکہ تعلیم یافتہ امام وخطیب موجود ہوں۔

صلوٰۃِ عیدین

دنیا کی ہر قوم نے سال کے چند متعین دنوں کو اجتماعی طور پر خوشی کے اظہار کے لیے مقرر کیا ہے، جن کو عرف عام میں تہوار کہا جاتا ہے۔ ان تہواروں میں بالعموم لطف ومسرت کا اظہار شائستہ حدوں سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہندوستان میں ہندوؤں کا تہوار ہولی ہے جس میں ہر طرح کی بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے اپنے پیروؤں کے لیے خوشی کے جو دو دن مقرر کیے ہیں، یعنی عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ (بقرعید) وہ تہذیب اور شائستگی کے اعتبار سے مثالی تہوار ہیں۔

عیدین کی حقیقت اور ان کی غرض وغایت

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اسلام نے انسانی فطرت کی رعایت کرتے ہوئے سال کے دو دن اس بات کے لیے مخصوص کیے ہیں کہ اہل ایمان اجتماعی طور پر خوشی کا اظہار کریں اور یہ دو دن ان کے قومی شعار قرار پائیں۔ حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اس وقت دو دن ایسے تھے جن میں اہل مدینہ اجتماعی طور پر اظہارِ مسرت کرتے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ دو دن کیسے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ایامِ جاہلیت میں ہم ان دنوں میں کھیل کود وغیرہ کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے تم کو ان سے بہتر دو دن عطا کیے ہیں، یعنی یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر۔'' (۱)

لیکن ان دو مواقع پر بھی عبادت کو لازم کیا گیا تاکہ اگر ایک طرف ایک حد کے اندر انسانی فطرت کی تسکین کا سامان فراہم ہو، یعنی خوشی کا مظاہرہ، تو دوسری طرف نفس کو بے راہ روی کا موقع بھی نہ ملے۔ گویا اسلام میں تہوار بھی عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور یہی چیز

---

(۱) ابوداؤد، (رقم ۱۱۳۴) روایت کے الفاظ ہیں: فقال رسول اللہ، قد ابدلکم اللہ بھما خیرا منھما، یوم الاضحی ویوم الفطر

Marfat.com

اس کو دوسری قوموں کے تہواروں سے ممتاز کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اسلام فی الواقع دینِ فطرت ہے۔

جس طرح جمعہ میں مسلمانوں کے لیے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اس کو اپنے شہر یا قصبے کی سب سے بڑی مسجد میں ادا کریں، اسی طرح عیدین میں ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عام مساجد کے بجائے کھلے اور وسیع میدانوں (عیدگاہوں) میں جمع ہوں تا کہ اس سے ان کی کثرت تعداد، ملّی شان وشوکت اور قومی اتحاد واخوّت ظاہر ہو۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

> ''ہر ملت کے لیے ایک ایسا مظاہرہ اور اجتماع ضروری ہوتا ہے جس میں اس کے ماننے والے جمع ہوں تا کہ ان کی کثرت تعداد اور شان وشوکت کا اظہار ہو۔ اسی لیے عیدین میں تمام اہل ایمان حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کا نکلنا بھی شارع علیہ السلام نے مستحب قرار دیا ہے۔ اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ عیدگاہ تک ایک راستہ سے جاتے اور دوسرے راستہ سے واپس آتے تھے تا کہ مسلمانوں کی شان وشوکت کی تصویر دونوں طرف کے لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔''(۱)

عیدین کے باب میں مسلمانوں کا موجودہ طرزِ عمل

جس طرح مسلمان نماز جمعہ کے مقاصد ومصالح سے غافل ہیں اسی طرح انھوں نے عیدین کی حقیقت اور ان کی غرض وغایت سے بھی نادانستہ چشم پوشی کر رکھی ہے۔ وہ بالکل نہیں جانتے کہ وہ کیوں اپنے پاس پڑوس کی مسجدوں کو چھوڑ کر عیدگاہوں میں، جو بالعموم شہر یا قصبے سے باہر ہوتی ہیں، جمع ہوتے ہیں۔ اس موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ بھی خطبۂ جمعہ کی طرح عربی میں ہوتا ہے جس کو بالعموم نہ امام سمجھتا ہے اور نہ ہی مقتدی۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس اجتماع میں تارکِ روزہ مسلمان بھی شریک ہوتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ اچھے لباس میں اور زیادہ خوش وخرم نظر آتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ عیدین کو صرف ایک قومی تہوار سمجھتے ہیں۔ کاش وہ جانتے کہ یہ روزہ داروں کی خوشی کا

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ج۲، ص۵۰ (العیدان)

Marfat.com

دن ہے نہ کہ تارکینِ روزہ کا۔(۱)

عید الاضحیٰ (بقرعید) کا حال عید الفطر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اکثر مسلمان قربانی کی حقیقت اور اس کی غرض وغایت سے بالکل بے خبر ہیں۔ اب قربانی محض اظہارِ امارت کے لیے کی جاتی ہے۔ بہت سے مسلمان طعنۂ بخل سے بچنے کے لیے قربانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قربانی کا گوشت غربا ومساکین میں تقسیم کرنے کے بجائے اس کا بڑا حصہ وہ مختلف حیلوں سے خود کھا جاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ الم ناک بات یہ ہے کہ بہت سے دینی مدارس کے لوگ محض چمڑے کے لیے جانور ذبح کرکے اس کا گوشت زمین کے اندر دفن کردیتے ہیں۔ قربانی کے نام پر یہ بدترین قسم کی دنیا پرستی ہے۔

قربانی جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ کی سنّت کی پیروی ہے۔ معلوم ہے کہ انھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں اپنے محبوب بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان کرنے کا ارادہ کرلیا تھا لیکن اللہ نے آپ کو قربان ہونے سے بچالیا کہ اصل مقصود امتحان تھا، جس میں باپ اور بیٹے دونوں کامیاب رہے۔ جانور کی قربانی دراصل جان کا فدیہ ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ○

(سورہ الصافات:۱۰۷، ۱۰۸)

''اور ہم نے اس کو ایک عظیم قربانی کے عوض چھڑالیا، اور ہم نے اس کے طریقے پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔''

آیت میں ذبحِ عظیم سے مراد وہ قربانی ہے جو مناسکِ حج میں شامل ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے آج تک ایک دائمی یادگار کے طور پر باقی ہے اور اسی کی پیروی میں دنیا کے سارے مسلمان اس موقع پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ اپنے اس عمل سے وہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نفس کے بجائے خدا کے تابعِ فرمان ہیں یہاں تک کہ اس کے حکم پر وہ اپنی عزیز جان بھی اس کی راہ میں قربان کرسکتے ہیں۔ یہی قربانی کی حقیقت ہے۔ ارشاد

---

(۱) عید الفطر کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ روزہ داروں کی خوشی کا دن ہے، تارکین صوم کے لیے تو یہ ماتم کا دن ہوتا ہے۔

Marfat.com

ہوا ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ ط

(سورہ حج:۳۷)

''اللہ تک ان جانوروں کا نہ خون پہنچتا ہے اور نہ ان کا گوشت بلکہ اس تک جو چیز پہنچتی ہے وہ تمہارا تقویٰ (جذبۂ فرماں برداری) ہے۔''

قربانی کے جانور کے گوشت کے بارے میں واضح لفظوں میں ہدایت دی گئی ہے:

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُھَا فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ط

(سورہ حج:۳٦)

''پس جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور قانع محتاجوں اور سائلوں کو بھی کھلاؤ۔''

قربانی کا ایک بڑا مصرف محتاجوں اور سائلوں کو گوشت کھلانا ہے جو عہد نبوی میں عام غربت کی وجہ سے بالکل نمایاں تھا، لیکن موجودہ دور میں یہ مصرف اس درجے میں باقی نہیں رہا۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ قربانی میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے۔ ایک گھر یا خاندان کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔(۱)

بعض فقہاء کے اس خیال سے راقم کو اختلاف ہے کہ قربانی ان تمام مسلمانوں پر واجب ہے جو صاحبِ نصاب ہیں۔ اس قول کے حق میں ان کے پاس قرآن وسنت کی کوئی واضح نص موجود نہیں ہے۔ قربانی فی الواقع حجاجِ کرام پر واجب ہے نہ کہ عام مسلمانوں پر، اور حجاج میں بھی صرف ان پر جو حج وعمرہ دونوں سے مستفید ہوتے ہیں یعنی حجِ تمتع۔ معلوم ہے کہ حج کی ایک قسم حجِ قران ہے اور اس میں قربانی واجب نہیں ہے۔ جب حجاج کے ایک مخصوص

---

(۱) حضرت ابوایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ ''ہم اپنے تمام گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرتے تھے۔ اس کے بعد لوگ فخر سمجھ کر ہر ایک کی طرف سے قربانی کرنے لگے (موطا، باب الشرکۃ فی الضحایا) امام مالک، امام شافعی، امام احمد کا قول یہ ہے کہ ایک بکری سارے گھر والوں کی طرف سے کافی ہے۔ احناف کے نزدیک یہ کافی نہیں ہے۔

Marfat.com

گروہ پر یہ واجب نہیں ہے تو پھر عام مسلمان پر کیوں واجب ہوگی۔ روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے لوگوں نے قربانی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ وہ مرغ کی قربانی کریں گے اور یہ بھی فرمایا کہ اب لوگ محض دکھاوے کے لیے قربانی کرنے لگے ہیں۔(۱)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر حاجی لوگ قربانی نہ کریں۔ چونکہ عیدالاضحیٰ کی حیثیت ایک قومی تہوار کی ہے اس لیے بقدر ضرورت اس موقع پر قربانی ضرور کی جائے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر کہا، اس میں نمود و نمائش کا جذبہ شامل نہ ہو اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ جانور ذبح کیے جائیں۔ اگر اصحابِ ثروت ایک سے زیادہ جانور ذبح کرنا چاہیں تو اس کی متبادل صورت یہ ہے کہ ایک جانور ذبح کر کے سنتِ ابراہیمی ادا کر لی جائے اور بقیہ جانوروں کی رقم صدقہ کر دی جائے تاکہ سماج کے غربا و مساکین کی دوسری ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ صرف چمڑے کی خاطر جانور ذبح کرنا اور ان کا گوشت ضائع کر دینا، جیسا کہ بہت سے دینی مدارس کرتے ہیں، بدترین فعل ہے اور سنتِ ابراہیمی کے ساتھ کھلواڑ کے مترادف ہے۔ چرمِ قربانی کے سلسلے میں راقم کا خیال ہے کہ اس کو دینی مدارس کو دینے کے بجائے قومی فلاح و بہبود کے کاموں، مثلاً فسادات اور دوسری ارضی وسماوی آفات کے متاثرین کی امداد کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد، جن میں دینی مدارس کے لوگ بھی شامل ہیں، اس مسئلے پر غور کریں تاکہ ایک اہم قومی مسئلہ کا حل نکل سکے۔

مساجد کی حیثیت

موجودہ دور کے مسلمانوں نے جہاں نماز کے روحانی، اخلاقی اور سماجی پہلوؤں کو غیر شعوری طور پر نظر انداز کیا ہے اور اب نماز ایک بے روح مجموعۂ اعمال بن کر رہ گئی ہے، وہاں انھوں نے مساجد کی حیثیت کو بھی فراموش کر دیا ہے، جو صدر اوّل کے اسلامی معاشرہ میں اس کو حاصل تھی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لی جائے کہ مسجد خدا کے ذکر و عبادت کی جگہ ہے اس لیے اس کا ادب واحترام واجب ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا

---

(۱) موطا، امام مالک

Marfat.com

گیا ہے:

فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ۔ (سورہ نور:۳۶)

''(یہ طاق) ایسے گھروں میں ہیں جن کے بارے میں خدا نے حکم دیا ہے کہ وہ تعمیر کیے جائیں اور ان میں اس کا نام لیا جائے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَاتَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا۔ (سورہ جن:۱۸)

''اور یہ کہ عبادت گاہیں اللہ کے لیے خاص ہیں اس لیے اس کے ساتھ کسی دوسرے کو (وہاں) نہ پکارو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مساجد کے احترام میں جہاں یہ بات داخل ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر و عبادت ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں کوئی فعل شرک نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ مسجد مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے مختلف النوع مسائل کے حل کے لیے اجتماع گاہ بھی ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا شَہَادَۃُ بَیۡنِکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ حِیۡنَ الۡوَصِیَّۃِ اثۡنٰنِ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ ..... تَحۡبِسُوۡنَہُمَا مِنۡۢ بَعۡدِ الصَّلٰوۃِ فَیُقۡسِمٰنِ بِاللّٰہِ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ لَا نَشۡتَرِیۡ بِہٖ ثَمَنًا وَّلَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی الخ (سورہ مائدہ:۱۰۶)

''اے ایمان والو! تمہارے درمیان گواہی بوقت وصیت، جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچا ہو، اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں... تم ان کو نماز کے بعد روک لو۔ پس وہ اللہ کی قسم کھائیں، اگر تمہیں شک ہو، کہ ہم اس کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہیں کریں گے اگرچہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو الخ۔''

مسجد میں بیٹھ کر مسائل کے حل کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگ خدا سے ڈریں گے اور نفسانی اغراض سے بلند ہو کر حق کی گواہی دیں گے۔ چنانچہ نبی ﷺ کے عہد میں جب کوئی اہم قومی مسئلہ درپیش ہوتا تو مسلمانوں کو مسجد نبوی میں جمع ہونے کا حکم دیا جاتا۔ اس کا طریقہ یہ

Marfat.com

تھا کہ منادی کرنے والے مسلم محلوں میں جاکر "الصلوٰۃ جامعۃ" کی صدا لگاتے اور یہ صدا سن کر تمام مسلمان مسجد میں جمع ہو جاتے۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ باہر سے آنے والے وفود مسجد نبوی ہی میں نبی ﷺ سے ملاقات کرتے۔ نجران سے عیسائیوں کا جو مذہبی وفد آیا وہ عصر کے وقت مدینہ پہنچا تھا اور مسجد نبوی ہی میں اس نے آپ ﷺ سے ملاقات کی بلکہ نماز بھی وہیں ادا کی تھی۔(۱)

اسلام سے پہلے مدنی معاشرے میں یہ حیثیت سقیفوں (چوپایوں) کو حاصل تھی۔ ہر قبیلے کی الگ الگ چوپال یا اجتماع گاہ تھی۔ قبیلۂ خزرج کے سقیفہ کا نام سقیفہ بنی ساعدہ تھا۔ یہ وہی مشہور سقیفہ ہے جہاں نبی ﷺ کی وفات کے بعد قبیلۂ خزرج کا ایک اہم مشاورتی جلسہ ہوا تھا اور اسی جلسے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا تھا۔ اسلام سے پہلے مکہ میں اہلِ قریش کی مرکزی اجتماع گاہ کا نام دارالندوہ تھا جسے قصی بن کلاب نے قائم کیا تھا۔ ہجرت سے قبل اسی دارالندوہ میں جمع ہو کر مکہ کے سرداروں نے نبی ﷺ کے قتل کا فیصلہ کیا تھا، جس میں وہ ناکام رہے۔

غلبۂ اسلام کے ساتھ ہی چوپایوں کی یہ حیثیت مسجدوں کو حاصل ہوگئی۔ لیکن آگے چل کر مختلف وجوہ سے مساجد کی مرکزی حیثیت باقی نہیں رہی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دوبارہ مسجدوں کو وہ حیثیت دیں جو عہد رسالت میں ان کو حاصل تھی۔ مسجدوں کے علاوہ دوسرے مقامات پر اجتماع ممنوع نہیں ہے لیکن حتی الامکان کوشش یہ ہو کہ اجتماع کسی مسجد میں ہوتا کہ اس سے روحانی اور مادی دونوں طرح کے فائدے حاصل ہوں۔

لیکن یہ فوائد اسی وقت پورے طور پر حاصل ہو سکتے ہیں جب دوسری باتوں کے علاوہ مساجد کا نظم و انتظام بھی درست ہو۔ مسجدوں کی تولیت و انتظام کے اصلی حقدار وہ لوگ ہیں جو پابندِ صوم و صلوٰۃ اور خداترس ہوں جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ

(۱) رحمت للعٰلمین، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، ج ۱، ص ۱۸۸

Marfat.com

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ الخ۔ (سورہ توبہ:۱۸)

''خدا کی مسجدوں کا انتظام کرنے والے تو صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، نماز قائم کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔''

قرآن کی اس واضح ہدایت کے باوجود آج بہت سی مساجد کا نظم واختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خدا ترس تو کجا تارکِ نماز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات مسجدیں اختلاف ونزاع کا محل بن جاتی ہیں۔ اس سے احتراز لازمی ہے۔ یہ یہود ونصاریٰ کا طرزِ عمل رہا ہے۔

کسی شخص یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مساجد میں اللہ کے ذکر وعبادت سے کسی فرد یا جماعت کو روکے کیونکہ ان کے قیام کی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ ان میں کثرت سے خدا کا نام لیا جائے اور اس کی عبادت ہو۔ اس عمل سے روکنا صریح ظلم وزیادتی، خانۂ خدا کی بے حرمتی اور اس کی ویرانی کے مترادف ہے۔(۱) فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِہَا اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْہَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ لَہُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ اَلِیْمٌ O

(سورہ بقرہ:۱۱٤)

''اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا، جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور اس کی ویرانی کے درپے ہو۔ ان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

---

(۱) مسجدوں کو گندے سیاسی مقاصد یا مسلکی اغراض کے لیے استعمال کرنا صحیح نہیں اور اس صورت میں منتظمین مسجد کی طرف سے ممانعت پر اس آیت کا اطلاق نہ ہوگا۔(مصنف)

Marfat.com

طریقۂ صلوٰۃ

عام طور پر ہر مسلمان، کیا تعلیم یافتہ اور کیا نیم تعلیم یافتہ، طریقۂ نماز سے کم و بیش واقف ہے۔ فقہ کی چھوٹی بڑی تمام کتابوں میں انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقہ ہائے نماز کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ اس لیے یہاں طریقۂ نماز کے بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ہم نے دیکھا کہ بعض ایسے امور طریقۂ نماز میں داخل ہو گئے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے، اور بعض کی اصل تو ہے لیکن اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چند دوسرے امور بھی وضاحت کے طالب تھے اس لیے ہم نے طریقۂ نماز کے بیان کو ضروری خیال کیا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ طریقۂ نماز کے حواشی کو غور سے پڑھیں۔

ادائیگی نماز کے سلسلے میں سب سے اوّل یہ کام کرنا ہوگا کہ اگر وضو سے نہ ہوں تو وضو کر لیں۔ (۱) قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ۝ (سورہ مائدہ:٦)

”اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو (اس سے پہلے) اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ، اور اپنے سر کا مسح کرو، اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھو لو۔“

---

(۱) وضو میں غلو صحیح نہیں ہے جیسا کہ آج کل دیکھا جاتا ہے۔ موزوں پر مسح کے سلسلے میں بھی تشدد پایا جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ نبی ﷺ کے عہد میں چمڑے کا موزہ پہنا جاتا تھا جب کہ موجودہ دور میں اس کا استعمال بہت کم ہے اس لیے چمڑے کے موزے کی قید صحیح نہیں ہے۔ موزہ، خواہ چمڑے کا ہو اور خواہ نائلان وغیرہ کا، اگر پاک وصاف ہے تو اس پر مسح کیا جا سکتا ہے۔ وضو کر کے موزہ پہننے کی قید بھی زائد ہے اور کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ (دیکھیں زاد المعاد، علامہ ابن قیم، ج ۱، بسلسلۂ عبادات) یہ سب باتیں تشدد فی الدین میں داخل ہیں اس لیے ان سے پرہیز لازمی ہے۔

معلوم ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کی اجازت ہے (سورہ مائدہ:٦) تیمم میں چہرہ اور دونوں ہاتھوں کی کہنیوں تک کا مسح ہے اور اس کے لیے پاک مٹی کا استعمال دو ضربوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔

(ابوداؤد، ج ۱ص ٦۲)

Marfat.com

وضو سے فراغت کے بعد آپ قبلہ رُو کھڑے ہوں۔ فرمایا گیا ہے:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ (سورہ بقرہ:۱٤٤)

''پس تو اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف پھیر لے، اور (اے مسلمانو!) تم بھی جہاں کہیں ہو، اپنے چہروں کو اس کی طرف پھیر لو''

قبلہ رو ہونے کے بعد یہ خیال کریں کہ آپ بادشاہ حقیقی کے سامنے کھڑے ہیں۔ (۱) اس کے بعد تکبیرِ تحریمہ (۲) یعنی اللہ اکبر کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائیں (۳) اور کان کی لو تک لے جائیں۔ (۴) اور پھر داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر ناف کے اوپر باندھ لیں۔ (۵) اس طرح دست بستہ ہو کر (۶) نہایت عاجزی سے خدائے برتر کی حمد وثنا سے نماز کا آغاز کریں۔ اس سلسلے میں نبی ﷺ سے بہت سی افتتاحی دعائیں منقول ہیں۔ ایک دعا یہ ہے: (۷)

---

(۱) اس قدر احساس کافی ہے اور یہی نیت ہے۔ نیت کے الفاظ زبان سے ادا کرنا غیر ضروری بلکہ بدعت ہے۔ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

(۲) بخاری، باب: ایجاب التکبیر وافتتاح الصلوٰۃ عن انسؓ

(۳) ہاتھ اٹھانا اپنے اندر دو طرح کا مفہوم رکھتا ہے، ایک تسلیم وحوالگی یعنی مزاحمت ترک کر کے خود کو اپنے سے بلند وتر اور غالب ہستی کے حوالہ کر دینا۔ یہ بالکل ویسا ہی عمل ہے جیسے میدان جنگ میں مغلوب فوجی ہاتھ اٹھادیتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ مزاحمت ترک کر کے خودسپردگی کے لیے تیار ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم دست کش ہو جانا ہے۔ نمازی ہاتھ اٹھا کر دراصل خدا کے سوا ہر شے سے اپنا ذہنی وقلبی رشتہ منقطع کر لینے کا اعلان کرتا ہے۔

(۴) اہل حدیث کان کی لو کے بجائے مونڈھوں تک ہاتھ اٹھاتے ہیں اور بخاری کے باب: ''الی این یرفع یدیہ'' میں ابن عمرؓ سے جو روایت ہے اس سے استدلال کرتے ہیں۔ دونوں ہی عمل ثابت ہیں۔

(۵) اہل حدیث سینے پر ہاتھ باندھتے ہیں (بلوغ المرام، ج۱، ص۷۳) ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کی بھی روایت ہے۔ امام ترمذی نے لکھا ہے کہ اہل علم کے نزدیک سب صورتیں جائز ہیں (ترمذی ج۱ ص۳۴)

(۶) ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا ہمیشہ سے ادب واحترام کی علامت سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے باجبروت بادشاہوں کے دربار میں جو آداب بندگی ماضی میں رائج رہے ہیں ان میں ہاتھ باندھنا اور نظر نیچی رکھنا بھی شامل تھا۔

(۷) صحیح مسلم، عن عمرؓ، مزید دیکھیں ترمذی، ج۱، ص۳۳، ابوداؤد، ج۱، ص۱۳۹

Marfat.com

سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ

''اے اللہ تو پاک ہے، تیری تعریف ہے، تیرا نام مبارک ہے، تیرا رتبہ بلند ہے، اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔''

اس دعا کے بعد آہستہ سے کہیں: (۱)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ (۲) بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۳)

''میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود (کی شرارت اور وسوسہ اندازی) سے، اور شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت درجہ رحم کرنے والا ہے۔''

تعوّذ اور تسمیہ کے بعد سورہ فاتحہ، جو نماز کا جزء لازم ہے (۴)، ٹھہر ٹھہر کر نرم آواز سے پڑھیں بشرطیکہ نماز جہری ہو ورنہ خاموشی سے پڑھیں (۵) اس کے بعد آہستہ سے آمین کہیں (۶) پھر قرآن کی کوئی چھوٹی سورہ یا کسی بڑی سورہ کی چند آیتیں (کم از کم تین آیات) جو آپ کو یاد ہوں ترتیل سے پڑھیں۔ تلاوت قرآن کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے

---

(۱) چونکہ آگے قرآن کی تلاوت ہے اس لیے یہ الفاظ ادا کیے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ٥ (سورہ نحل: ۹۸)

''جب تم قرآن پڑھو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

(۲) مسند احمد، عن ابی سعید خدریؓ

(۳) اہل حدیث جہری نمازوں میں بسم اللہ کو بلند آواز سے اور سری نمازوں میں آہستہ سے پڑھتے ہیں اور دلیل میں حضرت ابوہریرہؓ کا طرز عمل پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: سنن نسائی، ج ا ص ۱۴۴، سنن دارقطنی، ج ا ص ۱۱۵۔ دونوں ہی عمل ثابت ہیں۔ دیکھیں بخاری، ج ۲ ص ۱۸۸، فی صفۃ الصلوۃ

(۴) بخاری، ج ا ص ۱۰۴ (الصلوۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب)

(۵) اہل حدیث کے نزدیک اجتماعی نماز میں بھی سورہ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے خواہ نماز سری ہو یا جہری۔ اس سلسلے میں امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ جن نمازوں میں امام جہر کے ساتھ قرأت کرتا ہے ان میں مقتدی سورہ فاتحہ نہ پڑھیں لیکن جن نمازوں میں امام خاموشی سے قرأت کرتا ہے ان میں سورہ فاتحہ پڑھی جائے (موطا ج ا، باب: ترك القراة خلف الامام فيما يجهر فيه

(۶) اہل حدیث سری نماز میں آہستہ لیکن جہری نماز میں بلند آواز سے آمین کہتے ہیں (دیکھیں ابوداؤد، عن ابی ہریرہ ص ۱۳۴)

Marfat.com

رکوع میں چلے جائیں اس طرح کہ آپ کے دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر ہوں اور کمر سیدھی اور برابر رہے(۱) اور آہستہ سے کم از کم تین بار کہیں(۲): سبحان ربی العظیم (پاک ہے میرا پروردگار جو عظیم اور برتر ہے) پھر آہستہ سے سمع اللہ لمن حمدہ (اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی) کہتے ہوئے رکوع سے سر اٹھائیں (۳) اور بالکل سیدھے ہو کر آہستہ سے کہیں: (۴) ربنا لک الحمد (اے ہمارے رب، ساری تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں) اس کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے اس طرح سجدے میں جائیں (۵) کہ پہلے دونوں ہاتھوں کو پھر آہستہ سے گھٹنوں کو زمین پر رکھیں (۶)، سجدہ کی حالت میں ناک اور پیشانی زمین سے لگی ہوئی ہوں، دونوں ہتھیلیاں دونوں کانوں کے برابر ہوں اور کہنی زمین سے اٹھی ہوئی ہو(۷)، سجدے میں آہستہ سے کم از کم تین بار کہیں (۸): سبحان ربی الاعلیٰ (پاک ہے میرا پروردگار جو سب سے اعلیٰ و برتر ہے)، پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے سے سر اٹھائیں اور اطمینان سے بالکل سیدھی حالت میں اس طرح بیٹھ جائیں کہ داہنا پاؤں کھڑا اور بایاں پاؤں زمین پر بچھا ہوا اور اسی پر آپ کی سرین ہو(۹) اور آہستہ سے یہ دعا پڑھیں (۱۰):

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَعَافِنِیْ

---

(۱) بخاری، باب وضع الکف علی الرکب فی الرکوع، عن مصعب بن سعدؓ

(۲) مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، عن عقبہ بن عامرؓ

(۳) صحیح مسلم، ابوداؤد، عن عائشہؓ

(۴) بخاری، باب التکبیر اذا قام من الرکوع، عن ابی هریرۃؓ

(۵) ایضاً، باب التکبیر فی السجود

(۶) سنن بیہقی، ج ۲، ص ۱۰۰، عن ابن عمرؓ

(۷) بخاری و مسلم، عن ابن عباسؓ

(۸) المنتقی ص ۶۲، ۶۳

(۹) بخاری، باب: سنۃ الجلوس فی التشہد عن ابی حمید الساعدی

(۱۰) ابوداؤد، ترمذی

Marfat.com

''اے اللہ ہمارے گناہوں سے درگزر فرما، ہم پر رحم فرما، ہمیں سیدھی راہ دکھا، ہمیں بہترین رزق دے اور ہمیں امن و عافیت عطا فرما۔''

اگر صرف ''رب اغفرلی، رب اغفرلی (اے رب ہمیں معاف فرمادیں، اے رب ہمیں معاف فرمادیں) کہیں تو بھی صحیح ہے۔ اس مختصر دعا کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں جائیں۔ یہ دوسرا سجدہ بھی پہلے سجدے کی طرح کریں پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے کھڑے ہو جائیں (۱)۔ اور ہاتھ باندھ لیں۔ اب دوسری رکعت بھی پہلی رکعت کی طرح ادا کریں۔ دوسری رکعت کے دوسرے سجدہ سے سر اٹھا کر اطمینان سے بیٹھ جائیں اور دونوں ہاتھوں کو دونوں پیروں کے گھٹنوں پر رکھ لیں اور خاموشی سے تشہد پڑھیں (۲):

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالطَّیِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ (۳) اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ، اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصالحین،

---

(۱) بخاری، باب التکبیر اذا قام من السجود عن ابی ہریرۃ۔

(۲) بخاری باب التشہد فی الآخرۃ عن ابن مسعودؓ، مسلم ج ا ص ۱۷۳، ابوداؤد ج ا ص ۱۵۸

(۳) بخاری (کتاب الاستیذان) میں عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم لوگ السلام علیک ایھا النبی کو غائب کے صیغہ سے پڑھتے تھے یعنی السلام علی النبی اور اسی پر تمام صحابہ کا عمل تھا۔ ملاحظہ ہو، فتح الباری ج ۴ ص ۴۵۳

التحیات کے بعد عام طور پر درود پڑھا جاتا ہے لیکن حدیث کی کسی معتبر کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ ہر کتاب میں تشہد کے بعد دعا کا ذکر ہے۔ امام بخاریؒ نے ایک پورا باب ہی اس عنوان سے باندھا ہے: باب ما تخیر من الدعاء بعد التشہد۔'' دیکھیں، اس میں تشہد کے بعد صرف دعا کا ذکر ہے۔ اگر درود جزءِ نماز ہوتا تو عنوان یہ ہوتا: باب ما تخیر من الدعاء بعد الصلوٰۃ علی النبی۔ اصل بات یہ ہے کہ جب آیت: یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما، نازل ہوئی تو صحابہ نے نبی ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول، اس آیت کے مطابق آپ پر کس طرح درود بھیجا جائے تو آپ نے ان کو یہ الفاظ تلقین کیے: اللھم صل علی محمد وازواجہ وذریتہ کما صلیت علی آل ابراھیم، وبارک علی محمد وازواجہ وذریتہ کما بارکت علی آل ابراھیم انک حمید مجید (موطا، ج ا، باب: ما جاء فی الصلوٰۃ علی النبی) تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ دوسرے درود بھی حدیث کی کتابوں کے باب ''الصلوٰۃ علی النبی'' کے تحت مذکور ہیں لیکن ان ابواب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ نبی ﷺ نے نماز میں درود پڑھنے کی تعلیم دی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ نماز ختم ہونے کے بعد اللہ کی دوبارہ حمد وثنا کے بعد نبی ﷺ پر درود بھیجا جائے۔

Marfat.com

اَشْهَدُ اَنْ لا اِلٰـهَ اِلاّ اللّٰہ (۱) وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

''ساری حمد و ثنا اور نمازیں اور ساری پاکیزہ چیزیں اللہ کے لیے ہیں۔ اے نبی! آپ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

تشہد کے بعد یہ دعا پڑھیں: (۲)

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْماً كَثِیْراً وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

''اے اللہ میں نے اپنی جان پر بہت زیادہ ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کر سکے۔ پس تو مجھے معاف کر دے اور مجھ پر رحم فرما کہ تو بیشک معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

یہ دعا پڑھنے کے بعد آپ پہلے داہنی طرف پھر بائیں طرف منہ پھیر کر آہستہ سے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہیں۔ (۳) سلام پھیرتے ہی آپ کی دو رکعت کی نماز پوری ہوگئی۔ اگر چار رکعتوں والی نماز ہے تو دوسری رکعت میں تشہد پڑھ کر اللہ اکبر کہتے ہوئے کھڑے ہوجائیں اور صرف سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد (۴) ابتدائی دو رکعتوں کی طرح رکوع وسجدہ

---

(۱) لا الٰہ پڑھتے وقت داہنے ہاتھ کی انگلی (سبابہ) کو آسمان کی طرف اٹھائیں۔ دیکھیں ابوداؤد، ج۱، ص ۱۵۸، نسائی، ج۱، ص ۱۸۷

(۲) بخاری، ج۱، ص ۱۱۵، عبداللہ ابن مسعود تشہد کے بعد نہ تو درود پڑھتے تھے اور نہ ہی دعا بلکہ تشہد کے ساتھ ہی سلام پھیر دیتے تھے۔ امام بخاری نے یہ باب قائم کیا ہے: باب ما یتخیر من الدعاء بعد التشہد ولیس بوجوب عن ابن مسعود

(۳) مسلم، ج۱، ص ۲۱۶

(۴) بخاری، باب: مایقرأ فی الأخرین بفاتحة الکتاب

Marfat.com

کریں۔اسی طرح چوتھی رکعت بھی ادا کریں۔ چوتھی رکعت میں دوسرے سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اطمینان سے بیٹھ جائیں اور پھر دو رکعت والی نماز کی طرح پہلے تشہد پھر دعا اور اس کے بعد سلام پھیر کر نماز مکمل کریں۔

سلام پھیرنے کے بعد کوئی دعا نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔(۱) اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کا خاتمہ ہی دعا پر ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ نماز کے خاتمہ پر جو چیز آپ ﷺ سے ثابت ہے وہ بعض اذکار ہیں۔حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب نماز سے سلام پھیرتے تو تین مرتبہ استغفار (استغفر اللہ) فرماتے اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ (۲)

اگر اجتماعی نماز ہے تو سلام پھیرنے کے بعد امام کو چاہیے کہ وہ اپنے مصلے ہی پر دائیں یا بائیں گھوم کر یا مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھ جائے۔(۳) اور کچھ دیر ذکر و اذکار میں مصروف رہے۔(۴)

نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا، جیسا کہ آج کل اماموں کا معمول ہے، کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔اس سلسلے میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں ان کا تعلق یا تو مجرد دعا سے ہے یا وہ کمزور روایتیں ہیں۔صحیح روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ سلام پھیرنے کے بعد رخ بدل کر بیٹھ جاتے اور بغیر ہاتھ اٹھائے استغفار و ذکر فرماتے۔

سلام پھیرنے کے بعد امام کا رخ بدل کر بیٹھنا اس بات کے اظہار کے لیے ہے کہ نماز ختم ہوگئی ہے۔

---

(۱) خاتمۂ نماز کے بعد دعا مانگنا مستحب ہے۔زیادہ بہتر یہ ہے کہ جو دعا مانگنی ہو وہ نماز کے اندر ہی مانگ لی جائے۔

(۲) مسلم، ج۱،ص ۲۱۸

(۳) بخاری، عن عبد اللہ ابن مسعودؓ

(۴) اس کو ذکرِ خفی کہتے ہیں۔ دیکھیں مسلم، ج۱،ص ۲۱۹، عن ابی ہریرہؓ

Marfat.com

طریقۂ نماز میں اختلاف کی حقیقت

اہلِ حدیث کا طریقۂ نماز اہلِ فقہ سے مختلف ہے۔ خود اہل فقہ میں بھی اختلاف ہے۔ حنبلی طریقۂ نماز، مالکی طریقۂ نماز سے مختلف ہے۔ سوال یہ ہے کہ طریقۂ نماز میں اختلاف، گوکہ وہ جزئی نوعیت کا ہے، کیوں پیدا ہوا؟ راقم اصولی حیثیت سے عبادت کی ظاہری صورتوں میں اختلاف کو چنداں اہمیت نہیں دیتا لیکن پھر بھی سوچتا ہے کہ آخر رسول اللہ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ۲۳ طویل سالوں میں کس طرح نمازیں پڑھیں، پڑھائیں اور اپنے اصحاب کو سکھائی تھیں؟ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے مختلف طریقوں سے نمازیں پڑھیں، پڑھائیں اور سکھائی تھیں اسی لیے ادائیگی نماز میں بعض جزئی اختلافات ملتے ہیں۔

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نماز مختلف طریقوں سے کیوں ادا فرمائی؟ اگر ایک ہی طریقہ ہوتا تو آج اس معاملے میں مسلمانوں میں اختلاف پیدا نہ ہوتا۔ ماضی میں یہ اختلاف شدید نزاع کی صورت اختیار کرچکا ہے جس سے اصحابِ علم واقف ہیں۔ اس سوال کا اس کے علاوہ اور کیا جواب ہوسکتا ہے کہ آپ صلعم نے مختلف طریقوں سے نماز ادا کرکے دراصل امت کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ وہ نماز کے ظاہری طریقوں کی پابندی تو کریں لیکن اس کو اصل ومقصود نہ سمجھ لیں بلکہ اس کے مغز وجوہر یعنی خشوع وخضوع پر اپنی ساری توجہ مرکوز کریں۔

عبادت کے ظاہری پہلو پر حد سے زیادہ توجہ دینے اور اس کے باطنی پہلو سے صرف نظر کرلینے کی وجہ سے ایک زمانہ میں یہود ونصاریٰ میں شدید اختلاف ہوا اور آگے چل کر یہ اختلاف مجادلہ ومقاتلہ تک پہنچ گیا۔ نزاع یہ تھی کہ ایک فرقہ مشرق کی طرف اور دوسرا فرقہ مغرب کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتا تھا اور ایک دوسرے کے قبلہ کو غلط ٹھہراتا تھا۔ قرآن میں اس اختلاف کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ۔ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۔ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

Marfat.com

عَظِيْمٌ ٥ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥ (سورہ بقرہ: ١١٤، ١١٥)

''اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد کو اس بات سے محروم کریں کہ ان میں اس کا ذکر کیا جائے اور اس کی ویرانی میں کوشاں ہوں۔ ان کے لیے زیبا نہ تھا کہ ان مسجدوں میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں بڑی سزا ہے۔ اور مشرق ہو یا مغرب، دونوں ہی اللہ کے ہیں۔ پس تم جس طرف بھی رخ کرو اسی طرف اللہ ہے۔ اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔''

مسلمانوں نے قرآن کی اس تعلیم کو بھلا دیا اور عبادت کے ظاہری طریقوں کی پیروی کو مقصودِ عبادت سمجھ لیا۔ اس معاملے میں انھوں نے یہود و نصاریٰ کی طرح اس درجہ غلو کیا کہ جزئی اختلاف کو بھی برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ گو کہ اختلاف کی وہ شدت اب باقی نہیں رہی جو کبھی ماضی میں تھی لیکن نماز کے ظاہری آداب و رسوم کی طرف حد سے زیادہ التفات اور اس کے مقصود سے بے اعتنائی کا رویہ اب بھی قائم ہے۔

حقیقتِ دعا

دعا کے بارے میں اکثر مسلمان ایک شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مجرد دعا مانگ لینے سے مقصودِ دعا حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ فرض نمازوں کے بعد اور دوسرے مواقع پر بھی لمبی چوڑی دعائیں مانگتے ہیں اور جب ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں تو وہ سخت مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی چیز کو دیکھ کر سرسید علیہ الرحمہ نے دعا کے بالذات مؤثر ہونے کے تصور سے انکار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لیے ہم دعا کرتے ہیں دعا کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جاویگا اور استجابت کے معنی اس مطلب کا حاصل ہو جانا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حصولِ مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کیے ہیں وہ مطلب تو انہی اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوگا مگر دعا نہ اس مطلب کے اسباب میں سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے بلکہ وہ اس قوت کو تحریک کرنے والی ہے جس سے اس رنج و مصیبت اور اضطرار میں جو

Marfat.com

مطالب نہ حاصل ہونے سے ہوتا ہے، تسکین دیتی ہے اور جب کہ دعا دل سے اور اپنے تمام فطری قویٰ کو متوجہ کر کے کی جاتی ہے اور خدا کی عظمت اور اس کی بے انتہا قدرت کا خیال اپنے دل میں جمایا جاتا ہے تو وہ قوت تحریک میں آتی ہے اور ان تمام قوتوں پر جن سے اضطرار پیدا ہوا ہے اور اس مصیبت کا رنج برانگیختہ ہوا ہے ان سب پر غالب آجاتی ہے اور انسان کو صبر و استقلال ہو جاتا ہے۔ اور اسی کیفیت کا دل میں پیدا ہونا دعا کا مستجاب ہونا ہے۔'' (۱)

اس مفہومِ دعا پر سرسید ہی کے ایک معتمد رفیق محسن الملک نے اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جو کچھ آپ نے تحریر کیا ہے... میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا ایک وجودِ معطّل ہے اور اس کی طرف قدرت و اختیار و مشیت و ارادے کی نسبت بے معنی ہے۔ قوانین فطرت کا عمل اگر مقرر ہے اور خدا بھی ان میں تبدیلی نہیں کرتا تو عبادت اور دعا بھی فضول ہے کیونکہ اس سے انسانوں کی حالت نہیں بدل سکتی... پس درحقیقت دعا کو اسبابِ حصولِ مقصد میں سے نہ سمجھنا ایک ایسا عقیدہ ہے جو قولاً کیسا ہی مذہبی کہا جائے اور گو کیسے ہی عمدہ طور سے مذہبی الفاظ میں بیان کیا جائے مگر عملاً دہریت ہے۔ نیز اگر دعا کا عمل موقوف ہو گیا اور خدا سے دعاؤں کے سننے اور حاجتوں کو پورا کرنے کا خدائی حق لے لیا گیا تو مذہبی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دعا ذریعۂ حصولِ مقصد نہیں تو دعا بے کار اور خدا پر توکل فضول ہے۔''(۲)

دعا کے بارے میں مذکورہ دونوں تصورات اس افراط و تفریط کی بہترین مثال ہیں جن میں مسلمان اربابِ علم برابر مبتلا رہے ہیں اور آج بھی مبتلا ہیں۔ سرسید دعا کو ذریعۂ حصولِ مقصد نہیں سمجھتے اور اس کی تاویل کرتے ہیں اور محسن الملک اس کو حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ اور جزوِ توکل مانتے ہیں۔ دعا بے شک حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے لیکن وہ سعی سے مشروط ہے اور اس نکتہ کو ان دونوں فضلاء نے نظر انداز کر دیا اس لیے حقیقتِ دعا تک ان کی

---

(۱) تفسیر القرآن، ج۱، ص۳۳ (تفسیر سورہ فاتحہ)

(۲) سرسید کی مذہبی فکر میں عقل کی روشنی، (مضمون) اشرف فاطمی، قومی آواز، سنڈے ایڈیشن، ۵/مارچ ۲۰۰۰ء

Marfat.com

رسائی نہ ہو سکی۔

دعا کے لفظی معنی پکارنے کے ہیں اور اس کا اصطلاحی مفہوم ہے حاجات اور مصائب میں خدا کو مدد کے لیے پکارنا، بالخصوص اس وقت جب بندہ محسوس کرتا ہے کہ اسبابِ دنیوی اس کے مطلب کے حصول میں معاون ثابت نہیں ہوئے یا محض اسبابِ دنیوی کے ذریعہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔ ہزاروں واقعات بتاتے ہیں، اور ہر شخص کو ذاتی طور پر اس بات کا تجربہ ہوگا، کہ بسا اوقات تمام تدابیر کے باوجود مطلوب حاصل نہیں ہوتا اور کبھی معمولی تدبیر سے ہی مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ دو مختلف طرح کے تجربات بتاتے ہیں کہ مطلوب کا حصول بلاشبہ ضروری اسباب کے جمع ہونے یا دوسرے لفظوں میں موافق حالات کے پیدا ہونے پر منحصر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ موافق حالات کیا خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں؟ دہری اسی کے قائل ہیں اور اس کو قانونِ اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی بدترین کج اندیشی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موافق حالات کا پیدا ہونا ایک غالب اور برتر ہستی کے ارادہ واختیار کے تابع ہے۔ اسباب کے پردے میں خدا کی مشیت کیونکر عمل کرتی ہے اس کی تفہیم انسان کی محدود عقل وفہم سے بعید ہے۔ لیکن قرآن مجید سے اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی مشیت کے ظہور کے لیے ایک قاعدہ مقرر کیا ہے اور وہ حرکت وعمل کا قاعدہ ہے اور اسی قاعدے کے مطابق دنیا میں نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ عام حالات میں اس قاعدے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (سورہ احزاب:۶۲) ''تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

حرکت وعمل کا اصول ایک آفاقی اصول ہے اور ساری کائنات اس اصول کے مطابق مصروفِ عمل ہے۔ اس اصول سے انحراف کا مطلب غارِ فنا میں جانا ہے۔ جب ساری کائنات کے لیے حرکت وعمل کے قانون کی پیروی لازمی ہے تو انسان، جو اس کائنات کا مرکزی حصہ ہے، اس قانون سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے بھی تقدیرِ الٰہی یہ ٹھہری کہ وہ سعی وعمل کی راہ میں گام زن ہو اور اس سے کسی حال میں غافل نہ ہو۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى (سورہ نجم:۳۹)

''اور یہ کہ انسان کے لیے بس وہ ہے جس کے لیے اس نے سعی کی''

Marfat.com

لیکن سعی و عمل کا نتیجہ خیز ہونا خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ وہ جس قدر چاہتا ہے اسی قدر کسی عمل سے نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو کوئی عمل از خود نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا ہے لیکن عام حالات میں خدا کسی عمل کے نتیجے کو روکتا نہیں ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عمل سے گریز نہ کریں کہ یہ سنّتِ الٰہی کی خلاف ورزی ہوگی لیکن نتیجۂ عمل کو خدا کے حوالے کر دیں اور دعا کریں کہ وہ عمل کو اس حد تک نتیجہ خیز بنا دے جس سے مطلوبِ دعا حاصل ہو جائے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس طرزِ عمل کا نام توکّل ہے۔

توکل کا مطلب، جیسا کہ بہت سے مسلمان سمجھتے ہیں اور صوفیاء نے اس تصور کو بہت زیادہ مقبول بنایا ہے، سعی و تدبیر سے غافل ہونا نہیں بلکہ سعی و تدبیر کے ساتھ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھنا ہے کہ نتائج کا ظہور اس کی مشیت کے تابع ہے۔ فرمایا ہے:

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (سورہ ال عمران:۱۵۹)

''جب ارادہ محکم کر لو تو پھر خدا کی ذات پر بھروسہ کرو۔''

ایک کافر اور مومن میں یہی فرق ہے۔ کافر اسباب پر بھروسہ کرتا ہے اور عام حالات میں قانونِ قدرت کے مطابق اس کی سعی کا نتیجہ بھی اس دنیا میں اس کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن مومن کا طرزِ فکر اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ جمعِ اسباب سے غافل نہیں ہوتا لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسباب کی فراہمی میں کمی اور کوتاہی ممکن ہے اس لیے سعی و تدبیر کے ساتھ ہی خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ تدبیر میں غیر محسوس کوتاہی کی تلافی اپنے فضل و کرم سے کر دے۔ یہی دعا کی اصل حقیقت ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○

(سورہ آل عمران:۱۴۷)

''ان کی دعا تو ہمیشہ بس یہ رہی کہ اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملے میں ہماری بے اعتدالیوں کو معاف کر دے (یعنی نظر انداز کر دے)، ہمارے قدموں کو جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔''

Marfat.com

آدابِ دعا

دعا کی حقیقت جان لینے کے بعد یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خدا سے کس طرح دعا مانگی جائے۔ خدا کی عظمت و کبریائی کا تقاضا ہے کہ بندہ اس سے اس طرح مانگے جو اس کی عظمت و جلال کے شایانِ شان اور خود بندے کی بندگی کے عین مطابق ہو۔ خدا سے دعا مانگتے وقت جن آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) دعا کے لیے بہترین وقت کا انتخاب کرنا چاہیے اور وہ صبح کا وقت ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (الذاریات:۱۸)

''اور وہ صبح کے اوقات میں خدا سے مغفرت چاہتے ہیں۔''

صبح کے وقت خدا اور بندے کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں ہوتی اور ریا و نمود کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس وقت خاص میں ہمیشہ سے خدا کے نیک بندے پوری دلجمعی، اطمینانِ قلب اور مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے خالق و مالک کے حضور میں گریہ و زاری اور اس سے عفو و بخشش طلب کرتے رہے ہیں۔ اللہ تو ہر وقت مائل بہ کرم ہے لیکن ہنگام سحر اس کی رحمت و بخشش اپنے نقطۂ عروج پر ہوتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر شب میں جب ایک تہائی رات باقی رہتی ہے، آسمانِ دنیا پر نزول کرتا ہے اور فرماتا ہے:

''کوئی ہے جو مجھ سے مانگے اور میں قبول کروں اور کوئی ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اس کو دوں، اور کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت کا خواہاں ہو پس میں اس کو بخش دوں۔''(۱)

(۲) دعا قبلہ رخ ہو کر مانگی جائے اور دونوں ہاتھ اس قدر اونچے رکھے جائیں کہ بغل اچھی طرح کھل جائے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ دعا میں اپنے ہاتھ اس حد تک اٹھاتے تھے کہ آپ کی بغل کی سفیدی معلوم ہونے لگتی تھی۔ (۲)

---

(۱) بخاری و مسلم، عن ابی ہریرہؓ

(۲) بخاری و مسلم

Marfat.com

(۳) دعا کے وقت آواز کو پست رکھا جائے اور کامل تضرع کے ساتھ خدا کو پکارا جائے۔فرمایا گیا ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ

(سورہ اعراف:۵۵)

''تم اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ بیشک وہ (دعا میں) حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ جب مدینہ کے قریب پہنچے تو آپ نے تکبیر کہی اور لوگوں نے بھی اللہ اکبر کہا اور آواز خوب بلند کی۔ پس آپؐ نے فرمایا کہ لوگو! تم جس ہستی کو پکارتے ہو وہ نہ بہرا ہے اور نہ غائب بلکہ وہ تمہارے اور تمہاری سواریوں کی گردنوں کے درمیان ہے۔(۱)

(۴) دعا مختصر اور سادہ ہو، مقفّٰی اور مسجّع عبارت سے گریز کیا جائے۔قرآن مجید میں جتنی دعائیں مذکور ہیں وہ مختصر اور جامع ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا میں اختصار اور جامعیت کو پسند فرماتا ہے۔آج کل ایک دینی جماعت کے لوگ دعا میں حد سے زیادہ غلو اور طولِ بیان سے کام لیتے ہیں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

''عنقریب کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے کہ دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔''(۲)

(۵) دعا اس یقین و اعتماد کے ساتھ مانگی جائے کہ اللہ اس کو ضرور قبول فرمائے گا۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ○

(سورہ بقرہ:۱۸۶)

''اور اے نبی! اگر تم سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتادو کہ میں

---

(۱) بخاری و مسلم، ابوداؤد

(۲) ابوداؤد، ابن ماجہ، عن عبداللہ بن مغفلؓ

Marfat.com

ان کے بالکل قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں تو چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تا کہ وہ صحیح راستے پر ہوں۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ الخ (سورہ مومن: ٦٠)

''اور تمہارے رب نے کہا کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔''

نبی علیہ ﷺ نے بھی تلقین کی ہے کہ دعا میں تیقن اور قطعیت کا پہلو غالب ہو۔ فرمایا ہے:

''جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے تو یوں نہ کہے کہ خدایا مجھے بخش دے اگر تو چاہے، مجھ پر رحم فرما اگر تو چاہے، مجھے رزق دے اگر تو چاہے بلکہ اسے قطعیت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ خدایا میری فلاں حاجت پوری کر۔''(۱)

(٦) دعا مداومت کے ساتھ مانگی جائے۔ یہ نہیں کہ دعا مانگی اور اگر فی الفور قبول نہ ہوئی تو دعا مانگنا ہی چھوڑ دیا۔ نبی علیہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ صحابہ نے عرض کیا، جلد بازی کیا ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: جلد بازی یہ ہے کہ آدمی کہے، میں نے بہت دعا کی مگر میں دیکھتا ہوں کہ وہ قبول ہی نہیں ہوتی اور یہ کہہ کر وہ تھک جائے اور دعا مانگنا چھوڑ دے۔''(۲)

ایک دوسری روایت میں آپ نے فرمایا ہے:

''ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے، یا تو وہ اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے یا اسے جنت میں اجر دینے کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے یا اسی درجہ کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔''(۳)

---

(۱) ترمذی
(۲) صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ
(۳) مسند احمد عن ابی سعید خدریؓ

Marfat.com

ایک اور روایت میں آپ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے پروردگار سے سوال کرے اور قبول ہو جائے تو کہے: الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات ''اس کا خدا کا شکر ہے جس کی نعمت سے نیکیاں پوری ہوتی ہیں'' اور اگر قبولِ دعا میں تاخیر ہو جائے تو کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ ''شکر ہے خدا کا ہر حال میں۔''(۱)

دیکھیں، ابراہیم علیہ السلام خدا کے جلیل القدر پیغمبر اور خلیل اللہ تھے۔ بابل سے ہجرت کے وقت انھوں نے ایک صالح بیٹے کی دعا مانگی تھی۔ (سورہ الصافات: ۱۰۰) لیکن یہ دعا اس قدر تاخیر سے قبول ہوئی کہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ (سورہ ابراہیم: ۳۹)

قبول دعا میں تاخیر کے متعدد اسباب ہوتے ہیں جن کو خدا ہی بہتر طور پر جانتا ہے۔ کبھی اس تاخیر کی وجہ بندے کا امتحان ہوتا ہے اور کبھی کوئی اہم مصلحت۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اس لیے تاخیر سے قبول ہوئی کہ اللہ ان کو اپنی قدرت کا جلوہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ بڑھاپے میں، جب کہ تولید کی جسمانی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، اولاد دے سکتا ہے، اس کی قدرت کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ چنانچہ جس وقت فرشتے نے ان کو اولاد کی خوش خبری دی تو انھوں نے تعجب سے کہا: بڑھاپے میں، یہ تو عجیب خوش خبری ہے (سورہ حجر: ۵۴) اس کے جواب میں فرشتے نے کہا:

بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِيْنَ ○ (سورہ حجر: ۵۵)

''ہم نے تمھیں بالکل صحیح خوش خبری دی ہے، پس تم مایوس لوگوں میں سے نہ بنو۔''

(۷) دعا اللہ کے ذکر سے شروع کی جائے، ابتدا ہی میں سوال کر بیٹھنا عجلت اور خود غرضی کی علامت ہے۔ خدا کی شان اور بزرگی کا تقاضا ہے کہ پہلے اس کی خوب حمد وثنا کی جائے اس کے بعد جو کچھ مانگنا ہو وہ مانگا جائے۔ ایک صحابی (سلمہؓ) فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو کبھی نہیں سنا کہ آپ نے دعا شروع کی ہو اور پہلے یہ کلمات نہ کہے ہوں: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی، اَلْوَهَّابُ ''پاک ہے میرا رب، برتر ہے اور دینے والا ہے۔''(۲)

---

(۱) بخاری و مسلم، عن ابی ہریرۃؓ

(۲) احمد و حاکم

Marfat.com

قبولیتِ دعا کے شرائط

بندے کی دعا کسی نہ کسی شکل میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ضرور قبول ہوتی ہے بشرطیکہ اس میں درج ذیل باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہو:

(۱) دعا ان آداب کے ساتھ مانگی جائے جن کا اوپر ذکر ہوا۔

(۲) دعا میں صرف توبہ و استغفار ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصلاحِ حال کا عہد بھی ضروری ہے۔ فرمایا گیا ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ الخ (سورہ فرقان: ۷۰)

''مگر یہ کہ جو شخص توبہ کرے، ایمان لائے اور اچھے عمل کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے۔''

(۳) دعا کے ساتھ مقصودِ دعا کے لیے حتی الوسع جدو جہد کی جائے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر بندے کی دعا ان الفاظ میں مذکور ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (سورہ بقرہ: ۲۰۱)

''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی سے نواز، اور دوزخ کے عذاب سے ہمیں بچا۔''

اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

(بقرہ: ۲۰۲)

''ان کے لیے حصہ ہے ان کی کمائی کے مطابق، اور اللہ حساب کرنے میں بہت تیز ہے۔''

ٹھیک یہی بات ایک دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا، رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ○

Marfat.com

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ط اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○ (سورہ ال عمران: ۱۹۳، ۱۹۴)

''اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! تو ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہم میں جو برائیاں ہیں ان کو دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا، ہمیں وہ چیز بھی عطا کر جس کا تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعہ وعدہ کیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر، یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔''

اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ۔ الخ (سورہ ال عمران: ۱۹۵)

''ان کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا) میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کی جنس سے ہو۔''

اوپر مذکور دعا اور خدا کی طرف سے اس کے جواب سے بالکل واضح ہے کہ مجرّد منہ سے الفاظِ دعا ادا کر دینے سے وہ قبول نہیں ہوتی بلکہ مقصودِ دعا کے لیے مقدور بھر سعی و تدبیر بھی ضروری ہے۔ اصل چیز عمل ہے اور دعا اس کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں معاونت کرتی ہے۔ عمل کی مثال کشتی اور پتوار کی اور دعا کی مثال بادِ موافق کی ہے۔ ساحلِ مراد تک پہنچنے کے لیے جس قدر کشتی اور پتوار ضروری ہیں اسی قدر بادِ موافق بھی ضروری ہے۔ اور وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل (جدوجہد) کے بغیر دعا اپاہجوں اور ناکاروں کا کام ہے، اور دعا سے بے نیازی خدا سے بے تعلقی اور کبرِ نفس کا اظہار ہے۔ ان دونوں باتوں سے اجتناب لازمی ہے۔ دعا اور سعی و عمل کا اجتماع ہی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا ضامن ہے۔

Marfat.com

باب سوم

زکوٰۃ

Marfat.com

Marfat.com

زکوۃ (خیرات)

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں سماج کے غریبوں اور محتاجوں کی دست گیری کو نیکی کا کام نہ بتایا گیا ہو اور اس کی ترغیب نہ دی گئی ہو۔ مذہب اسلام میں بھی یہ تصور نہ صرف موجود ہے بلکہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ واضح اور جامع ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے مذاہب میں خیرات کے تصور کو پیش کیا جائے تاکہ اسلام کے تصورِ انفاق اور اس کے حکیمانہ نظامِ خیرات (زکوۃ) کو ٹھیک طور پر سمجھا جا سکے اور اس باب میں اس نے جو مفید اصلاحات کی ہیں ان کی اہمیت وافادیت بھی معلوم ہو۔

خیرات ہندو مذہب میں

ہندو مذہب میں خیرات کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس کی دو بنیادی باتوں کو ٹھیک طور پر سمجھنا ضروری ہے، اور وہ دھرم (دھرما) اور کرم (کرما) ہیں۔ دھرم کا تعلق باطن کی ساخت اور نظم وترتیب (Inner Disposition) سے ہے اور کرم دراصل عمل کا قالب ہے جس میں باطنی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی تین شکلیں (Form) ہیں، جسمانی، قولی اور ذہنی۔ جسمانی میں تمام اچھے اعمال آتے ہیں، مثلاً مہمان نوازی، بیوی اور بچوں کے حقوق کی ادائیگی اور محتاجوں کی اعانت وغیرہ، قولی میں اچھی گفتگو اور خوش اطواری، اور ذہنی میں پاکدامنی کو اہمیت حاصل ہے۔(۱)

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن (۱۹۸۷ء)، ج ۳، ص ۲۴۴

Marfat.com

ہندو مذہب میں خیرات کا تعلق عمل کی پہلی شکل سے ہے اور اس کا درجہ کافی بلند ہے۔ اصولاً اونچی ذات کے ہر ہندو کا یہ مذہبی فرض ہے کہ وہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر، جب کہ اس کے ایک لڑکا ہو جائے جو اس کی نسل کے قیام کا ذریعہ ہو، اپنی ساری جائیداد اور مال کسی برہمن کو دان کر دے یا کسی مندر پر وقف کر دے اور خود دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے بقیہ زندگی تپسیا میں گذارے اور جو خیر خیرات مل جائے اسی پر قناعت کرے۔

ہندو مذہب میں خیرات فرد کا ذاتی معاملہ ہے(۱) اس کی وجہ یہ ہے کہ ذاتِ مطلق سے اتحاد (That art thou) ویدوں کا بنیادی خیال و فلسفہ ہے۔ ہر شخص خود سے محبت کرتا ہے اس لیے وہ اپنے پڑوسی سے بھی محبت کرنے کے لیے پابند ہے کیونکہ وہ اس سے مختلف نہیں ہے، دونوں میں ذات مطلق ہی کی جلوہ گری ہے۔(۲)

ہندو مذہب میں خیرات کا مقصد یہ ہے کہ بعد کی زندگی میں اس کا اچھا بدلہ ملے۔ بعد کی زندگی سے مراد اکثر ہندوؤں کے نزدیک یہی مادی دنیا ہے اور یہ ان کے عقیدۂ

---

(۱) جین مذہب میں بھی خیرات کا انفرادی تصور ہی ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سارا زور فرد کی نشو و نما اور اس کی ذات کی تکمیل (Self cultivation and self perfection) پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر فرد اندر سے درست ہے تو وہ خود خیرات کرے گا اس کے لیے سماجی سطح پر کسی کوشش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بدھ مذہب میں بھی خیرات کا تصور ہندو اور جین مذہب سے مختلف نہیں ہے البتہ خلق خدا کے ساتھ محبت و شفقت کے معاملے میں وہ ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن، ج ۳، ص ۲۲۴)

بدھ مذہب اور جین مذہب دونوں کے نظام خیرات کا سب سے بڑا نقص، جو ہندو مذہب میں بھی ہے اور جس پر گفتگو آگے آ رہی ہے، نفس انسانی کی تذلیل ہے۔ چنانچہ دریوزہ گری کو ان کے ہاں تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ بدھ بھکشو اس معاملے میں ذلت و رسوائی کی تمام حدیں پار کر جاتے ہیں۔

(۲) لیکن یہ وحدۃ الوجودی خیال (ہمہ اوست) محض ایک فلسفیانہ نکتہ طرازی ہے۔ ہندو معاشرہ میں یہ خیال کبھی عمل کے قالب میں نہیں ڈھل سکا۔ اس معاشرہ میں شودروں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا گیا، اور آج بھی اس کا سلسلہ کم و بیش جاری ہے، وہ اس فلسفہ کی ناکامی کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

Marfat.com

اوا گون (تناسخ) کے مطابق ہے۔ دوسرا مقصد فیاضی کا اظہار ہے۔ خیرات کی چیزوں میں نقدی، مثلاً سونا، چاندی اور غیر نقدی میں جائداد و مکان وغیرہ شامل ہیں۔ مہادان میں سب سے اہم سونا ہے، اس کے بعد عمارتیں جو مندروں کے نام وقف کی جاتی ہیں۔ گئو دان کا شمار بھی ایک بڑی خیرات میں ہوتا ہے بلکہ اکثر ہندو اس کو سب سے بڑی خیرات خیال کرتے ہیں۔ مندروں اور شفا خانوں کی تعمیر اور کنوؤں اور تالابوں کی کھدائی بھی ثواب کے کام سمجھے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے موقع پر غریبوں کو کھانا کھلانے (بھوج دان) کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

ہندوؤں میں خیرات کا سب سے بڑا مصرف خود ان کا مذہبی طبقہ ہے یعنی برہمن۔ چنانچہ برہمنوں کو کھانا کھلانا بہت ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے۔ یاتریوں، درویشوں اور سنیاسیوں کی ضیافت پر بھی کافی توجہ صرف کی جاتی ہے۔ قدیم ہندوستان میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جو لاکھوں برہمنوں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ خیرات کا دوسرا بڑا مصرف گئو سالے ہیں جہاں بیمار، لولی لنگڑی اور عمر رسیدہ گایوں کو چارہ اور پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نیک ہندو کثرت سے عطیات دیتے ہیں (۱)

ہندوؤں کے نظام خیرات سے بالکل ظاہر ہے کہ وہ صرف اس کے مذہبی طبقہ کی کفالت کا ایک ذریعہ ہے، جس میں برہمن، تارک الدنیا درویش اور سنیاسی داخل ہیں۔ سماج کے غربا و مساکین کا حصہ اس میں بہت قلیل ہے۔ معذور گایوں کی کفالت پر جس قدر توجہ دی جاتی ہے اور اس کو کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی سماج کے محتاجوں اور بے سہارا لوگوں کی کفالت کے معاملے میں نظر نہیں آتا۔

ان کے تصورِ خیرات کا دوسرا بڑا نقص یہ ہے کہ اس سے مذہبی لوگوں کی شکل میں کاہلوں اور مفت خوروں کا ایک بڑا طبقہ وجود میں آجاتا ہے جس سے سماج کے غریب لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ تیسرا اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں انسان کی عزتِ نفس کا بالکل لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ بھیک مانگ کر زندگی گذارنا ان کے ہاں ایک افضل عمل ہے اور اس کی

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، ج ۳ (Charity)

Marfat.com

حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور تزکیہ نفس کے لیے اس کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ہندو مذہب کے تصورِ عبادت میں نفس کشی کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کا اثر ان کے تصورِ خیرات میں واضح طور پر موجود ہے۔

خیرات یہودی مذہب میں

یہودی مذہب میں خیرات کا تصور نہایت وسیع اور جامع ہے اور وہ اسلام کے تصورِ خیرات سے کسی حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں خیرات لینے والوں کی عزتِ نفس کا کافی لحاظ رکھا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ خیرات دیتے وقت کسی طرح کا غرورِ نفس اور ترش روئی کا اظہار نہ ہو۔(۱) بھیک مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور اسے خودداری کے منافی بتایا گیا ہے۔(۲) یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں سب سے اعلیٰ خیرات یہ ہے کہ غریب کو کچھ دینے کے بجائے اسے کسی کاروبار سے لگا دیا جائے تاکہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔(۳) تلمودی دور میں غربا و مساکین کو کھانا کھلانے کا وسیع پیمانے پر نظم تھا۔ جو لوگ اس کام پر مامور ہوتے تھے ان کو ہدایت تھی کہ وہ ان کے جذبات و احساسات کا پاس و لحاظ رکھیں اور کسی طرح ظاہر نہ ہو کہ ان کو محتاج اور بے حیثیت سمجھ کر کھانا کھلایا جاتا ہے۔(۴)

یہودی مذہب میں یہ اصول بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ خیرات کے سب سے زیادہ مستحق گھر کے لوگ ہیں (Charity begins at home)، اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے لوگ آتے ہیں۔(۵) لیکن غیر یہودی اس میں شامل نہیں ہیں۔(۶)

یہودی مذہب میں خیرات کی اخلاقی اور قانونی دونوں شکلیں پائی جاتی ہیں۔ خیرات

---

(۱) دیکھیں، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس، ج ۳، (Charity)

(۲) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (طبع یازدہم) مضمون: Charity

(۳) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن، ج ۳، ص ۲۲۲، مضمون: Charity

(۴) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس، ج ۳، مضمون: Charity

(۵) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن ، ج ۳، ص ۲۲۲، مضمون: Charity

(۶) ایضاً

Marfat.com

کی مؤخر الذکر شکل کی تفصیل کتاب خروج میں موجود ہے۔ زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ہر تیسرے سال عشر یعنی دسواں حصّہ دینا لازمی ہے۔(۱) ہر یہودی کو، جس کی عمر بیس برس یا اس سے زیادہ ہو اور خواہ وہ امیر ہو یا غریب، نقدی میں آدھا مثقال دینا واجب ہے۔(۲) عشر کے علاوہ کسانوں کو ہدایت ہے کہ غلہ کاٹتے وقت اناج کی جو بالیں زمین پر گر جائیں یا کھلیان میں ادھر اُدھر ہو جائیں ان کو چھوڑ دیں۔ اسی طرح درختوں سے پھل توڑتے وقت ضروری ہے کہ کچھ پھل درختوں پر چھوڑ دیے جائیں۔ یہ غریبوں اور مسافروں کا حق ہے۔

ابتدا میں صدقہ سے متعلق ساری چیزیں اور نقدی بیت المقدس کے بیت المال میں جمع ہوتی تھیں اور وہاں سے مختلف کاموں میں خرچ کی جاتی تھیں۔ اس کا ساٹھواں حصّہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے اور دسواں حصّہ حضرت ہارون کی اولاد قومی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی۔ اور ہر تیسرے سال جو دسواں حصہ نکالا جاتا تھا اس سے مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر کھلایا جاتا تھا۔ نصف مثقال نقد زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمہ (عبادت گاہ) اور قربانی کے آلات اور برتنوں کی خریداری میں خرچ کی جاتی تھی۔(۳)

یہودی مذہب کے نظام خیرات کی ایک بڑی خرابی، جو ہندو مذہب کے نظام خیرات میں بھی موجود ہے، یہ ہے کہ اس کا بڑا حصہ مذہبی طبقہ کے لیے مخصوص ہے اور اس سے طرح طرح کی اخلاقی، سماجی اور معاشی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسری قابل ذکر خرابی یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ امیر کے ساتھ غریب پر بھی ایک متعین مقدار (نصف مثقال) میں واجب ہے، جو یقیناً اس طبقہ کے ساتھ ایک بڑی زیادتی ہے۔

خیرات عیسائی مذہب میں

عیسائی مذہب میں محبت کے تصور کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ محبت ہی خدا ہے اس لیے جو شخص محبت کو نہیں جانتا وہ خدا کو بھی نہیں جانتا۔ خدا کی محبت کا تقاضا ہے کہ اس کے

---

(۱) کتاب احبار، باب ۲۷: ۳۰-۳۲

(۲) کتاب خروج، باب ۳۰: ۱۳-۱۵

(۳) ایضاً، باب ۳۰: ۱۶، ۳۸، ۲۶

Marfat.com

بندوں سے بھی محبت کی جائے۔اس میں یہودی اور غیر یہودی کی کوئی قید نہیں ہے۔غیر یہودی کو بھی خیرات دی جاسکتی ہے اور غلام کو بھی۔(۱) انجیل لوقا میں ہے:

''دو اور تم کو دیا جائے گا، جو تم سے سوال کرے اس کو دو اور جو تمہارے اسباب لے جائے اس سے واپس نہ مانگو، اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو، ان کو قرض دو اور ناامید نہ کرو، تمہارا انعام بہت بڑا ہوگا اور تم اس اعلیٰ وارفع ذات کے فرزند بن جاؤ گے کیونکہ وہ ناشکر گزار اور بدآئین کے ساتھ بھی مہربانی کرتا ہے۔)''(۲)

عیسائی مذہب میں صدقہ وخیرات کی حیثیت اخلاقی ہے، اس کو دستوری اور قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے جیسا کہ یہودی مذہب میں ہے، اور یہ اس کا ایک بڑا نقص ہے۔لیکن اس کے باوجود ہم حیرت انگیز طور پر دیکھتے ہیں کہ آج عیسائی انجمنیں اور افراد بھی جس طرح دل کھول کر غریبوں، ناداروں اور آفت رسیدہ لوگوں کی امداد کرتے ہیں اس کی مثال دوسری قوموں میں کم ملتی ہے۔اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار لکھتا ہے:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مخلص پیروؤں نے غربا و مساکین کی امداد و اعانت کو ہر عیسائی کا بنیادی فرض قرار دیا ہے۔اور اس فرض کا تعلق اس رشتہ سے ہے جو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے توسط سے خدا کے ساتھ رکھتے ہیں۔اس تعلق کو تسلیم کر لینے کا لازمی نتیجہ خیرات اور نیکی کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔''(۳)

خیرات اسلام میں

اسلام نے نہ صرف خیرات کا اعلیٰ تصور دیا بلکہ اس کے لیے ایک ایسا حقیقت پسندانہ اور مبنی بر عدل نظام وضع کیا جو دوسرے مذاہب میں نہیں پایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں اسلام نے جو اصلاحی اقدامات کیے وہ قابل ذکر ہیں۔اسلام نے سب سے پہلا اصلاحی کام یہ کیا کہ صدقہ وخیرات کو عبادت کا درجہ دیا۔چنانچہ نماز کے بعد اس کو ایک دوسری بڑی عبادت

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن، ج۳،ص۲۲۴

(۲) انجیل لوقا، باب ۶، ۳۰، ۳۵

(۳) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، ج۳،ص۳۸۲، مزید دیکھیں،ص ۳۸۳ تا ۳۸۵

Marfat.com

کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن میں جہاں اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) کا حکم ہے اس کے ساتھ ہی تقریباً ہر جگہ ''واٰتوا الزکوٰۃ'' (زکوٰۃ دو) کی ہدایت بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ نماز میں شامل اور اس کا جزوِ لاینفک ہے۔ جس طرح عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک مومن خدا کی یاد اور اس سے مضبوط تعلق کے لیے نماز قائم کرے اسی طرح یہ بھی تقاضائے توحید ہے کہ وہ خدا کے بخشے ہوئے مال سے غریبوں کی مدد کرے۔ توحید کے ان دو بنیادی تقاضوں کا ذکر سورہ بقرہ کی بالکل ابتدائی آیات میں ہوا ہے:

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○

''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے غریبوں کی امداد و اعانت کو خود اپنا حق قرار دیا ہے:
وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (سورہ انعام: ۱۴۱) ''اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو''۔ ایک حدیث قدسی میں اس مضمون کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ روز آخرت فرمائے گا:

''اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری عیادت نہ کی۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب! میں بھلا تیری عیادت کیونکر کرتا تو تو پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ اگر تو اس کی خبر گیری کو جاتا تو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب! میں تجھے کیونکر کھانا کھلاتا تو تو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں (بھوکے) بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ اگر تو اس کو کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب! میں تجھے پانی کیونکر پلاتا تو تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائے گا: میرے فلاں (پیاسے) بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا۔ اگر تو اس کو

Marfat.com

پلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔"(۱)

اس باب میں اسلام کی دوسری اصلاح یہ ہے کہ اس نے جہاں مالداروں کو صدقہ و خیرات کی تلقین کی وہاں غربا و مساکین کو ہدایت کی کہ وہ سوال سے حتی الامکان گریز کریں کہ اس سے انسان کی فطری غیرت مجروح ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

" والذی نفسی بیده لا یاخذ احدکم حبله فیحتطب علیٰ ظهره خیر له من ان یاتی رجلاً فیسأله، اعطاه او منعه(۲)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کسی شخص کا رسّی لے کر لکڑی چننا اور پھر اپنی پیٹھ پر اس کا بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے، وہ اس کو دیدے یا نہ دے۔"

ایک بار ایک غریب انصاری آنحضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور مدد چاہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ انھوں نے عرض کیا، میرے پاس صرف ایک ٹاٹ ہے جس کے ایک حصہ کو اوڑھتا ہوں اور دوسرے کو بچھاتا ہوں، اس کے علاوہ ایک پیالہ ہے جس سے پانی پیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، جاؤ انھیں لے آؤ۔ وہ لے آئے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا: ان دونوں چیزوں کو کون خریدتا ہے؟ ایک صحابی نے کہا، میں ایک درہم میں خریدتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، ایک درہم پر کون اضافہ کرتا ہے۔ ایک دوسرے صحابی نے دو درہم میں یہ چیزیں خرید لیں۔ آپ نے یہ دو درہم غریب انصاری کو دیے اور فرمایا کہ ایک درہم سے غلہ خرید کر گھر پہنچا دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر لاؤ۔ انصاری صحابی نے ایسا ہی کیا اور کلہاڑی خرید کر نبی ﷺ کے پاس لائے۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے اس میں لکڑی ٹھونکی اور اسے انصاری صحابی کو دیتے ہوئے فرمایا:

إذهب، فاحتطب وبع ولا نرينك خمسة عشر يوماً

"جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بیچو اور میں تمہیں پندرہ دن تک نہ دیکھوں (یعنی ۱۵ دن تک ملاقات نہ کرنا)

غریب انصاری پندرہ دن کے بعد خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور فرمایا،

---

(۱) مسلم، رواہ ابو ہریرہؓ (۲) بخاری، کتاب الزکوۃ، باب: الاستعفاف عن المسئلۃ

Marfat.com

یارسول اللہ! میں نے اتنے دنوں میں دس درہم کمائے، جس میں سے چند درہم میں کپڑے خریدے اور چند درہم میں کھانے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے انصاری صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

هذا خير لك من ان تجى والمسئلة نكتة فى وجهك يوم القيامة(۱)

''یہ تمہارے حق میں اس سے بہتر ہے کہ تم قیامت کے دن اس حال میں آؤ کہ تمہارے چہرے پر بھیک (سوال) داغ بنی ہو۔''

جو لوگ سوال کے عادی ہو جاتے ہیں اور گداگری کو پیشہ بنا لیتے ہیں ان کو آپ ﷺ نے ان لفظوں میں خبردار کیا ہے:

ما زال الرجل يسئل الناس حتى ياتى يوم القيامة ليس فى وجهه مضغة لحم (۲)

''آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے یہاں تک کہ وہ روز قیامت اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔''

اس اصلاح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ بعض مذاہب میں، جیسا کہ بیان ہوا، بھیک مانگنا نیکی کا کام سمجھا گیا ہے۔

صدقہ وخیرات کے سلسلے میں اسلام کی تیسری بڑی اصلاح یہ ہے کہ اس نے اس کی فہرستِ مصارف سے مذہبی طبقہ کو یک قلم خارج کر دیا اور تمام خیراتی رقوم سماج کے محتاجوں اور ناداروں کی اعانت اور دوسرے نیک کاموں کے لیے مختص کر دی۔ نبی ﷺ نے صاف لفظوں میں فرمایا ہے:

''ان الصدقة لاتحل لنا: صدقہ ہمارے (یعنی خاندان بنی ہاشم کے) لیے جائز نہیں ہے۔''(۳)

آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں اس اصول پر سختی کے ساتھ عمل فرمایا تاکہ آئندہ کسی

---

(۱) ابوداؤد، ترمذی رواہ حضرت انسؓ

(۲) بخاری، کتاب الزکوۃ، باب: من سئل الناس تکثرا (۳) اصحاب سنن، رواہ ابورافع عن النبی ﷺ

Marfat.com

کو اس باب میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ: ''نبی ﷺ کے پاس جب کھانا لایا جاتا تو آپ پوچھتے کہ ہدیہ ہے؟ اگر اثبات میں جواب ملتا تو کھا لیتے ورنہ اپنے اصحاب سے فرماتے کہ تم لوگ کھا لو۔(۱) ایک بار حسن بن علیؓ نے صدقہ کی ایک کھجور اٹھا کر اپنے منہ مین رکھ لی تو آپ ﷺ نے فرمایا، اس کو منہ سے نکال دو، کیا تم کو نہیں معلوم کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے۔(۲)

چوتھی بڑی اصلاح یہ ہے کہ اسلام نے صدقہ و خیرات کے لیے جہاں ترغیب و تحریص سے کام لیا وہاں اس کے لیے ایک قانون بھی بنایا لیکن یہودی مذہب کے برخلاف اس کا اطلاق صرف مالداروں پر کیا(۳) البتہ غریبوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ حسب توفیق صدقہ (نفلی خیرات) کریں۔ قانون بنانے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے ایک طرف غریبوں کی امداد و اعانت کا ایک مستقل بندوبست ہوا تو دوسری طرف خود مالداروں کو اس سے فائدہ پہنچا یعنی حبِّ مال سے گلوخلاصی ان کے لیے آسان ہوگئی۔

اسلام کی پانچویں اصلاح کا تعلق وجوب زکوٰۃ کی مدت اور اس کے نصاب سے ہے۔ یہود کی شریعت میں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ہر تیسرے سال عشر واجب ہے۔ تین سال کا وقفہ غربا کی ضرورتوں کے لحاظ سے زیادہ طویل ہے۔ اسلام نے یہ مدت گھٹا کر ایک سال کر دی یعنی ہر سال زکوٰۃ واجب کی۔

یہودی نظام خیرات میں پیداوار اور پھل کی شرحِ زکوٰۃ یکساں ہے، خواہ وہ محنت و مشقت سے حاصل ہو اور خواہ معمولی محنت سے۔ اسلام نے پیداوار کی ان دونوں قسموں میں فرق کیا۔ بارانی پیداوار پر نصف عشر اور غیر بارانی پر عشر رکھا۔ یہودی مذہب میں زکوٰۃ براہ راست غریبوں کو نہیں دی جاتی ہے بلکہ کھانا پکوا کر ان میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس سے غریبوں کا غذائی مسئلہ تو حل ہو جاتا ہے لیکن ان کی دوسری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ اسلام

---

(۱) بخاری، مسلم

(۲) ایضاً

(۳) توریت میں ہے ''خداوند کے لیے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے زیادہ امیر نہ دے اور غریب کم نہ دے۔''
(خروج، باب ۳۰:۱۵)

Marfat.com

میں زکوٰۃ غریبوں کے حوالے کردی جاتی ہے اور وہ آزاد ہیں کہ جس طرح چاہیں اس کو استعمال میں لائیں۔ اسلامی شریعت میں تملیک ادائیگیِ زکوٰۃ کی ایک لازمی شرط ہے۔

متذکرہ بالا اصلاحات سے بالکل واضح ہو گیا کہ اسلام کا نظامِ خیرات (زکوٰۃ) حد درجہ حکیمانہ اور غربا و مساکین کے ساتھ انصاف اور ان کی خیر خواہی پر مبنی ہے، جیسا کہ اگلے صفحات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

زکوٰۃ اور صدقہ

اسلام میں خیرات کے لیے دو لفظ مستعمل ہیں، ایک زکوٰۃ اور دوسرا صدقہ۔ یہ دونوں لفظ بطور شرعی اصطلاح کے کثیر الاستعمال ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے مسلمان، جن میں تعلیم یافتہ مسلمان بھی شامل ہیں، ان کے لغوی اور اصطلاحی مفہومات سے ناواقف ہیں اور شرعی اعتبار سے ان دونوں اصطلاحوں میں جو فرق ہے اس سے بھی بے خبر ہیں۔ درج ذیل سطور میں ان دونوں اصطلاحوں کے معنی و مفہوم اور ان کے شرعی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کا مفہوم

زکوٰۃ کا لفظ زکا یزکو اسے ہے، جس کے ایک معنی پاک ہونے کے ہیں۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

فَاَرَدْنَا اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْراً مِّنْهُ زَكوٰةً وَاَقْرَبَ رُحْماً ○

(سورہ کہف ـ ۸۱)

''پس ہم نے چاہا کہ ان کا پروردگار ان کو اس جگہ ایک ایسا فرزند عطا کرے جو پاکیزگی (صالحیت) میں اس سے بہتر ہو اور (ماں باپ کے ساتھ) محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيّاً ○ وَحَنَاناً مِنْ لَدُنَّا وَ زَكوٰةً ط وَ كَانَ تَقِيّاً ○ (سورہ مریم : ۱۲، ۱۳)

''اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں قوت فیصلہ اور خاص اپنے پاس سے گداز قلب اور پاکیزگی عطا کی اور وہ نہایت پرہیز گار تھا۔''

Marfat.com

ان دونوں آیتوں میں زکوٰۃ کا لفظ ایک کم عمر لڑکے کی ایک باطنی خوبی کے اظہار کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی پاکیزہ خصلت۔ اس معنی میں یہ لفظ سورہ مریم ہی میں ایک اور جگہ بطورِ اسم صفت استعمال ہوا ہے:

قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (آیت : ۱۹)

''فرشتے نے کہا، میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ (صالح) لڑکا عطا کروں۔''

زکا ہی سے ازکیٰ ہے، زیادہ پاکیزہ کے معنی میں، مثلاً:

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥

(سورہ بقرہ: ۲۳۲)

''یہ تمہارے لیے زیادہ مفید اور پاکیزہ طریقہ ہے، اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔''

دوسری جگہ ہے:

فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ ٥

(سورہ کہف: ۱۹)

''وہ شخص تحقیق کرلے کہ شہر کے کس حصے میں زیادہ طیب (پاکیزہ) کھانا ملتا ہے اور وہاں سے کچھ کھانا تمہارے لیے لے آئے۔''

ایک اور مقام پر ہے:

وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ ٥

(سورہ نور: ۳۰)

''اور وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریقہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔''

زکا یزکوا کے ایک دوسرے معنی بڑھنے اور نشو و نما پانے کے ہیں۔ زکا الزرع کے معنی ہوں گے، کھیتی بڑھی۔ دراصل جو چیز پاکیزہ اور عمدہ ہوتی ہے اس میں نمو کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسی زمین کو جو کنکر پتھر سے بالکل پاک صاف ہو عربی میں '' ارض زکیۃ'' کہتے ہیں یعنی زرخیز زمین۔ اسی مادہ سے تزکیہ کا لفظ ہے جس کے ایک معنی پاک کرنے کے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ایک جگہ ہے:

Marfat.com

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ط (سورہ توبہ : ۱۰۳)

''تم ان کے مالوں کا صدقہ قبول کرو، اس سے تم ان کو (حبِ مال سے) پاک کرو گے۔ اوران کے لیے دعا کرو۔''

دوسری جگہ ہے:

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(سورہ بقرہ : ۱۷۴)

''خدا ان سے روز قیامت نہ تو بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

ایک اور مقام پر ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ الخ • (سورہ جمعہ: ۲)

''وہ جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے اصلی معنی طہارت اور پاکیزگی کے ہیں اور پاکیزگی کی فطرت میں نشوونما ہے۔ علامہ زمخشری نے سورہ مومنون کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: ''زکوٰۃ ذات اور معنی دونوں کے درمیان اسم مشترک ہے۔ پس ذات تو نصاب کی وہ مقدار ہے جس کو زکوٰۃ نکالنے والا حاجت مندوں کو نکال دیتا ہے اور معنی زکوٰۃ دینے والے کا فعل ہے جس کا نام تزکیہ ہے۔''(۱) علامہ ناصر بن عبد السید مطرزی لکھتے ہیں: ''زکوٰۃ کے معنی تزکیہ کے ہیں۔ ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۔ پھر زکوٰۃ مال کی اس مقدار کا نام پڑ گیا جو فقراء کے لیے نکالی جاتی ہے۔ ترکیبِ الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی طہارت کے ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کے معنی زیادتی اور نمو کے ہیں اور یہی ظاہر ہے۔''(۲)

انفاق کے لیے اس لفظ کے استعمال کی وجہ اس کے مذکورہ معنوں سے بالکل واضح ہے۔ شریعت اسلامی کی نظر میں وہ مال، جس میں سے غربا و مساکین اور دوسرے مستحقین کا حق

---

(۱) کشاف، ج ۲، ص ۶۱

(۲) دیکھیں، المغرب فی ترتیب المعرب، الزاء الکاف

Marfat.com

نہ نکالا گیا ہو (وفی اموالھم حق للسائل والمحروم: ذاریات ۔۱۹) گندہ اور خراب مال ہے ۔ یہ گندگی اور خرابی دراصل بخل اور حبِ مال ہے ۔ چنانچہ جب نفس اس گندگی سے آلودہ ہو جاتا ہے تو مال دار اپنا مال نکالنے میں تنگی محسوس کرتا ہے اور جان بوجھ کر غربا و مساکین کا حق دینے سے اعراض کرتا ہے ۔ لیکن جو اصحابِ ثروت اپنے مال میں سے غریبوں اور محتاجوں کا حق نکال کر ان کے حوالے کر دیتے ہیں ان کا نفس حبِ مال کی آلودگی سے پاک ہو جاتا ہے ۔ اور یہی اس کا تزکیہ ہے ۔

زکوٰۃ کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ جب مال حدِ نصاب کو پہنچ جائے تو صاحب مال پر نصاب کے مطابق زکوٰۃ نکالنا واجب ہے ۔

صدقہ کا مفہوم

زکوٰۃ کی طرح صدقہ بھی ایک اہم شرعی اصطلاح ہے اور تحریر و تقریر دونوں میں بکثرت مستعمل ہے ۔ اس کے لغوی معنی خیرات کے ہیں، یعنی کسی عوض معاوضہ کا خیال کیے بغیر محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے مال کو غربا و مساکین پر خرچ کرنا ۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمِنۡهُم مَّنۡ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ الخ ۝

(سورہ توبہ: ۷۵)

''اور ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اس نے ہم کو اپنے فضل سے (بہت سا مال) عطا فرمایا تو ہم خوب خیرات کریں گے ۔''

دوسری جگہ ہے:

فَاَوۡفِ لَنَا الۡكَيۡلَ وَتَصَدَّقۡ عَلَيۡنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجۡزِى الۡمُتَصَدِّقِيۡنَ ۝ (سورہ یوسف ۔۸۸)

''پس آپ ہمیں غلہ پورا دیجیے اور ہم کو خیرات بھی دیں ۔ بے شک اللہ خیرات کرنے والوں کو (اچھا) بدلہ دیتا ہے ۔''

زکوٰۃ اور صدقہ میں فرق

صدقہ اور زکوٰۃ میں ایک فرق تو لغوی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور دوسرا فرق

Marfat.com

اصطلاحی ہے گو کہ انفاق کا مفہوم دونوں میں مشترک ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی بالکل ابتدا میں اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کے بجائے مجرد انفاق کا لفظ استعمال ہوا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ o (آیات: ۲، ۳)

''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

عربی زبان میں عام انفاق کے لیے صدقہ کا لفظ موجود تھا اور باعتبار معنی یہی لفظ دنیا کی ہر زبان میں اس نوع کے انفاق کے لیے مستعمل ہے۔ مثلاً اردو میں اس کو خیرات، انگریزی میں چیرٹی اور ہندی میں دان پُن کہتے ہیں۔ لیکن صدقہ کے لفظ سے غایت انفاق کی توضیح جو شریعت اسلامی کی نظر میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، ممکن نہ تھی اس لیے شارعِ حقیقی نے زکوٰۃ کے لفظ کا اضافہ کیا جو اس مقصد کے لیے نہایت موزوں لفظ ہے۔ چنانچہ قرآن میں جہاں اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ مجرد انفاق کا حکم بیان ہوا ہے وہاں زکوٰۃ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے تاکہ حکم انفاق کے ساتھ غایتِ انفاق بھی واضح ہو جائے جو دراصل حبِ مال سے نفس کا پاک ہونا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضاً حَسَناً ط

(سورہ مزمل: ۲۰)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو عمدہ قرض دو۔''

اس کے برعکس جہاں اقامت صلوٰۃ کے ذکر کے بغیر صرف انفاق مال کی تاکید و ترغیب یا حکم زکوٰۃ کی تفصیل ہے وہاں صدقہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً:

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقٰتٍ ط

(سورہ مجادلہ: ۱۳)

''کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ پیش کرو۔''

دوسری جگہ ہے:

Marfat.com

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ط (سورہ بقرہ: ۲۷۱)

''اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی اچھی بات ہے اور اگر تم ان کو چھپا کر فقیروں کو دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا الخ

(سورہ توبہ: ۶۰)

''صدقات تو بس فقراء و مساکین اور ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس کی تحصیل پر مقرر ہیں۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ صدقہ کی دو قسمیں ہیں، صدقۂ واجبہ (مکتوبہ) اور صدقۂ نافلہ مؤکدہ۔ صدقۂ واجبہ کا تعلق مال داروں سے ہے۔ اس کے لیے ایک نصاب ہے جو شریعت کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اور اغنیاء کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ نکالنے کے لیے اس نصاب کی پیروی کریں۔ الصدقات للفقراء والمساکین الخ میں صدقۂ واجبہ کا ذکر ہے۔ حدیث: لیس فیما دون خمسة اوسق صدقة (بخاری): ''پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں ہے۔'') میں بھی صدقہ سے صدقۂ واجبہ ہی مراد ہے۔ اور اسی کو اصطلاحاً زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

صدقۂ نافلہ مؤکدہ کا تعلق امراء، متوسط الحال اور غربا تینوں سے ہے۔ اس کے لیے نہ کوئی نصاب ہے اور نہ ہی کوئی وقت مقرر ہے۔ یہ صدقہ نکالنے والے کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ کب اور کس مقدار میں نکالے۔ ''وان تبدوا الصدقات فنعما ھی'' میں صدقات سے صدقۂ نافلہ مراد ہے۔ ''وان تخفوھا'' کا جملہ اس کی طرف واضح اشارہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ آیت: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (سورہ بقرہ: ۲۶۴) میں بھی صدقات سے مراد صدقۂ نافلہ ہے کیونکہ منّ واذیٰ یعنی احسان اور تکلیف کا معاملہ اسی صورت میں پیش آ سکتا ہے جب صدقہ نکالنے والا اپنی مرضی سے جس کو چاہے دے، اور یہ صدقۂ نافلہ ہی میں ممکن

Marfat.com

ہے کیونکہ صدقۂ واجبہ کی وصولی اور تقسیم کا کام اسلامی ریاست کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

وجوبِ انفاق

مسلمانوں میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ انفاق صرف ان لوگوں پر واجب ہے جو صاحب نصاب ہیں یعنی امراء، متوسط الحال اور غربا پر یہ واجب نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی مسلمانوں میں کب اور کن اسباب سے پیدا ہوئی اس کا سراغ میں کوشش کے باوجود نہیں لگا سکا۔ اس حقیقت کو بہرحال تسلیم کرنا ہوگا کہ جس طرح نماز عبادت ہے اور ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اسی طرح انفاق بھی عبادت ہے اور تمام افرادِ امت پر بقدرِ استطاعت واجب ہے۔ اس عبادت سے کوئی مسلمان بھی، خواہ وہ غریب کیوں نہ ہو، مستثنیٰ نہیں ہے آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے اور حیران بھی ہوں گے کہ آج سے پہلے کسی عالم نے انفاق کو تمام مسلمانوں پر واجب قرار نہیں دیا۔ لیکن اس میں نہ تو حیرانی کی کوئی بات ہے اور نہ ہی یہ کوئی نرالی بات ہے۔ اگر کسی عالم نے اب تک یہ بات آپ کو نہ بتائی تو اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ شمعِ زندگی گل ہونے سے پہلے آپ کے ایک دینی رفیق نے یہ بات آپ کو بتادی۔ اب قرآن و حدیث سے وجوبِ انفاق کے دلائل ملاحظہ فرمالیں۔

قرآن مجید میں، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا، جہاں اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر آیا ہے وہاں بالعموم ایتائے زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے اس لیے ماننا ہوگا کہ زکوٰۃ نماز کے حکم میں داخل ہے۔ دین میں جو حیثیت نماز کی ہے وہی حیثیت ایک درجہ فرق کے ساتھ زکوٰۃ کی ہے۔ نماز اور زکوٰۃ میں اتنی مناسبتیں موجود ہیں کہ اگر آپ تنہا انہی پر غور کریں تو انفاق کا وجوب بالکل واضح ہوجائے گا۔

نماز کا تعلق اگر خدا کے حق سے ہے تو زکوٰۃ کا تعلق بندوں کے حق سے ہے۔ دونوں کی اصل واساس محبت ہے۔ نماز کے بیان میں ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (سورہ طہٰ:۱۴) ''میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔'' انفاق کے ذکر میں ہے: وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ٥ (سورہ دہر:۹) ''وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں گو کہ

Marfat.com

خود اس کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔'' دونوں کی غرض و غایت تزکیۂ نفس ہے۔ نماز کے بیان میں ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ (سورہ عنکبوت: ۴۵) ''بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔'' صدقہ کے ذکر میں ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَ تُزَکِّیْھِمْ بِھَا ؕ (سورہ توبہ: ۱۰۳) ''تم ان کے مالوں کا صدقہ قبول کرو، اس کے ذریعے تم ان کو پاک کرو گے۔''

دونوں عبادتیں باعتبار مقدار معیّنہ بھی ہیں اور غیر معیّنہ بھی۔ فرض نمازوں کے ساتھ نوافل ہیں اور صدقۂ واجبہ (زکوٰۃ) کے ساتھ صدقۂ نافلہ ہے۔ دونوں کے لیے اوقات اور جگہیں مقرر ہیں۔ نماز کے لیے پانچ اوقات اور مساجد، اور زکوٰۃ کے لیے حولانِ حول اور بیت المال۔ جس طرح نماز کے لیے مؤذن اور امام مقرر ہیں اسی طرح زکوٰۃ کے لیے امیر اور عاملین (وصول کنندگان) کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح افضل نماز وہ ہے جو مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی جائے، اسی طرح افضل زکوٰۃ وہ ہے جو اجتماعی طور پر نکالی جائے، یعنی کسی امیر کی نگرانی میں بیت المال میں جمع ہو اور پھر خرچ کی جائے۔ جس طرح حالت سفر میں نماز کے لیے قصر ہے اسی طرح غربت میں صدقۂ نافلہ ہے۔

نماز اور زکوٰۃ کی ان مناسبتوں کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کریں کہ اس کا حکم کیا ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں ایک دو نہیں متعدد مقامات پر جس قدر شدید ترغیب و تحریص کے انداز میں اور عمومی حیثیت سے انفاق کا ذکر آیا ہے وہ اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ جس شخص کو اس امر میں ذرہ برابر شبہ ہو وہ صرف سورہ بقرہ کی ۲۶۰ سے ۲۷۴ تک کی آیات کو غور سے پڑھ لے۔ اسی سورہ کے بالکل آغاز میں متقین کی جن صفات کا ذکر ہوا ہے ان میں ایک صفت انفاق ہے۔ اور سلسلۂ کلام اس آیت پر ختم ہوا ہے:

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؕ

''یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہدایت اور کامیابی کا مدار جن باتوں پر ہے ان میں ایک اہم چیز انفاقِ مال ہے۔ یہی بات سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں کہی گئی ہے۔ اس آیت میں نیکی

Marfat.com

کی جو تعریف کی گئی ہے اور جن لوگوں کو نیک کہا گیا ہے ان کی خوبیوں میں سے ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنا مال اس کی محبت و حاجت کے باوجود، رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، سائلوں اور دوسرے حاجت مندوں کی حاجت روائی میں خرچ کرتے ہیں۔ سورہ ابراھیم (آیت ۳۱) میں صاف لفظوں میں اہل ایمان کو انفاق کی تاکید کی گئی ہے: قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سرًا و علانية ''میرے بندوں سے، جو ایمان لائے ہیں، کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے خرچ کریں، کھلے اور چھپے دونوں طور پر''

ایک حدیث سے بھی انفاق کے وجوب کا ثبوت ملتا ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ:
''ایک بار نبی ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ واجب ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، اگر اس کو مقدور نہ ہو، ارشاد ہوا کہ کوئی کام کرے، خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے۔ صحابہؓ نے کہا کہ اگر اس کو اس کی قدرت نہ ہو یا وہ ایسا نہ کرے، فرمایا تو پھر مصیبت زدہ محتاج کی مدد کرے۔ صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے، فرمایا تو پھر نیکی کا حکم دے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے، فرمایا تو پھر بدی سے باز رہے کہ یہی اس کا صدقہ ہے۔(۱)

اس ارشاد نبوی کو سننے کے بعد غریب صحابہ جنگل سے لکڑی کاٹ کر لاتے، بازار میں اس کو فروخت کرتے اور صدقہ کرتے تھے۔ اگر صدقہ عہد نبوی میں عام لوگوں پر واجب تھا تو آج کیوں نہیں؟

یہ ایک عجیب بات ہے کہ فقہاء نے نوافلِ نماز کو مؤکدہ اور غیر مؤکدہ میں تقسیم کیا ہے اور سنتِ مؤکدہ کے تارک کو گنہگار قرار دیا ہے لیکن صدقۂ نافلہ کا تارک ان کے نزدیک گنہگار نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ دونوں کی حیثیت مؤکد نوافل کی ہے پھر ایک کا تارک گنہگار اور دوسرے کا تارک گنہگار کیوں نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ نوافل کا تارک گنہگار ہو یا نہ ہو لیکن صدقۂ نافلہ کا تارک تو بہر حال گنہگار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صدقۂ نافلہ کے ترک کی صورت میں انفاق کا ترک یقینی ہے، اگر وہ مال دار نہیں ہے۔ لیکن نوافل کے ترک سے ترکِ نماز لازم

(۱) بخاری، کتاب الادب، باب، کل معروف صدقہ

Marfat.com

نہیں آتا کہ فرض نمازوں کا قیام بہر صورت لازمی ہے۔

حقیقتِ زکوٰۃ

جس طرح نماز خدا سے محبت کا اظہار ہے اسی طرح زکوٰۃ خدا کے بندوں سے محبت کی علامت ہے، اور ان ہی دو محبتوں پر دین کی بنیاد ہے۔ مؤخر الذکر محبت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حبِ مال ہے۔ انسان کے نفس میں نہ صرف مال کی محبت پائی جاتی ہے بلکہ جمعِ مال اور تکاثرِ مال کا شدید جذبہ بھی موجود ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر انسانی نفس کی اس خصوصیت کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (سورہ عادیات)

''وہ مال کی محبت میں سخت ہوتا ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۔ (سورہ الفجر ۔ ۲۰)

''اور تم لوگ مال سے بے پناہ محبت رکھتے ہو۔''

ایک اور مقام پر ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ O (سورہ تکاثر)

''تم کو بکثرت مال کی طلب و مسابقت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔''

مال سے اس فطری لگاؤ کی وجہ سے بسا اوقات بہت سے لوگ غلط روش اختیار کرتے ہیں اور جائز اور ناجائز ہر طریقے سے مال کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور خرچ میں بھی بالعموم بے اعتدالی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جو مالدار سخی ہوتے ہیں وہ اپنا مال زیادہ تر اپنی شان و امارت کے دکھاوے میں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح مال ضائع کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف بخیل مالدار اپنا مال خرچ کرنے کے بجائے اس کو سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ اس طرح مال کی منفعت سے سماج محروم ہو جاتا ہے۔ مذکورہ دونوں ہی قسم کے مالدار کسب مال میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ سماج کے غربا و مساکین وغیرہ کی حالت زار کی طرف ان کا

Marfat.com

دھیان ہی نہیں جاتا اور وہ ان کی دست گیری سے محروم رہ جاتے ہیں۔

زکوٰۃ انسان کے مذکورہ غیر معتدل طرز عمل کی اصلاح کرتی ہے۔ وہ نہ صرف ان کے دلوں کو حبِ مال سے پاک کرتی ہے اور خرچ کے صحیح محل سے انھیں آگاہ کرتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ جو مال بھی غربا اور مساکین کی خبر گیری میں اور دوسرے نیک کاموں میں خدا کی رضا اور خوشنودی کی غرض سے خرچ کریں گے اس سے ان کے مال میں کوئی کمی نہ ہوگی بلکہ اس میں اضافہ ہوگا۔ اس کے علاوہ روز آخرت خدا کا قرب اور اس کی رضا مندی بھی حاصل ہوگی جیسا کہ درج ذیل سورتوں میں ارشاد ہوا ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا ○

(سورہ توبہ ۱۰۳:۹)

''تم ان کے مالوں کا صدقہ قبول کرو، اس سے تم ان کو پاک و صاف کرو گے اور ان کو پاکیزہ بناؤ گے''

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ○ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهُ يَتَزَكّٰى ○ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى ○ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ○ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى۔ (سورۃ الّیل: ۱۷ تا ۲۱)

''اور جہنم سے محفوظ رکھا جائے گا وہ خدا سے ڈرنے والا آدمی جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے، اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں کہ وہ (دے کر) اس کو اتارتا ہو، وہ تو بس اپنے خدائے برتر کی خوشنودی کے لیے (دیتا ہے)، اور وہ عنقریب راضی ہوگا۔''

وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (سورہ روم۔ ۳۹)

''اور تم جو زکوٰۃ بھی دو گے اللہ کی رضا کے لیے تو یہی لوگ ہیں جو (دراصل) اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں''۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○

(سورہ تغابن۔ ۱۶)

Marfat.com

''اور جو نفس کے بخل سے محفوظ رکھے گئے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

مذکورہ سورتوں کے مضامین سے بالکل واضح ہے کہ زکوٰۃ نماز کی طرح ایک عبادت ہے، جیسا کہ شروع میں بیان ہوا۔ بعض اصحاب علم نے زکوٰۃ کے احکام (نصاب اور امیر کی طرف سے وصولی وغیرہ) کو دیکھ کر اس کو ایک ٹیکس سمجھ لیا جو صحیح نہیں ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معینہ زمانے میں ایک معینہ شرح سے ایک معینہ چیز پر ہم رقم وصول کریں اور دینے سے انکار کرنے والے سے بالجبر وصول کریں تو اس لفظ کا پورا پورا اطلاق زکوٰۃ پر بھی ہوتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر حمید اللہ کو زکوٰۃ میں جو جبر کا پہلو نظر آتا ہے وہ نماز جیسی عبادت میں بھی موجود ہے۔ کیا اسلامی ریاست میں کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ علانیہ نماز نہ پڑھے اور حکّامِ ریاست اس سے تعرّض نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے زکوٰۃ میں جبر کے پہلو کو دیکھ کر اس کو عبادت کے زمرہ سے خارج کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ غلط فہمی اس وجہ سے لاحق ہوئی کہ انھوں نے اکثر علماء کی طرح زکوٰۃ کو فقہی مفہوم میں لیا لیکن زکوٰۃ کا ایک عمومی پہلو بھی ہے اور اس لحاظ سے انفاق ہر مسلمان پر واجب ہے جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں اقیموا الصلوٰۃ کا ذکر ہے وہاں متصلاً ہی واٰتوا الزکوٰۃ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ التزام اور اسلوبِ کلام بتاتا ہے کہ زکوٰۃ نماز کے حکم میں ہے یعنی وہ بھی نماز کی طرح ایک عبادت ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت

دین اسلام کی عمارت جن دو بڑے ستونوں پر کھڑی ہے ان میں سے ایک ستون کا نام نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے۔ اگر ان میں سے ایک ستون بھی گر گیا تو دین کی عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔ اسلام ہی نہیں، اہل کتاب کے دین میں بھی زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

---

(۱) خطبات بہاولپور، ص ۳۹۰

Marfat.com

وَمَآ اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

(سورہ بیّنۃ)

''ان (اہل کتاب) کوصرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی مخلصانہ بندگی کریں بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں، اور یہی دین ہے بالکل درست''

اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ نماز اور زکوۃ جیسی دو اہم عبادتیں توحید کے لازمی تقاضے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے توحید کے اقرار کے ساتھ ان دو بنیادی تقاضوں کی بجا آوری لازمی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (سورۂ توبہ ـ ۵)

''پس اگر وہ شرک سے توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

اسی سورہ میں آگے چل کر معمولی لفظی فرق کے ساتھ فرمایا گیا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (سورہ توبہ ـ ۱۱)

''پس اگر وہ (شرک سے) توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں، اور ہم آیات کی تفصیل کیے دے رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔''

قرآن مجید میں ایسے بیاسی مقامات ہیں جن میں نماز اور زکوۃ کا حکم ایک ساتھ التزاماً بیان ہوا ہے، جس سے دین کے اندر نماز کے ساتھ زکوۃ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ نبی ﷺ کے عمل سے بھی اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ جب کسی سے بیعت لیتے تو منجملہ دوسری باتوں کے زکوۃ کی ادائیگی کا بھی اقرار کراتے تھے۔ حضرت جریر بن عبد

Marfat.com

اللہ کہتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ سے تین امور پر بیعت کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔''(۱)

عہد رسالت میں صحابہ اس شخص کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تھا، اور ایسے شخص کی نماز بھی ادا نہیں ہوتی۔(۲) لیکن موجودہ دور کے مسلمانوں کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دین میں زکوٰۃ کو وہ حیثیت نہیں دیتے جو نماز کے بعد اس کو حاصل ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کو نماز کی طرح عبادت خیال نہیں کرتے بلکہ محض ایک مالی معاملہ سمجھتے ہیں اور اس کو مالداروں کے ساتھ مخصوص خیال کرتے ہیں۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے اور اس کی اصلاح ضروری ہے۔

دین کے اندر زکوٰۃ کی جو اہمیت اور اس کا درجہ ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے جو خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں پیش آیا۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد بعض قبائلِ عرب نے حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو خلیفہ نے اس انکار کو دین اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت قرار دیا اور ان کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ لیکن بعض صحابہ کو جن میں حضرت عمر فاروقؓ بھی شامل تھے، اس معاملے میں تردد تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قبائل (مانعینِ زکوٰۃ) توحید کا اقرار کرتے اور نماز پڑھتے ہیں اس لیے محض زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے ان کے خلاف جہاد صحیح نہ ہوگا۔

لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس استدلال کو تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی دین کا ایک بنیادی رکن ہے اور بطور ثبوت انھوں نے سورہ توبہ کی ان آیات کو پیش کیا جن کا ابھی اوپر ذکر ہوا۔ صحابہ نے اس دلیل کو تسلیم کر لیا اور پھر مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا گیا۔

تنہا اس ایک واقعہ سے دین میں زکوٰۃ کی حیثیت اور اس کی اہمیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ

(۲) دیکھیں، کتاب الخراج، لابی یوسف، ص ۴۵

Marfat.com

زکوٰۃ کے مصالح

مصالحِ زکوٰۃ کے تعین میں علماء وفقہاء نے افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ کسی نے اس کو محض ایک عبادت قرار دیا اور اس کے دینوی مصالح کو بالکل نظرانداز کردیا اور کسی نے اس کے برخلاف کیا، یعنی اس کے عبادتی پہلو سے کہیں زیادہ اس کے اقتصادی پہلو کو نمایاں کیا۔

اوّل الذکر گروہ کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''بہت سے معاصر اہل قلم اور اہل فکر جو جدید معاشی فلسفوں اور علم الاقتصاد کی غیر معمولی اہمیت اور ہمہ گیری سے کم وبیش متاثر اور ذہنی طور پر مرعوب ہیں، سارا زور زکوٰۃ کے اقتصادی اور اجتماعی مصالح ومنافع پر دیتے ہیں اور اس کو صرف ایک عادلانہ ٹیکس قرار دیتے ہیں یا زیادہ محتاط الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تحریروں کو پڑھنے والا کم ازکم یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کی رائے زکوٰۃ کے بارے میں یہ ہے کہ دنیا کے معاشی نظاموں نے اب تک جتنے ٹیکس سوسائٹی پر عائد کیے ہیں یہ اسلامی ٹیکس ان سب سے زیادہ حکیمانہ، منصفانہ اور متوازن ہے۔ اس لحاظ سے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ زکوٰۃ اشتراکیت کی نہایت مستحکم بنیاد بن سکتی ہے جسے اسلام نے اپنی ترقی وعروج کے بہترین زمانہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہ (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) زکوٰۃ کی اس حقیقی روح کو فراموش کرجاتے ہیں جو اس کے پورے نظام میں جاری وساری ہے۔ یہ روح ہے عبادت اور تقرب الی اللہ کی۔ اسی طرح وہ اس کے بنیادی مقصد اور اصل حکمت ومصلحت کو نظرانداز کردیتے ہیں یعنی نفس کو بخل، خودغرضی، انانیت، فقراء کی حق تلفی اور قلب کو قساوت سے پاک وصاف کرنا، اللہ تعالیٰ کی قبولیت ورضا حاصل کرنا اور فقراء وضعفاء کی دلداری اور ہمدردی کے نتیجے میں مال میں پاکی اور نورانیت اور خیر وبرکت کا ظہور۔''(۱)

مؤخر الذکر گروہ کے خیالات کی وکالت کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ یہ ان کا انشورنس کمپنی ہے۔ یہ ان کا

---

(۱) ارکان اربعہ، ص ۱۴۱

Marfat.com

پروڈنٹ فنڈ ہے۔ یہ ان کے لیے بے کاروں کا سرمایۂ اعانت ہے۔ یہ ان کے لیے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعۂ معاش ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکر فردا سے بالکل بے نیاز کردیتی ہے۔اس کا سیدھا سادا اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی مدد کرو، کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا بنے گا، مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا، کوئی آفتِ ناگہانی آپڑی، بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آ گیا، دیوالیہ نکل گیا تو ان مصیبتوں سے مخلصی کی کیا سبیل ہوگی۔ سفر میں پیسہ پاس نہ ہو تو کیونکر گذر بسر ہوگی؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لیے بے نیاز کردیتی ہے۔ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے ڈھائی فیصد دے کر اللہ انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرالو۔ اس وقت تم کو اس دولت کی ضرورت نہیں ہے یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں۔ کل جب تم ضرورت مند ہو گے یا تمہاری اولاد ضرورت مند ہوگی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے زیادہ تم کو واپس مل جائے گا۔''(۲)

زکوٰۃ کے مصالح متعین کرنے میں اوپر جس افراط وتفریط کی روش کا اظہار ہوا اس سے احتراز کرتے ہوئے جن علماء نے صحیح موقف اختیار کیا ہے ان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ قابل ذکر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''واضح ہو کہ زکوٰۃ میں سب سے زیادہ اہم دو مصالح ہیں۔ پہلی مصلحت تہذ۔ ب نفس ہے اس لیے کہ حرص وبخل کا نفس سے گہرا تعلق ہے اور یہ دونوں چیزیں بدترین اخلاق میں سے ہیں اور اُخروی اعتبار سے سخت ضرر رساں ہیں۔ جو شخص بخیل ہوتا ہے اس کا دل مرتے وقت بھی مال کی محبت سے آزاد نہیں ہو پاتا اور اس طرح وہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ جو شخص زکوٰۃ کی ادائیگی کا عادی بن جاتا ہے اور خود کو حرص وبخل سے دور کرلیتا ہے تو وہ بالآخر اس کے حق میں نافع ثابت ہوتی ہے۔

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی نظریات، ص ۱۰۶، ۱۰۷

Marfat.com

......دوسری مصلحت کا تعلق شہر سے ہے۔ ہر شہر میں ناتواں اور حاجت مند ضرور ہوتے ہیں اور اس طرح کے حوادث کا شکار ہر شخص ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر فقراء اور حاجت مندوں کے ساتھ ہمدردی اور اعانت کے جذبہ سے لوگ خالی ہو جائیں تو وہ فقر و فاقہ سے ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ شہروں کا نظم و انتظام تمام تر مال پر موقوف ہے اور ان شہروں کی حفاظت کے ذمہ دار اور وہاں کے ارباب سیاست اور مدبرین اپنی مصروفیات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کسب معاش سے عاجز رہتے ہیں۔ ان کی گذر بسر کا انحصار بھی اسی مال پر ہے۔ اس لیے رعیت کے مال میں سے مقررہ رقم وصول کرنا مناسب طریقہ ہے۔"(۱)

زکوٰۃ کے حقیقی مصالح کے تعین میں علماء کے درمیان اختلاف محض اس وجہ سے ہوا کہ کسی نے محض اس کے ظاہر کو دیکھا اور فوراً فیصلہ کر دیا کہ وہ اسلام کی انشورنس کمپنی ہے اور کسی نے محض اس کے باطن کو دیکھا اور بے اختیار ہو کر فرما دیا کہ وہ تو محض ایک عبادت ہے، مسلمانوں کے معاشی مصالح سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام نے جتنی عبادات فرض کی ہیں ان کا اصلی مقصد تو تقویٰ پیدا کرنا ہے یعنی نفس کی مخالفت اور خدا کی برضا و رغبت فرماں برداری۔ لیکن حکیم مطلق نے اپنے بندوں کی فلاح کے خیال سے ان عبادات کے لیے جو ضابطۂ عمل مقرر کیا اس میں روحانی منافع کے ساتھ ساتھ دنیوی مصالح و منافع کی بڑی حکیمانہ رعایت رکھی ہے۔ مثلاً نماز کو لیں۔ اس کا مقصد خدا کا ذکر ہے، اور اس ذکر کے ذریعہ اس سے حسی اور جذباتی طور پر جڑنا۔ اس ذکر کا روحانی فائدہ یہ ہے کہ نمازی اس کے ذریعہ فواحش و منکرات سے محفوظ رہتا ہے۔ (سورہ عنکبوت۔ ۴۵) لیکن ذکر خدا کے لیے جو ضابطۂ عمل بنایا گیا، یعنی نماز با جماعت کا نظام، اس میں روحانی فوائد کے پہلو بہ پہلو مادی مصالح بھی ہیں، یعنی ایک امام کی اطاعت، نظم وضبط اور مساوات وغیرہ۔

ٹھیک یہی معاملہ زکوٰۃ کا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد نفس کا تزکیہ ہے، یعنی حرص و بخل کی آلائشوں سے نفس کو پاک کرنا تا کہ بندہ حبِ مال کی بندش سے آزاد ہو جائے کہ یہ چیز

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۲۹، ۳۰

Marfat.com

خدا کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن اس غرض کے حصول کے لیے جو طریقہ بنایا گیا اور اس کے لیے جو قوانین وضع کیے گیے ان میں بندوں کے معاشی مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مصارف زکوٰۃ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے۔

مصالحِ زکوٰۃ کے حصول میں انسانی فطرت کی رعایت

ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرہ معاشی اعتبار سے تقریباً ہر دور میں ناہموار اور غیر متوازن رہا ہے، اور جس کے نتیجے میں اس کے مختلف طبقات کے درمیان برابر جدل ونزاع رہی ہے۔ اس طبقاتی نزاع کو ختم کرنے اور معاشی اعتبار سے ایک متوازن سماج قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کل دولت اس کے کسی ایک طبقہ کے پاس جمع نہ ہو بلکہ وہ برابر گردش میں ہو اور سماج کا ہر چھوٹا بڑا طبقہ بقدر حاجت اس میں حصہ دار ہو۔ اس کا ایک راستہ تو وہ ہے جو اشتراکیت نے اختیار کیا، یعنی زور زبردستی سے معاشی انصاف قائم کرنا، اور یہ طرز عمل ناکام ہو چکا ہے کیونکہ وہ انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ اس کا دوسرا راستہ وہ ہے جو اسلام نے اختیار کیا، یعنی اہل ثروت اپنی خوشی سے غربا و مساکین کا حق ادا کریں۔ اس مقصد کے لیے اسلام نے جو طریقے اختیار کیے وہ انسانی فطرت کی رعایت پر مبنی ہیں۔

انسان اپنی ذاتی حاجات کے علاوہ مال صرف دو صورتوں میں خرچ کرتا ہے، ایک نفع کی امید میں اور دوسرے خوف کے ازالہ کے لیے۔ اسلام نے حکمِ زکوٰۃ میں انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ انفاق سے متعلق قرآن مجید میں جتنی آیتیں ہیں ان میں کہیں ترغیب ہے اور کہیں تخویف لیکن ترغیب کا پہلو غالب ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

(سورہ بقرہ: ۲۷۴)

Marfat.com

''جو لوگ اپنے مال رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے، اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (سورہ حدید۔۱۸)

''بے شک راہ خدا میں خرچ کرنے والے مرد اور عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کو بہترین قرض دیا وہ ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے عمدہ اجر ہے۔''

احادیث میں بھی راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کی تعریف وتحسین کی گئی ہے اور ان کے مال میں خیر وبرکت کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''جب کوئی شخص اپنے طیّب مال میں سے صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اگر وہ صدقہ کھجور ہے تو اس کے ہاتھ میں بڑھتا رہتا ہے اور اتنا بڑھ جاتا ہے کہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے یا بکری کے بچے کی پرورش کرکے بڑا کرتا ہے۔''(۱)

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''کوئی صبح ایسی نہیں گذرتی کہ دو فرشتے آسمان سے نہ اترتے ہوں جن میں ایک کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما، اور دوسرا کہتا ہے کہ بخیل کا مال ضائع کردے۔''(۲)

تخویف سے متعلق بھی چند آیات ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ٥ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ

---

(۱) صحاح ستہ

(۲) بخاری و مسلم

Marfat.com

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ○

(سورہ توبہ ـ ۳۴،۳۵)

''جولوگ سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اس کو راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی بشارت دیدو، جس دن جہنم میں اس ڈھیر پر آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جسے تم نے اپنے لیے: خیرہ کیا تھا۔ اب اس کا مزہ چکھو جو تم ذخیرہ کرتے رہے ہو۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ج

(سورہ بقرہ ـ ۱۹۵)

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

احادیث میں بھی تخویف کا مضمون بکثرت موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا:

''جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال قیامت کے دن ایک سانپ کی شکل میں لایا جائے گا جس کی دو زبانیں ہوں گی۔ وہ اس کی گردن میں ڈال دیا جائے گا اور وہ اس کو اپنے دونوں جبڑوں میں جکڑے گا اور کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں. پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ولا یحسبن الذین یبخلون الخ۔''(۱)

اسلام نے مصالح زکوۃ کے حصول میں صرف ترغیب وتخویف سے کام نہیں لیا بلکہ اس کے لیے قانون بھی وضع کیا۔ سماج میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ترغیب وتخویف کے باوجود اپنا مال خرچ نہیں کرتے کیونکہ وہ مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہوتے ہیں اور آخرت کے محاسبہ کا یقین ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو قانون مجبور کرتا ہے

---

(۱) مسلم

Marfat.com

کہ وہ اپنے مال میں سے غربا و مساکین کا حق نکالیں۔ لیکن اگر اسلام محض قانون بنا دیتا تو زکوٰۃ کا حال وہی ہوتا جو دوسرے دنیوی ٹیکسوں کا ہے یعنی لوگ اسے جبر اور دباؤ سمجھ کر فرار کی راہیں تلاش کرتے۔ اس لیے اس نے قانون بنانے کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کو عبادت کا درجہ دیا اور اس کا رشتہ آخرت کے نفعِ کثیر سے جوڑا تا کہ انفاق کی طرف رغبت ہو اور غربا و مساکین کے حقوق کی ادائیگی ہر صاحب ایمان کے لیے آسان ہو جائے۔

وجوبِ زکوٰۃ کے شرائط

اسلام میں زکوٰۃ صرف اسی صورت میں واجب ہوتی ہے جب درج ذیل شرائط پائی جائیں:

(۱) وجوبِ زکوٰۃ کی پہلی شرط یہ ہے کہ مال آدمی کے قبضہ میں ہو اور وہ اس پر تصرف کا مکمل اختیار رکھتا ہو۔ فقہاء کی اصطلاح میں اس کو ملکیتِ تامّہ کہا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس مال و جائداد تو ہو لیکن اس پر تصرف اور اس سے تمتع کا اختیار اس کو حاصل نہ ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی خواہ مال حدِ نصاب تک پہنچ چکا ہو۔ اسی اصول کی بنا پر مسجد، دینی مدارس، وقف شدہ جائداد اور دوسرے رفاہی اداروں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ یہ مال کسی شخص کی ملکیت نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے کسی خاص شخص کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ اس سے تمتع میں پوری قوم بحیثیت مجموعی شریک ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف وقف علی الاولاد وغیرہ جائدادوں پر زکوٰۃ واجب ہے اس لیے کہ جن اشخاص پر یہ جائدادیں وقف کی جاتی ہیں وہ ان کے مالک ہوتے ہیں اور ان سے تمتع کا پورا اختیار رکھتے ہیں صرف ان کو فروخت نہیں کر سکتے ہیں۔ وجوبِ زکوٰۃ کی یہ پہلی شرط نصِ قرآن کے مطابق ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (سورہ ذاریات۔ ۱۹)

''اور ان کے مالوں میں سائل اور محتاج کا حق ہے۔''

ان کے مال (اموالھم) کہہ کر در حقیقت مال پر قبضہ و تصرف کی طرف اشارہ کیا گیا

Marfat.com

ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ مال ہمارا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مال پر ہم کو قبضہ و تصرف حاصل ہے۔ اگر مال پر قبضہ و تصرف کا اختیار حاصل نہ ہو تو اس صورت میں مال کی نسبت ہم اپنی طرف نہیں کرتے۔

(۲) وجوبِ زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا بالفعل نامی ہونا ہے۔ یہ ایک فقہی اصطلاح ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس مال پر ہوگا جس سے صاحب مال کو نفع اور فائدہ حاصل ہو۔ دوسرے لفظوں میں آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہو۔ چنانچہ اموالِ غیر نامیہ، مثلاً لباس، رہائش کا مکان اور ذاتی استعمال کی دوسری اشیاء میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ نبی علیہ ﷺ کا ارشاد ہے: لیس علی المسلم فی فرسه ولا عبده صدقة ''مسلمان کے گھوڑے اور اس کے غلام میں صدقہ نہیں ہے۔'' اس لیے کہ یہ چیزیں اس کے لیے راحت کا ذریعہ تو ہیں لیکن ان کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں کرتیں بلکہ آمدنی کا ایک حصہ خود ان کی خبر گیری پر خرچ ہو جاتا ہے۔

(۳) وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط یہ ہے کہ مال بقدرِ نصاب ہو یعنی ضرورت سے زائد ہو۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو حدِ غنا کہا جاتا ہے۔ نبی علیہ ﷺ کا ارشاد ہے: انما الصدقة لمن ظهر غنى (بخاری) ''صدقہ صرف اس پر ہے جو غنی ہو۔'' اگر زکوٰۃ کے لیے غنا کی شرط نہ رکھی جاتی تو یہ غربا پر بھی عائد ہو جاتی جیسا کہ مذہبِ یہود میں ہے۔ لیکن اسلام ایک عادلانہ نظامِ زندگی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سماج کے ان طبقات پر بھی زکوٰۃ واجب کر دیتا جو خود مدد کے محتاج ہوں۔ زکوٰۃ کی یہ شرط نصِ قرآن پر مبنی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ۝ (سورہ بقرہ ۔ ۲۱۹)

''وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کس قدر خرچ کریں، کہہ دو کہ جو زائد ہے (یعنی ضرورت سے بچ رہے)''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ اسی مال پر واجب ہے جو انسان کی حوائجِ اصلیہ (Basic Necessities) سے زیادہ ہو۔ اگر مال ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی نہ ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ گویا فقہاء جس چیز کو حدِ نصاب کہتے ہیں اسی کو قرآن نے

Marfat.com

عفو(۱) سے تعبیر کیا ہے اور اسی کو رسول اللہ ﷺ نے ''غنا'' فرمایا ہے۔ ضرورت سے زائد ہونا غنا کی علامت ہے اور اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں کیا ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے مال کی کس قدر مقدار کافی ہے۔ ان امور کا تعین ہر دور کے حالات و ظروف پر موقوف ہے کیونکہ ہر دور کی ضرورتیں اور اشیائے ضروریہ کی قیمتیں معاشی اور سماجی حالات کے بدلنے کے ساتھ برابر بدلتی رہتی ہیں۔

(۴) وجوبِ زکوٰۃ کی چوتھی شرط حولانِ حول ہے یعنی سال کا گذرنا۔ چنانچہ جس مال پر ایک سال کا وقفہ گذر جائے اور وہ بقدر نصاب ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ حولانِ حول کی شرط صرف اموال تجارت کے لیے ہے کیونکہ اس میں ترقی اور اضافہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن جن اموال کا تعلق تجارت سے نہ ہو اور ان میں ترقی اور افزونی کی صلاحیت بھی نہ ہو ان پر زکوٰۃ اسی وقت واجب ہو گی جب وہ ملکیت بن جائیں اور بقدر نصاب ہوں۔ تنخواہ اور وظائف کا شمار اسی زمرے میں ہو گا۔ لیکن اس قسم کے مال میں سے زکوٰۃ سال میں صرف ایک بار لی جائے گی۔ زرعی پیداوار اور پھلوں میں سال گذرنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس میں ایک بار نمو کے بعد دوبارہ نمو کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے یا کم ہونے لگتی ہے۔ اس لیے ان چیزوں میں زکوٰۃ اسی وقت واجب ہو گی جب وہ حاصل ہو جائیں۔

نصابِ زکوٰۃ

اسلام میں زکوٰۃ یعنی صدقۂ واجبہ صرف اغنیاء اور مالداروں پر واجب ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ یہ بات کہ کون غنی اور مالدار ہے اس کے لیے مال کی ایک خاص مقدار متعین کی گئی ہے۔ جب کسی شخص کا مال اس مقررہ حد تک پہنچ جائے تو وہ غنی یا فقہ کی اصطلاح میں

(۱) اسلام میں جمعِ مال غیر محمود چیز ہے اس لیے وہ اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ضروریات زندگی سے جو کچھ زائد ہو اس کو جمع کر کے رکھنے کے بجائے راہ خدا میں خرچ کیا جائے۔ لیکن یہ بات فراموش نہ ہو کہ یہ انتہائی مطالبہ اسلامی ریاست کے مسلمانوں سے ہے جن کی فلاح و بہبود کی ضامن خود ریاست ہوتی ہے۔ اس لیے غیر اسلامی ریاست کے مسلمانوں پر صرف انفاق واجب ہے بقدر استطاعت، مقدار کی کوئی قید نہیں ہے۔ (مصنف)

Marfat.com

صاحب نصاب ہے۔رسول اللہ ﷺ نے غنا(تونگری) کی جو حد مقرر کی ہے وہ حسب روایت درج ذیل ہے:

''حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ نہیں، پانچ اوقیہ (چاندی) سے کم میں زکوٰۃ نہیں، اور پانچ وسق (۱) (غلہ و پھل) سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔''(۲)

نصابِ زکوٰۃ کی تفصیل درج ذیل ہے:

اجناسِ زکوٰۃ	نصاب	مساوی سکہ/پیمانہ	شرح	موجودہ سکہ/پیمانہ
• چاندی	۵ اوقیہ [۳]	۲۰۰ درہم (ساڑھے باون تولے) [۴]	ڈھائی فیصد	۶۴۲ گرام چاندی
• کھجور، غلہ	۵ وسق	۶۰ صاع	۵، ۱۰، ۲۰ فیصد [۵]	۶۵۳ کلوگرام
• مواشی:				
اونٹ	۵-۲۴	ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری		
	۲۵-۳۵	ایک سالہ اونٹنی (۱ عدد)		
	۳۶-۴۵	دوسالہ اونٹنی (۱ عدد)		

---

(۱) وسق کی جمع اوسق ہے۔ وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی کی تحقیق کے مطابق صاع ۴.۸ رطل گیہوں کے برابر تھا۔

(۲) مؤطا، کتاب الزکوٰۃ، باب: ماتجب فیہ الزکوٰۃ۔ اخرجہ البخاری و مسلم۔ مؤطا ہی میں ابوسعید خدریؓ سے ایک اور روایت ہے: لیس فیما دون خمسة اوسق من التمر صدقة (دیکھیں باب الزکوٰۃ)، مسلم میں ہے ولیس فی حب ولا تمرة صدقة حتّی یبلغ خمسة اوسق۔

(۳) ایک اوقیہ ۴۰ درہم کا، اور ایک درم شرعی ۷۰ جو کے برابر ہوتا ہے

(۴) علماء فرنگی محل کے نزدیک چاندی اور سونے کا نصاب تولے میں بالترتیب ۳۶ تولہ ساڑھے پانچ ماشہ، اور ۵ تولہ ڈھائی ماشہ ہے۔

(۵) جس پیداوار میں محنت اور سرمایہ دونوں لگایا گیا ہو اس میں ۵ فیصدی، جو پیداوار محنت یا سرمایہ سے حاصل ہو اس میں ۱۰ فیصدی، اور جو پیداوار محنت اور سرمایہ کے بغیر محض خدا کے فضل و کرم سے حاصل ہو جائے اس میں ۲۰ فیصد ہے۔

Marfat.com

	۴۶-۶۰	سہ سالہ اونٹنی (۱ عدد)		
	۶۱-۷۵	چار سالہ اونٹنی (")		
	۷۶-۹۰	دو سالہ اونٹنی (۲ عدد)		
	۹۱-۱۲۰	سہ سالہ اونٹنی (")		
	۱۲۰ سے زائد	ہر چالیس پر ایک یک سالہ، اور ہر پچاس پر ایک سہ سالہ اونٹنی		
• گائے بھینس	۳۰	ہر تیس پر ایک عدد یک سالہ، اور ہر چالیس پر ایک عدد دو سالہ بچھڑا		
• بکریاں	۴۰-۱۲۰	ایک بکری		
	۱۲۱-۲۰۰	دو بکریاں		
	۲۰۱-۳۰۰	تین بکریاں		
	۳۳۰ سے زائد	ہر ۱۰۰ پر ایک بکری		

زرعی پیداوار کا نصاب

راویتوں سے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ثابت ہے کہ ۵ وسق سے کم غلہ یا پھل میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ لیکن فقہِ حنفی کے مطابق ہر قسم کی پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہے خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ دلیل بخاری کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے: فیما سبقت السماء العشر ''جو پیداوار بارش کے پانی سے ہو اس میں عشر ہے''۔ اس حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں حنفی فقہاء نے غلطی کی ہے۔ اس حدیث اور "لیس فیما دون خمسة اوسق صدقة" میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

> ''دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ حدیث'' بارش کے پانی کی پیداوار میں عشر ہے'' سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عشر کس قسم کی پیداوار میں واجب ہے

Marfat.com

اور نصف عشر کس قسم کی پیداوار میں۔ رہا نصاب کا مسئلہ تو اس حدیث میں اس سے سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر دوسری حدیث میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ لہٰذا ایک صریح اور محکم حدیث کو چھوڑ کر ایک مجمل اور متشابہ المعنی حدیث پر عمل کرنا کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا ہے۔"(۱)

حقیقت یہ ہے کہ نقل کے ساتھ عقل کا بھی یہ فیصلہ ہے کہ جب ہر چیز کا نصاب مقرر ہے تو زرعی پیداوار کا نصاب مقرر کیوں نہ ہوگا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک آدمی جو دو چار وسق غلہ رکھتا ہو اس پر فقہِ حنفی کے مطابق زکوٰۃ واجب لیکن ساڑھے چار اوقیہ چاندی رکھنے والے پر واجب نہیں ہے۔

اصولی حیثیت سے یہ بات فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے کہ زکوٰۃ مالدار پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس دور میں پانچ وسق غلہ رکھنے والے کو غنی کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ معاشی حالات میں ایسے شخص کو غنی نہیں کہا جائے گا۔ وہ تو حاجت منداور مستحق امداد ہے۔ بعض حنفی فقہاء قرآن کی آیت " واٰتوا حقہ یوم حصادہ (سورہ انعام-۱۴۱) "اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو" سے استدلال کرتے ہیں لیکن یہ استدلال مغالطہ انگیز ہے۔ اس آیت میں ایک عام حکم بیان ہوا ہے کہ پیداوار میں سے خدا کا حق نکالنا صاحب زمین پر واجب ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ کتنی پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس اجمال کی شرح رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: لیس فیما دون خمسة اوسق صدقه "پانچ وسق سے کم پیداوار میں صدقہ نہیں ہے۔" لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ رسول اللہ کے جس قول نے آیت کو، جو اپنے مفہوم میں مطلق تھی، مقید کیا اس کا تعلق عہد نبوی کے معاشی حالات سے تھا۔ اس لیے اس مخصوص معاشی حالت کے بدل جانے کی صورت میں آیت کی تقیدی اور اطلاقی شکل بھی بدل جائے گی۔ رہا مجرد انفاق تو یہ جس طرح کسانوں کے لیے ضروری ہے اسی طرح ہر نوع کا مال رکھنے والوں کے لیے بھی لازمی ہے کیونکہ انفاق، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

---

(۱) اعلام الموقعین، ج ۲، ص ۲۲۹

Marfat.com

شرحِ زکوٰۃ

اسلام نے زمینی پیداوار کی شرح مقرر کرنے میں محنت کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ اس پیداوار میں جو بارش کے پانی سے سیراب ہو دسواں حصہ (عشر) اور غیر بارانی پیداوار میں بیسواں (نصف عشر) رکھا ہے کیونکہ اس کے حصول میں کاشتکار کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور کھیتوں کی سیرابی کے لیے کنوؤں، تالابوں اور نہروں سے پانی لانا پڑتا ہے۔

نقدی میں شرحِ زکوٰۃ اڑھائی فیصد (چالیسواں حصہ) ہے۔ لیکن جو نقد سرمایہ کسی محنت کے بغیر مل جائے اس میں بیسواں حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ جانوروں میں تعداد کی بنیاد پر شرحِ زکوٰۃ کا تعین کیا گیا ہے۔ مثلاً، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا، اگر کسی کے پاس ۵ سے ۲۴ اونٹ ہوں تو اس پر ایک بکری نکالنا واجب ہے۔ جانوروں پر زکوٰۃ اسی صورت میں عائد ہوتی ہے جب وہ اموالِ تجارت بن جائیں۔ اگر وہ ذاتی استعمال کے لیے ہوں تو ان پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔

شرحِ زکوٰۃ میں عدمِ مساوات کی وجہ

اسلام نے مختلف اجناسِ زکوٰۃ کی جو شرحیں مقرر کی ہیں ان میں یکسانیت نہیں ہے۔ مثلاً، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سونا چاندی اور اموالِ تجارت پر شرح زکوٰۃ ڈھائی فیصدی اور زرعی پیداوار میں دس اور پانچ فیصدی ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی و بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت ہے۔ انسان کی اصل ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے۔ زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کو جو دولت حاصل

Marfat.com

ہوتی ہے وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصل ضرورت کے کام میں نہیں آتی بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں۔ وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں، شہر شہر اور ملک ملک پھرا کرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدر جہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے، اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے سونا، چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہات میں رہتے ہیں اور شہروں سے دور ہوتے ہیں نیز وہ عموماً سونا، چاندی اور سکوں سے بھی محروم ہوتے ہیں اس لیے نسبۃً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس ''انفاق'' یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کرتے ہیں۔ اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لیے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔''(۱)

مولانا نے زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ کی شرح زکوٰۃ میں کمی و بیشی کے جو اقتصادی اور غیر اقتصادی اسباب بیان کیے ہیں وہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان کی اس تحریر کو پڑھ کر قاری یہ سمجھنے کے لیے مجبور ہوگا کہ وہ سرمایہ داروں کے حامی اور کسانوں کے مخالف ہیں۔ تجارت ہو یا زراعت دونوں ہی میں سرمایہ لگتا ہے، دونوں ہی میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور کسان و تاجر دونوں ہی اپنی اپنی اشیاء کا مبادلہ کرتے ہیں۔ اگر تاجر کسان سے غلہ خریدتا ہے اور اسے نقد رقم دیتا ہے تو کسان ضروریات زندگی کی بہت سی چیزیں خرید کر یہ نقدی دوبارہ تاجر

---

(۱) سیرت النبی، ج ۵، ص ۲۲۲، ۲۲۳

Marfat.com

کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ رہی خطرات و حوادث کی بات تو وہ دونوں کو یکساں طور پر پیش آسکتے ہیں۔ اگر تجارت میں خسارہ اور چوری کا اندیشہ ہے تو زراعت میں بھی کھیت سے غلہ کی چوری کے علاوہ خراب موسم اور کیڑوں کی وجہ سے فصلوں کی بربادی کا اندیشہ رہتا ہے۔ جہاں تک دینی اور ملی کاموں میں انفاق کی بات ہے تو بیشک آج اہل تجارت اہلِ زمین سے آگے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ایک شہر میں رہتا ہے اور دوسرا دیہات میں، اس کی اصل وجہ موجودہ دور میں صنعت و تجارت کی گرم بازاری ہے۔ کبھی یہی حیثیت زمینداروں اور جاگیرداروں کو حاصل تھی اور وہ دینی اور ملی کاموں میں زیادہ حصہ لیتے تھے کیونکہ اس وقت زمین ہی سب سے بڑا سرمایہ اور تونگری کے حصول کا ایک اہم ذریعہ تھی۔

شرحِ زکوٰۃ میں کمی و بیشی کی اصل وجہ یہ ہے کہ نقد سرمایہ میں زکوٰۃ راس المال اور نفع دونوں کو ملا کر عائد ہوتی ہے، لیکن زراعت میں راس المال (کھیت) کے بجائے صرف نفع یعنی پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ غلہ کا تخمینہ لگایا جاتا ہے اور اس میں کم از کم ایک چوتھائی کی تخفیف کا حکم ہے۔ ان دو وجوہ سے نقد سرمایہ میں شرحِ زکوٰۃ ڈھائی فیصدی اور زرعی پیداوار میں عشر اور نصف عشر ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ

اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے مصارفِ زکوٰۃ خود متعین کر دیے ہیں اور اب یہ ناقابلِ تغیر ہیں۔ اگر ساری دنیا کے مسلمان جمع ہو کر اس میں کوئی تبدیلی لانا چاہیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ امت کے سارے علماء و فقہاء بھی چاہیں کہ اس کے کسی جز میں کوئی تقدیم و تاخیر ہو تو وہ اس کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ ایک دائمی قانون ہے جو ہر طرح کی تاویل و تشریح سے بالاتر ہے اور حالات و ظروف کی تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ مصارفِ زکوٰۃ کا ذکر قرآن مجید کی سورہ توبہ (آیت: ۶۰) میں ان لفظوں میں آیا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ

Marfat.com

وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ○

''صدقات تو درحقیقت فقراء، مساکین، عاملینِ صدقات اور تالیفِ قلوب کے مستحقین کے لیے ہیں۔ نیز اس لیے ہیں کہ گردنوں کے چھڑانے (قید غلامی سے آزاد کرانے) قرض داروں (کے قرض ادا کرنے)، فی سبیل اللہ، اور مسافروں کی امداد میں خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ فریضہ ہے۔ اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔''

مصارفِ زکوٰۃ کے تعین کے بعد'' فریضة من اللّٰه '' کا جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ابدی مصارف ہیں۔ ان میں کسی تبدیلی کا حق کسی مسلمان کو حاصل نہیں ہے خواہ زمانہ اور اس کے حالات کیسے ہی ہوں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ اس لیے کہ یہ تقرر اس علیم وخبیر ہستی کی طرف سے ہے جو ہر زمانے کے حالات اور اس کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اسی لیے'' فریضةٌ مّن اللّٰه '' کے بعد فرمایا: واللّٰهُ علیمٌ حکیم۔ مصارفِ زکوٰۃ کے اس تعین کے بعد اگر کوئی شخص ان میں تبدیلی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اللہ کے علیم وخبیر ہونے کی نفی کرتا ہے۔ حدیث سے بھی اس کے غیر مبدل ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول مجھ کو صدقہ (زکوٰۃ) میں سے کچھ عنایت کیجئے۔ آپ نے فرمایا:

ان اللّٰه لم یرض بحکم نبی و لاغیره فی الصدقات حتی حکم فیها فجزها ثمانیة اجزاء، فان کنت من تلك الاجزاء اعطیتك حقك (۱)

''صدقہ کا معاملہ اللہ نے نہ نبی پر چھوڑا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے فرد پر بلکہ اس کا فیصلہ خود فرما دیا ہے۔ چنانچہ اس کی آٹھ مدات مقرر کیں۔ اگر تم ان میں سے کسی مد میں آتے ہو تو تمہارا حق ضرور دوں گا۔''

سورہ توبہ (آیت: ۶۰) میں زکوٰۃ کے جن مصارف کا ذکر آیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

---

(۱) ابوداؤد

Marfat.com

فقراء ومساکین

یہ زکوٰۃ کا پہلا مصرف ہے۔ مصارف زکوٰۃ میں اس کا تقدم اس امر کی واضح دلیل ہے کہ زکوٰۃ کا اصل مقصد غرباء ومساکین کی امداد واعانت ہے تاکہ سماج کے کمزور طبقات کو بھی زندگی کی آسائشیں حاصل ہوں اوران کو غربت وافلاس کی سختیوں سے نجات ملے۔ لیکن فقراء ومساکین کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے اس کا تعین نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ فقیر اور مسکین سے مراد ایک ہی شخص ہے یا دو طرح کے اشخاص مراد ہیں۔

علماء اور فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ فقہاء نے فقراء اور مساکین کی تعریف بالکل قانونی انداز میں کی ہے۔ چنانچہ احناف کے نزدیک فقیر وہ شخص ہے جو نصابِ زکوٰۃ سے کم کا مالک ہو اگرچہ اس کی ملکیت میں نصاب کے بقدر یا اس سے زائد اشیاء، مثلاً فرنیچر، گھریلو سامان، کپڑے اور کتابیں وغیرہ ہوں جو بنیادی ضرورت کے طور پر اس کے استعمال میں ہوں اور وہ ان سے استفادہ کرنے کا ضرورت مند ہو، اور مسکین وہ ہے جو کسی چیز کا مالک نہ ہو۔

اس کے برخلاف امام مالکؒ، اما شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک فقر و مسکنت نصاب کی عدم ملکیت پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار بقدرِ ضرورت ملکیت نہ ہونے پر ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ اتنا مال ہو اور نہ ہی جائز اور مناسب حال ذریعۂ معاش جس سے اس کے زیر کفالت افراد کے خورد ونوش، لباس اور رہائش وغیرہ کی ضرورتیں کسی اسراف یا بخل میں مبتلا ہوئے بغیر پوری ہوسکیں۔ مثلاً ایک شخص یومیہ دو چار درہم کماتا ہے جب کہ اس کو دس درہم کی ضرورت ہے۔ اور مسکین وہ شخص ہے جو حصولِ مال یا کسبِ معاش کے جائز ذرائع پر جو اس کے زیر کفالت افراد کے لیے کفایت کرے، قادر ہو لیکن اس سے اتنی آمدنی نہ ہو جس سے اس کی ضرورتیں پوری ہوں (۱)

فقہاء کے برخلاف بعض علماء، مثلاً امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ فقیر اس شخص کو کہتے ہیں

---

(۱) نہایت المحتاج، ج۶ ص ۱۵۰۷، بحوالہ فقہ الزکوٰۃ، علامہ یوسف القرضاوی ص ۳۲۹، ۳۳۰

Marfat.com

جس کے پاس مال نہ ہو اور نہ کمانے پر قادر ہو، اور مسکین وہ ہے جو مال تو رکھتا ہو لیکن ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی نہ ہو(۱)

بعض علماء اور فقہاء کی رائے میں فقراء اور مساکین سے قرآن کی مراد دو طرح کے اشخاص اور اصناف نہیں بلکہ ایک ہی شخص اور ایک ہی صنف مراد ہے یعنی غریب اور حاجت مند۔ سماج میں ہمیشہ سے دو ہی طرح کے افراد رہے ہیں، ایک امیر اور آسودہ حال اور دوسرے غریب اور محتاج۔ جس طرح تونگری کے درجات ہیں اور ہر وہ شخص جو اپنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں دوسروں کی اعانت کا محتاج نہ ہو بلکہ اس سے مستغنی ہو وہ دولت مند ہے۔ اسی طرح غربت کے درجات ہیں اور ہر وہ شخص جو اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول میں دوسروں کی مدد و اعانت کا محتاج ہو غریب کہلائے گا خواہ اس کی احتیاج کم ہو یا زیادہ۔ اس تعریف کے مطابق ہر وہ شخص فقیر اور مسکین سمجھا جائے گا جو غریب اور محتاج ہو اور دوسروں کی امداد کے بغیر اس کی ضروریات زندگی کی فراہمی مشکل ہو۔ جملہ اصحاب مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔(۲)

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر فقراء اور مساکین کے الفاظ مترادف المعنی ہیں یعنی ان سے مراد حاجت مند ہیں، خواہ ان کی حاجت مندی کثیر ہو یا قلیل، تو پھر قرآن نے ایک ہی لفظ کیوں نہیں استعمال کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ فقراء اور مساکین سے دو طرح کے اشخاص مراد ہیں اور قرآن نے ان کا الگ الگ ذکر کر کے جہاں ان کی حالتِ احتیاج کی درجہ بندی کی ہے وہاں ان کے طرزِ عمل کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ اگر ایک حاجت مند اپنی محتاجی کا اظہار کرتا ہے اور لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاتا ہے تو قرآن ایسے حاجت مند کو مسکین قرار دیتا ہے۔ مسکنت کے لفظ میں ذلت و پستی کا مفہوم شامل ہے۔ دستِ سوال پھیلانے والا شخص دراصل اپنے نفس کو ذلیل و رسوا کرتا ہے اس لیے اس کو مسکین ہی کہا جائے گا۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا حاجت مند ہے جو دوسروں کے سامنے اپنی محتاجی ظاہر نہیں کرتا اور اس تعفف و خودداری کی وجہ سے فقر و فاقہ کی اذیتیں برداشت کرتا ہے۔ ایسا حاجت مند ہی

(۱) المرشد الامین (خلاصہ احیاء العلوم)، ص ۷۱

(۲) فتح القدیر، محمد بن علی بن شوکانی، ص ۳۷۲

Marfat.com

دراصل فقیر ہے۔ ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور حسن بصریؒ نے فقیر اور مسکین کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، اور ابن جریرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔(۱) قرآن میں فرمایا گیا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط (سورہ بقرہ : ۲۷۳)

''یہ ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں گھر کر رہ گئے ہیں، زمین میں (کسب معاش کے لیے) دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ناواقف حال ان کی خودداری کی وجہ سے ان کو غنی خیال کرتا ہے (حالانکہ وہ حاجت مند ہوتے ہیں) تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔''

اس آیت نے بالکل واضح کر دیا کہ فقراء وہ لوگ ہیں جو حاجت مند ہونے کے باوجود کسی سے سوال نہیں کرتے جب کہ مساکین صرف سوال ہی نہیں کرتے بلکہ اس میں حد درجہ طلب و الحاح ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے اس طرح لپٹ کر مانگتے ہیں کہ جب تک مل نہ جائے اپنی جگہ سے ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ قرآن کی دیگر آیات سے بھی جن میں فقراء اور مساکین کا تذکرہ ہے، اس طرز عمل کا فرق صاف محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں جن میں مساکین کا ذکر ہے:

۱ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط (سورہ بقرہ: ۱۸۴)

''اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔''

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۔(سورہ حاقہ: ۳۴)

''اور وہ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔''

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۔

(سورہ دہر: ۸)

---

(۱) دیکھیں، تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۶۴

Marfat.com

''اور وہ خود کھانے کے حاجت مند ہوتے ہوئے بھی مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

ایک شخص کو کھانا اسی وقت کھلایا جاسکتا ہے جب اس کے افلاس و ناداری کا حال معلوم ہو۔ پھر کسی کے یہاں کھانے کے لیے وہی شخص جائے گا یا کھانا قبول کرے گا جو فقر و فاقہ کا شکار ہونے کی وجہ سے عزتِ نفس کھو چکا ہوگا۔ آخری آیت میں مسکین کے ساتھ یتیم اور قیدی کا ذکر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسکین وہ شخص ہے جو یتیم اور قیدی کی طرح دوسروں کی خبر گیری اور اعانت کا محتاج ہو اور اس حد تک محتاج ہو کہ عدمِ اعانت کی صورت میں اس کے ہلاک ہو جانے کا قوی اندیشہ ہو۔ مسکین کی اس حالت کا اندازہ آیتِ ذیل سے بھی ہو سکتا ہے:

أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ (سورہ بلد: ۱٦)

''یا فاقہ کے دن کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک نشین کو کھانا کھلانا۔''

اس آیت میں ایک مسکین کی ابتر حالت کا نقشہ ''ذا متربۃ'' کے الفاظ سے کھینچا گیا ہے یعنی وہ ایسا شخص ہے جو فقر و فاقہ کی شدت کی وجہ سے نیم جاں ہو اور کہیں خاک پر پڑا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسکین دراصل گداگر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ أَنْ لَا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِسْكِينٌ (سورہ قلم: ۲٤)

''اور وہ (باغ کی طرف) چلے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے جاتے تھے کہ آج تمہاری مرضی کے خلاف کوئی مسکین باغ میں داخل نہ ہو۔''

دوسری جگہ ہے:

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا (سورہ نساء: ۸)

''اور اگر (ترکہ کی) تقسیم کے وقت رشتہ دار، یتیم اور غریب لوگ آموجود ہوں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دو اور ان سے بھلے ڈھنگ سے بات کرو۔''

Marfat.com

ان دونوں آیتوں کے مضامین پر غور کریں۔ کسی کے باغ میں، جب کہ اس کے پھل توڑے جا رہے ہوں، اور کسی کے دروازے پر جب کہ ترکہ تقسیم ہو رہا ہو، کون آدمی جائے گا؟ یقیناً وہی آدمی ان جگہوں پر جا سکتا ہے جو فقر و فاقہ کا شکار ہوگا، جس کے پاس گزر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ ہوگا۔ اعزہ و اقارب بھی نہ رکھتا ہوگا جو مصیبت کی گھڑی میں اس کی مدد کریں غرضیکہ محتاجی و لاچاری کی شدت کی وجہ سے گدائی کا کشکول اٹھانے کے لیے مجبور ہو گیا ہوگا۔

لیکن فقیر کا افلاس اس درجہ کا نہیں ہوتا، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔ قرآن مجید میں بعض مقامات پر فقراء کے بالمقابل اغنیاء کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں سورہ نساء آیت ۱۳۵(۱) اور سورہ آل عمران آیت ۱۸۱(۲)۔ ان آیات سے بالکل واضح ہے کہ فقر کی حد وہاں ختم ہوتی ہے جہاں سے غنا اور امارت کی حد شروع ہوتی ہے۔ اس لیے فقیر وہ حاجت مند ہے جو بقدر حاجت ضروریاتِ زندگی کی فراہمی سے قاصر ہو۔ وہ مسکین کی طرح اس درجہ مفلس و قلاش نہیں ہوتا کہ اگر سوال نہ کرے تو ہلاک ہو جائے۔ اس کے علاوہ فقیر احتیاج کے باوجود کسی دوسرے پر اپنی حاجت ظاہر نہیں کرتا۔ اس کی خودداری سوال سے مانع ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں مسکین کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے:

لیس المسکین هذا الطواف الذی یطوف علی الناس فترده القمة والقمتان والتمرة والتمرتان ۔ قالوا فما المسکین یا رسول اللّٰه ، قال : الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن به یتصدق علیه ولا یسئل الناس شیئا۔(۳)

"(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:) مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے پاس چکر لگایا کرتے ہیں اور ایک یا دو لقمہ یا ایک دو کھجوریں پا کر لوٹ جاتے ہیں۔ صحابہؓ نے پوچھا پھر مسکین کون ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ ہی پہچانا جاتا ہے (کہ وہ حاجت مند ہے)

(۱) وان یکن غنیا او فقیرا فا اللّٰه اولی بهما
(۲) لقد سمع اللّٰه قول الذین قالو ان اللّٰه فقیر ونحن اغنیاء
(۳) بخاری و مسلم

Marfat.com

کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ ہی وہ لوگوں سے کوئی چیز مانگتا ہے۔“

اس حدیث سے بعض علماء کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسکین وہ ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا اور فقیر وہ ہے جو لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ فرماتے ہیں: ”فقیر اسے کہیں گے جس کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کچھ نہیں لیکن مسکین وہ ہے جس کی احتیاج ابھی اس آخر درجہ تک نہیں پہنچی مگر پہنچ جائے گی اگر خبر گیری نہ کی جائے ...... فقیر اور مسکین میں اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فقیر کو سوال کرنے میں عار نہیں ہوتا لیکن مسکین کو اس کی خودداری اور عزتِ نفس طلب والحاح کی اجازت نہیں دیتی۔“(۱)

لیکن قرآن نے اس کے بالکل برخلاف بات کہی ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ فی الواقع حدیث اور قرآن کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ حدیث کا مضمون واضح طور پر بتاتا ہے کہ سوال نہ کرنے والے مسکین سے آنحضور ﷺ کی مراد فقراء ہیں چنانچہ مسکین کی تعریف فرمانے کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفّف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافا○

اس لیے ماننا ہوگا کہ مسکین سے آپ ﷺ کی مراد وہ حاجت مند ہیں جو لوگوں سے سوال نہیں کرتے اور قرآن میں ان ہی کو فقراء کہا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:

لیس المسکین الذی تردہ التمرۃ والتمرتان...... ولکن المسکین الذی یتعفف

”مسکین وہ نہیں جس کو ایک دو کھجور دے کر لوٹا دیا جائے بلکہ مسکین وہ ہے جو خوددار ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ مسکین دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک سوال کرتا پھرتا ہے اور دوسرا سوال نہیں کرتا۔ مسکین کی اس دوسری قسم کو قرآن نے فقیر کہا ہے۔ فقراء کو مساکین پر جس وجہ سے تقدم حاصل ہے اس کی وجہ بھی قرآن نے بتادی ہے یعنی خودداری اور عدم سوال

(۱) ترجمان القرآن، ج ۳، ص ۴۱۴

Marfat.com

جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ چونکہ مساکین سوال کے خوگر ہوتے ہیں اس لیے ان کی حاجتیں بالعموم پوری ہو جاتی ہیں لیکن فقراء سوال نہ کرنے کی وجہ سے تکالیف اٹھاتے ہیں۔ اسلام کی نظر میں سوال کرنا کوئی محمود فعل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ماننے والوں کو خودداری اور عزتِ نفس کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث دونوں میں وہ محتاج اور نادار لوگ جو سوال کی ذلت نہیں اٹھاتے ان محتاجوں کے مقابلے میں جو سوال میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، امداد و اعانت کے زیادہ مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ لیکن مسکینوں کی دست گیری بھی ضروری ہے۔

فقراء و مساکین کو کتنی زکوٰۃ دی جائے؟

اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ان کو اتنا دیا جائے کہ بے نیاز کر دیا جائے یعنی انہیں دوبارہ سوال کی حاجت پیش نہ آئے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ان کو سال بھر کی ضرورت کے بقدر دیا جائے۔ صورتیں دونوں ہی مناسب اور جائز ہیں۔ جو فقراء اور مساکین کسی بیماری یا ضعفِ پیری کی وجہ سے کسبِ معاش پر قادر نہ ہوں ان کو ہر سال اتنا دیا جائے جو ان کی سال بھر کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔ مطلقہ عورتوں، یتیموں اور بیواؤں کو بھی اسی زمرہ میں شامل سمجھنا چاہیے، بشرطیکہ وہ مال و جائداد نہ رکھتے ہوں اور کوئی دوسرا شخص ان کی خبر گیری کے لیے تیار نہ ہو البتہ جو فقراء اور مساکین کسب معاش پر قادر ہوں ان کو اتنا دیا جائے جو انھیں احتیاج کی حالت سے نکال دے۔ اس کی مناسب شکل یہ ہے کہ ان کو اتنی رقم دی جائے جس سے وہ کوئی کاروبار شروع کر سکیں، اور اگر پہلے سے کوئی کاروبار کر رہے ہوں لیکن اسباب یا آلات کی کمی کی وجہ سے کاروبار ٹھیک طور پر نہ چل رہا ہو تو ان کو اتنی مدد دی جائے جس سے اسباب و آلات کی کمی دور ہو جائے۔ اگر کوئی مسکین وفقیر تندرست و توانا ہونے کے باوجود کام نہیں کرنا چاہتا ہے تو اس کی مدد صدقہ سے ہرگز نہ کی جائے۔ رسول اللہ نے صاف لفظوں میں فرمایا ہے:

Marfat.com

لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی(۱)

''صدقہ نہ کسی غنی کے لیے جائز ہے اور نہ ہی تندرست اور توانا کے لیے''

عبداللہ بن عدیؓ سے روایت ہے کہ دو تندرست اور توانا آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صدقہ طلب کیا۔آپ نے فرمایا:

انی شئتما اعطیتکما ولا حظ فیھا لغنی ولا لقوی مکتسب (۲)

''اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دوں لیکن اس مال میں کسی غنی کا کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ کسی ایسے شخص کا جو قوی ہو اور کمانے پر قادر ہو۔''

سوال کی حد؟

ہر فقیر اور مسکین سے عزیمت اور بلندیٔ نفس کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔فقر و احتیاج کی شدت اسے سوال پر مجبور کر دیتی ہے۔انسان کی اس طبعی کمزوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے حاجت مندوں کو سوال کی اجازت دی ہے لیکن اس کی حد بھی مقرر کر دی ہے۔چنانچہ اگر کسی شخص کے پاس بقدر کفایت مال موجود ہے تو اس کے لیے سوال جائز نہیں اور اگر کفایت سے کم ہو تو جائز ہے۔جو لوگ بقدر کفایت مال رکھنے کے باوجود سوال کرتے ہیں ان کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے اس حال میں سوال کیا کہ اس کے پاس بقدر کفایت (غنا) مال موجود تھا وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر نوچنے کے آثار ہوں گے۔صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول غنا کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پچاس درہم یا اس کی قیمت کے بقدر سونا۔'' (۳)

اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام نے ایک طرف غربا و مساکین کے حقوق کا تحفظ کیا ہے اور اصحاب خیر کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کے فقر و احتیاج کو

---

(۱) ترمذی،احمد،ابوداؤد

(۲) احمد،ابوداؤد،نسائی

(۳) ترمذی،ابوداؤد،نسائی،ابن ماجہ عن عبداللہ ابن مسعودؓ

Marfat.com

دور کرنے میں ان کی مالی مدد کریں، اور دوسری طرف غربا اور سوالیوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ وہ حتی الوسع سوال سے گریز کریں اور شدید احتیاج ہی میں طالب مدد ہوں تاکہ اللہ نے ان کو انسان ہونے کے تعلق سے جس شرف وفضیلت سے نوازا ہے وہ غیر ضروری سوال سے مجروح نہ ہو اور وہ آپ اپنی نگاہ میں ذلیل ورسوا نہ ہوجائیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

''کوئی شخص اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا نہیں کھاتا۔'' (بخاری)

زکوٰۃ کے اس پہلے مصرف کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فقراء اور مساکین کو زکوٰۃ اس طرح دی جائے کہ وہ اس کے مالک ہوجائیں اور اپنی جائز ضرورتوں کو جس طرح چاہیں پوری کریں۔ ''انما الصدقات للفقراء والمساکین'' میں اکثر علماءؒ وفقہاء کے نزدیک لام تملیک کا ہے یعنی مالک بنانا۔ تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر تملیک کی شرط پوری نہ ہو تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اس بنا پر فقہ حنفی کی روؔ سے ایسے کاموں میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا جائز نہیں ہے جن میں تملیک نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ احناف کے نزدیک زکوٰۃ کی رقم سے مسجدوں اور پلوں کی تعمیر، راستوں کی مرمت، حج کی ادائیگی اور میت کی تکفین جائز نہیں ہے۔(۱)

اس سلسلے میں فقہاء کا یہ بھی خیال ہے کہ جو فقراء اور مساکین تارکِ نماز ہوں ان کو پہلے نماز کا حکم دیا جائے، اگر وہ بات مان لیں تو ان کو زکوٰۃ دی جائے ورنہ نہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کا بھی یہی خیال ہے۔ راقم کے خیال میں ایسے لوگوں کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے لیکن ان فقراء و مساکین کو ترجیح دی جائے جو پابندِ نماز ہوں۔ تارکینِ نماز کی اعانت کی دلیل ایک روایت ہے جو ابن ابی شیبہؒ سے مروی ہے، جس میں وہ جابر بن یزیدؒ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ذمیوں میں صدقہ (زکوٰۃ) اور خمس تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں ایک بوڑھے یہودی کا وظیفہ مسلمانوں کے بیت المال سے

---

(۱) ملاحظہ ہو ردالمختار، ج ۲ ص ۸۵۔ راقم کے نزدیک ''انما الصدقات'' میں لام تملیک کے بجائے استحقاق کے معنی میں ہے لیکن اس سے آیت کے معنی و مدلول پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو مال فقراء و مساکین کو دیا جاتا ہے وہ ان کا حق ہے اور اس حق کی ادائیگی کی صحیح صورت یہ ہے کہ مال حقدار کے حوالہ کیا جائے۔

Marfat.com

مقرر کر دیا تھا اور ''انما الصدقات الخ'' سے استدلال فرمایا کہ: ھذا من مساکین اھل الکتاب ''یہ اہل کتاب کے مساکین میں سے ہے''(۱)

جب ایک یہودی حاجت مند کو بیت المال سے مدد دی جاسکتی ہے تو پھر ایک مسلمان کو، جو غفلت کی وجہ سے تارک نماز ہے، زکوٰۃ کیوں نہیں دی جاسکتی ہے۔ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ناداروں کی مدد ہو۔ اس راہ میں کسی دوسری چیز کو حائل نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہزاروں کیا کروڑوں کفار و فجار تک کو روزی دیتا ہے تو پھر بندوں کا طرز عمل اس سے مختلف کیوں ہو۔ حکمتِ تبلیغ کا بھی تقاضا ہے کہ تارکِ نماز غربا کی مدد کے ساتھ انھیں اقامتِ صلوٰۃ کی تاکید کی جائے۔ اگر ایک شخص بھوکا ہے تو کیا آپ اس لیے اس کو کھانا نہیں کھلائیں گے کہ وہ تارکِ صلوٰۃ ہے؟ پہلے اس کی بھوک مٹائیں پھر اس کو نماز کا حکم دیں۔ یہی قرینِ انصاف ہے اور دین اسلام کی روح کے مطابق بھی۔

عاملین

یہ زکوٰۃ کا تیسرا مصرف ہے۔ عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسے تمام لوگ زکوٰۃ کے فنڈ سے تنخواہ پائیں گے خواہ وہ غنی ہوں۔ لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس شعبہ میں وہ لوگ لیے جائیں جو انتظامی صلاحیت رکھتے ہوں اور نادار بھی ہوں۔ زکوٰۃ کا یہ تیسرا مصرف اس وقت معطل ہے اس لیے کہ اس کا اجتماعی نظام باقی نہیں رہا۔ یہ مصرف خود بتاتا ہے کہ زکوٰۃ کا معاملہ انفرادی کے بجائے اجتماعی ہے لیکن افسوس کہ مسلمان اس سے غافل ہیں۔

فقراء اور مساکین کے فوراً بعد اس تیسرے مصرف کا ذکر بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ زکوٰۃ کا اصلی مقصد فقراء اور مساکین کی اعانت ہے اس لیے اس کا بڑا حصہ ان ہی دو مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیے۔ اس میں عاملین کا حصہ بھی شامل ہے کیونکہ عاملین کے ذریعے ان کی امداد کا نظام چلتا ہے۔

---

(۱) کتاب الخراج لابی یوسفؒ، ص ۱۲۶

Marfat.com

مؤلفۃ القلوب

یہ زکوٰۃ کا چوتھا مصرف ہے۔ مؤلفۃ القلوب سے کون لوگ مراد ہیں اس میں ہمارے علماء وفقہاء کا اختلاف ہے۔ عام طور سے اس سے تین طرح کے لوگ مراد لیے جاتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کی تالیفِ قلب یعنی مالی اعانت سے اس بات کی توقع ہو کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے۔ دوسرے وہ لوگ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوں۔ ان کی تالیفِ قلب اس غرض سے کی جاتی ہے کہ وہ دین پر ثابت قدم رہیں۔ تیسرے وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم ہوں۔ ان کی تالیفِ قلب سے مقصود یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ترک کر کے ان کے حامی بن جائیں۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اوّل الذکر دو اقسام کے لوگ ہی مؤلفۃ القلوب کے زمرے میں داخل ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ کی رائے میں اس مد کے مستحق وہ لوگ ہیں جو اسلام میں نئے نئے داخل ہوں۔ ایسے لوگوں کو مدد دینے کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص نیا نیا اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے پرانے مذہب کو چھوڑتا ہے بلکہ والدین کے ساتھ موروثی مال و جائداد کی قربانی بھی دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے اکثر معاش وغیرہ کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں لہٰذا ایسا شخص جس نے اسلام کے لیے اپنی دنیا کو قربان کیا یقیناً حوصلہ افزائی اور مدد کا مستحق ہے۔(۱)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم سے مؤلفۃ القلوب کی جن دو اقسام کی مدد کی جاسکتی ہے ان کا اطلاق امیر و غریب دونوں پر ہوگا یا صرف غربا پر۔ ہمارے علماء کے نزدیک ان میں دونوں طرح کے لوگ داخل ہیں۔ امام زہریؒ سے مولفۃ القلوب کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس سے مراد اسلام قبول کرنے والے لوگ ہیں خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی۔ پوچھا گیا کہ اگر وہ غنی ہوں؟ فرمایا، اگر وہ غنی ہوں تب بھی مالی اعانت کے مستحق ہیں۔(۲)

راقم کا خیال اس سے مختلف ہے۔ اصولی حیثیت سے یہ بات طے شدہ ہے کہ زکوٰۃ

---

(۱) علامہ یوسف القرضاوی، فقہ الزکوٰۃ، ص ۳۵۴

(۲) تفسیر طبری، ج ۱۴، ص ۳۱۴

Marfat.com

غربا و مساکین کا حق ہے (حق للسائل والمحروم: سورہ الذاریات: ۱۹) حدیث ہے کہ: امرت ان اخذ الصدقة من اغنيائكم وارد على فقرائكم (۱) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مالداروں سے زکوٰۃ لوں اور تمہارے غربا کو لوٹا دوں۔" غنی کی تالیف قلب کرنے کے معنی تو یہ ہیں کہ اغنیاء سے لے کر پھر اغنیاء کی طرف لوٹا دیا جائے۔ مصارفِ زکوٰۃ پر غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر مصرف کی علت احتیاج ہے۔ کسی شخص کو زکوٰۃ سے مدد کا استحقاق صرف اس صورت میں حاصل ہے جب وہ حالتِ احتیاج میں ہو۔ اگر وہ محتاج و حاجت مند نہیں ہے تو مصارفِ زکوٰۃ سے خارج ہے۔

ایک بات اور غور طلب ہے۔ "والمولفة قلوبهم" میں "ھم" کی ضمیر مجرور کا مرجع کون لوگ ہیں؟ اس کا مرجع فقراء و مساکین کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ مؤلّفۃ القلوب سے وہ فقراء و مساکین مراد ہیں جو دائرہ اسلام سے باہر ہیں۔ زکوٰۃ کے مال سے ان کی مدد اس غرض سے کی جائے کہ ایک طرف ان کی احتیاج دور ہو اور دوسری طرف اس حسن سلوک کی وجہ سے ان کے قلوب اسلام کی طرف مائل ہوں۔ ہندوستان میں اس کے بہترین مستحق دلت اور دوسرے پس ماندہ طبقات کے لوگ ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو کہاں توفیق کہ ان کی طرف توجہ کریں۔

اکثر علماء و فقہاء وفاتِ رسول کے بعد اس مد کو منسوخ سمجھتے ہیں۔ احناف کا یہی مسلک ہے۔ (۲) بعض علماء اس کی عدمِ تنسیخ کے بھی قائل ہیں (۳) قول حق یہ ہے کہ یہ مد منسوخ نہیں اور قیامت تک منسوخ نہیں ہوگی۔ "فريضة من الله" کہہ کر اللہ نے بتایا ہے کہ زکوٰۃ کے یہ مصارف دائمی ہیں۔

فی الرقاب (گردنیں چھڑانے میں)

یہ زکوٰۃ کا پانچواں مصرف ہے۔ زکوٰۃ کی ابتدائی چار مدوں کے لیے، جن کا اوپر

---

(۱) نبی اکرم ﷺ اپنے عہد میں غیر مسلم اغنیاء کی تالیف قلب زکوٰۃ کے بجائے مال غنیمت سے کرتے تھے۔ جنگ حنین میں شریک صفوان بن امیہ کی مدد آپ نے اس مد سے کی اور وہ مسلمان ہو گئے (تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۶۵)

(۲) فتح القدیر، ص ۳۷۳، و تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۶۵

(۳) ردالمحتار، ج ۲، ص ۸۲

Marfat.com

ذکر ہوا، لام (تملیک) کا استعمال ہوا ہے اور بقیہ چار مدوں کے لیے، جن کا ذکر آگے آتا ہے، حرف ''فی'' لایا گیا ہے۔

اس سے دراصل دو مختلف حالتوں کا بیان مقصود ہے۔ فقراء اور مساکین کو جو مال دیا جاتا ہے وہ ان کا حق ہے جو ان کی طرف لوٹایا جاتا ہے (حق للسائل والمحروم) اور وہ اس کے مالک بن جاتے ہیں۔ ''لام'' کے استعمال سے یہی بتانا مقصود ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔ اور اس سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ زکوٰۃ دراصل فقراء و مساکین کا حق ہے اس لیے ان ہی لوگوں کی فلاح و بہبود پر اس کا بڑا حصہ صرف ہونا چاہیے۔

زکوٰۃ کی دوسری چار اصناف یعنی غلاموں کی آزادی، قرضدار، فی سبیل اللہ اور مسافر کے لیے ''فی'' کا استعمال بتاتا ہے کہ فقراء اور مساکین کی مدد سے اگر رقم بچ جائے یا کوئی فقیر اور مسکین نہ ملے تو ان مدوں میں زکوٰۃ کا مال صرف کیا جائے۔ ان اصناف کو مصارفِ زکوٰۃ میں اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ یہ لوگ بھی بہرحال اعانت کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو مال اس طرح نہیں دیا جاتا کہ وہ اس کے مالک بن جائیں بلکہ صاحبِ صدقہ یا مسلمانوں کے امیر کی طرف سے ان کی ضرورت رفع کردی جاتی ہے۔

امام رازیؒ لکھتے ہیں:

> ''اول چار اصناف زکوٰۃ کو ان کا حصہ ان کے حوالہ کردیا جاتا ہے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں خرچ کریں لیکن ''فی الرقاب'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کی گردنیں چھڑانے میں اسے صرف کیا جائے اس لیے یہ حصہ ان کے حوالہ نہیں کیا جاتا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں بلکہ ان کی گردنیں چھڑانے میں خرچ کیا جاتا ہے۔''(۱)

مذکورہ چار اصناف کا شمار فقراء اور مساکین میں نہیں ہوگا۔ یہ اغنیاء ہی کا طبقہ ہے جس کو گردشِ زمانہ نے عارضی طور پر محتاج و تنگ دست بنا دیا ہے اور یہی وقتی احتیاج ہے جس کی وجہ سے ان کو اصنافِ زکوٰۃ میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

''صدقہ کسی غنی کے لیے جائز نہیں ہے مگر پانچ قسم کے لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں:

(۱) تفسیر کبیر، ج ۱۶، ص ۱۱۲

Marfat.com

عاملینِ زکوٰۃ، ایسا آدمی جس کو مال سے خرید لیا گیا ہو (یعنی غلام)، قرضدار، اللہ کی راہ کا مجاہد اور مسکین جو صدقہ پا کر غنی ہو گیا ہو۔''(۱)

''لام'' اور ''فی'' کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ہمارے علماء اور فقہاء کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ زکوٰۃ آٹھوں مصارف پر یکساں خرچ ہونی چاہیے۔ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ اور ایک گروہ کا خیال ہے کہ جو صنف زیادہ امداد کی حاجت مند ہو اس پر صرف کیا جائے، آٹھوں اصناف پر یکساں خرچ کرنا ضروری نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔ گویا اگر کوئی قرضدار قرض کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے تو فقراء اور مساکین کی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے اس کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے۔ راقم کے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ فقراء اور مساکین کی حاجتیں سب پر مقدم ہیں۔ ان کی حاجات کو رفع کرنے کے بعد ہی کسی دوسرے حاجت مند کی حاجت روائی کی جا سکتی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد کے ایک واقعہ سے راقم کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ یحیٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مجھے صدقہ وصول کرنے کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے فقراء کو دینا چاہا لیکن مجھے کوئی فقیر اور محتاج نہیں ملا جس کو میں دیتا کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لوگوں کو بے نیاز کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے زکوٰۃ کے مال سے غلام خرید کر آزاد کر دیے۔(۲)

مؤلفۃ القلوب کی طرح ''فی الرقاب'' کے بارے میں اکثر علماء و فقہاء کا یہ خیال ہے کہ یہ مد منسوخ ہو گئی ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ مد بھی منسوخ نہیں ہے۔ بلاشبہ جہاں تک نفسِ غلامی کا تعلق ہے تو اس کا اب دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے لیکن غلامی سے ملتی جلتی صورتیں آج بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً بدھوا مزدور (Bonded Labour) اور جنگی قیدی۔ زکوٰۃ کے مال سے ان کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ امام احمد کا یہی مسلک ہے۔ قاضی ابن عربی مالکیؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) ابوداؤد، ابن ماجہ عن ابن ابی شیبہؒ

(۲) ملاحظہ ہو، سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ ا بن عبدالحکیم ص ۵۹

Marfat.com

''جب مسلمان کو مسلمان کی غلامی سے آزاد کرانا عبادت میں داخل ہے اور زکوٰۃ کا مال اس غرض سے صرف کیا جاسکتا ہے تو کافر کی غلامی سے چھڑانا تو بدرجۂ اولی جائز ہونا چاہیے۔''(۱)

غارمین (قرضدار)

یہ زکوٰۃ کا چھٹا مصرف ہے۔ غارمین غارم کی جمع ہے۔ غارم اس شخص کو کہتے ہیں جو قرضدار ہو۔ لیکن کیا غارم کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوگا جو مقروض ہو گیا ہو خواہ اس نے قرض کسی بھی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے لیا ہو اور خواہ قرض کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک غارم سے مراد وہ قرضدار ہے جو قرض کی مقدار سے زیادہ کا مالک نہ ہو۔ (۲) ابن جریر طبریؒ نے لکھا ہے کہ غارم وہ شخص ہے جو اسراف نہ کرنے کے باوجود مقروض ہو گیا ہو۔ (۳)

اس سلسلے میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ قرض لینے والا کون ہے، وہ غنی ہے یا نادار اور قرض کی نوعیت کیا ہے، یعنی قرض کسی ذاتی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے لیا گیا ہے، مثلاً شادی بیاہ، لباس اور علاج وغیرہ یا کسی ذریعۂ معاش کے حصول کے لیے، اور یا اتفاقی حوادث، مثلاً سیلاب، آتش زدگی اور چوری اور ڈکیتی کی وجہ سے آدمی مقروض ہو گیا ہے۔ جہاں تک غنی کا تعلق ہے، اور وہ کسی اتفاقی حادثہ کا شکار نہیں ہوا ہے، اس کے قرض کی ادائیگی زکوٰۃ کے مال سے جائز نہیں ہے۔ رہا غریب و نادار تو اس کے قرض کی ادائیگی زکوٰۃ کے مال سے کی جائے گی بشرطیکہ وہ درج ذیل شرطیں پوری کرتا ہو:

(۱) قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں قرضدار کو ذلت و رسوائی کا اندیشہ ہو۔

(۲) قرض کسی کارِ معصیت، مثلاً شراب نوشی، جوا، ناجائز مقدمہ بازی اور فحاشی وغیرہ کے لیے نہ لیا گیا ہو۔

---

(۱) احکام القرآن، ج ۲ ص ۹۵۶
(۲) ردالمختار، ج ۲، ص ۶۳
(۳) تفسیر طبری، ج ۱۴، ص ۳۳۸

Marfat.com

(۳) قرض نمود ونمائش کے کسی کام، مثلاً جہیز کی فراہمی، ختنہ، غیر ضروری مذہبی اور غیر مذہبی تقریبات اور رسوم کی انجام دہی کے لیے نہ لیا گیا ہو۔

(۴) قرضدار وفات پا چکا ہو اور اس کا وارث قرض کی ادائیگی سے معذور ہو۔

ہمارے بعض علماء وفقہاء کے نزدیک میت کے قرض کی ادائیگی زکوٰۃ کے مال سے جائز نہیں ہے۔ امام احمدؒ کا یہی مسلک ہے۔ حنفیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ سے جائز اور ناجائز دونوں قول منقول ہیں۔ امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔(۱)

راقم کے نزدیک یہی آخری مسلک راجح ہے بشرطیکہ قرض کی وجہ ناداری ہو، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس سلسلے میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

''میں مسلمانوں سے ان کی ذات سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہوں۔ جس نے وفات پائی اور اس پر قرض واجب الادا ہے تو اس کی ادائیگی کا میں ذمہ دار ہوں۔

(متفق علیہ)

فی سبیل اللہ

یہ زکوٰۃ کا ساتواں مصرف ہے۔ فی سبیل اللہ ایک وسیع الاطلاق اصطلاح ہے۔ ہر وہ اچھا کام جس سے منکر مٹے اور معروف کا بول بالا ہو یا کسی معنی میں اسلام کو سر بلندی حاصل ہو ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہے۔ قرآن مجید میں اس کے محلِ استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جہاد (۲)، ہجرت (۳) اور دعوت دین (۴) جیسے امور شامل ہیں۔ آج صحیح معنی میں اسلامی ریاست نہ ہونے کی وجہ سے جہاد اور ہجرت دونوں ہی موقوف ہیں اس لیے اس مد کا مال ان کاموں میں صرف کیا جائے جو غایتِ جہاد سے مشابہت رکھتے ہوں، مثلاً دین کی تبلیغ اور غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ا، ص ۲۹۹

(۲) دیکھیں، سورہ بقرہ ۲۴۴، ۲۴۶۔ سورہ آل عمران ۱۳۔ سورہ نساء ۷۴، ۹۴۔ سورہ توبہ ۸۱

(۳) سورہ بقرہ ۲۱۸، سورہ نساء ۱۰۰، سورہ انفال ۷۴، سورہ توبہ ۲۰

(۴) سورہ بقرہ ۲۷۳

Marfat.com

کے لیے کتابوں کی تیاری اور محاضرات کا اہتمام وغیرہ۔ دینی تعلیم کا انتظام بھی اس میں داخل ہے۔

لیکن اس معاملہ میں مسلمانوں نے اعتدال اور دور بینی سے کام نہیں لیا۔ علماء کرام نے محض اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے اس بارے میں حد درجہ غفلت اور سہل انگاری کا ثبوت دیا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ صدقہ وزکوٰۃ کا صرف ایک ہی مصرف رہ گیا ہے اور وہ دینی مدارس ہیں، فقراء ومساکین اور دوسرے حاجت مندوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہ ملّت کا بہت بڑا المیہ ہے۔ فقراء اور مساکین کی بنیادی ضرورتوں سے صرف نظر کر کے زکوٰۃ کے مال سے دینی مدارس چلانے کو کسی طرح درست نہیں کہا جاسکتا ہے۔ تعلیم کا درجہ بہرحال بنیادی انسانی حاجات کی تکمیل کے بعد آتا ہے۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں میں فقراء اور مساکین کا ایک بڑا طبقہ ہے جو طرح طرح کی معاشی مشکلات میں گرفتار ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے غریبوں کے مسائل اور بھی بڑھا دیے ہیں۔

قرآن نے زکوٰۃ کی مدیں مقرر کردی ہیں اور ان کی ترتیب بھی قائم کردی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے عمل نے ان کو واضح اور موکد کردیا ہے۔ کسی عالم دین کو، خواہ وہ علم وتفقہ میں درجۂ اجتہاد ہی رکھتا ہو، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مصارفِ زکوٰۃ کی منصوص ترتیب میں ادنیٰ درجہ کا بھی تغیر یا تقدیم وتاخیر کرے۔ تعمیلِ حکم یہی نہیں ہے کہ حکم بجالایا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ حکم کو اس طرح عملی جامہ پہنایا جائے جو شارع کے منشاء کے عین مطابق ہو۔ مصارفِ زکوٰۃ میں فقراء اور مساکین کو جو تقدم حاصل ہے اس کو دوسری اصنافِ زکوٰۃ کے لیے مؤخر نہیں کیا جاسکتا ہے خواہ ان کی احتیاج کتنی ہی شدید ہو۔ مصارف زکوٰۃ کے ذکر بعد فرمایا گیا ہے: واللّٰہ علیم حکیم۔ اس کا مطلب ہے کہ مصارفِ زکوٰۃ کی جو ترتیب اللہ نے قائم کردی ہے اس کو تبدیل نہ کیا جائے۔ اللہ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ امداد واعانت میں کسی حاجت مند کا کیا درجہ ہے۔

Marfat.com

ابن السبیل (مسافر)

یہ زکوٰۃ کا آٹھواں مصرف ہے۔ دورِ حاضر میں اس نوح کی مسافرت کا وجود نہیں ہے جو عہد قدیم اور نبی ﷺ کے زمانے میں تھی کہ اگر کسی بستی کے لوگ حاجت مند مسافروں کی خبر گیری نہ کریں تو ان کی ہلاکت یقینی تھی۔ اس دور میں حقیقی معنی میں مسافرت کا اطلاق ان خُدّامِ دین پر ہوگا جنھوں نے خود کو تبلیغِ دین کے کام کے لیے وقف کر دیا ہو اور کسبِ معاش کے لیے وقت نکالنا ان کے لیے مشکل ہو(۱) ہر شہر و قریہ کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان کی مدد کریں اور زکوٰۃ کے مال سے بھی ان کی مدد کی جائے۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ہر شہر میں کم از کم ایک مسافر خانہ ایسا ضرور تعمیر کیا جائے جس میں زکوٰۃ کے مال سے مبلّغینِ دین کے ٹھہرنے اور ان کے کھانے وغیرہ کا معقول انتظام ہو۔ (۲) جو لوگ کاروبار یا دوسرے مشاغل کی وجہ سے وہاں ٹھہریں ان سے ٹھہرنے کا معقول معاوضہ لیا جا سکتا ہے جیسا کہ ہوٹلوں کا قاعدہ ہے لیکن اس آمدنی کو تبلیغِ دین کے کاموں کے لیے مخصوص رکھا جائے۔

زکوٰۃ کی اس مد سے ان مسافروں کی بھی مدد کی جائے جو کسی ناگہانی آفت کا شکار ہو گئے ہوں۔ مثلاً ٹرین اور ہوائی جہاز کے حادثات، اچانک بیماری، ٹکٹ اور اسباب و نقدی کی چوری وغیرہ۔ راقم نے بارہا دیکھا ہے کہ جب مصیبت کا مارا کوئی مسافر شہر میں آجاتا ہے تو اس کی مدد کے لیے چندہ کیا جاتا ہے۔ ایسے حاجت مندوں کی مدد کا انتظام اللہ نے زکوٰۃ کی شکل میں کر دیا تھا، لیکن مسلمانوں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اس کو ضائع کر دیا ہے۔

کیا زکوٰۃ کی منتقلی جائز ہے؟

شریعت نے یہ اصول مقرر کر دیا ہے کہ زکوٰۃ جس جگہ کے لوگوں سے لی جائے اسی

---

(۱) دیکھیں سورہ بقرہ۔ ۲۷۳

(۲) اس کا اطلاق ان علماء پر نہ ہوگا جو اپنے اپنے مکتبِ فکر کی وکالت کے لیے مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہیں یا اس مقصد کے لیے بلائے جاتے ہیں۔

Marfat.com

جگہ کے فقراء و مساکین پر اس کو خرچ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو دوسری باتوں کے علاوہ ان کو یہ ہدایت بھی دی:

اعلمھم ان اللہ افترض علیھم فی اموالھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم و ترد الی فقرائھم (۱)

''انھیں بتلاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء پر صرف کیا جائے گا۔''

ایک دوسری حدیث میں ہے:

امرت ان اخذ الصدقۃ من اغنیائکم واردھا علی فقرائکم (۲)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مالداروں سے صدقہ وصول کروں اور تمہارے محتاجوں کو لوٹا دوں۔''

اس نبوی ہدایت پر صحابہ کرامؓ کا عمل تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب حضرت معاذؓ نے ان کے پاس زکوٰۃ کا ایک تہائی حصہ بھیجا تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ''میں نے آپ کو جزیہ وصول کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس لیے بھیجا تھا کہ مالداروں سے زکوٰۃ لے کر ان ہی لوگوں کے فقراء و مساکین کو لوٹا دیں۔'' حضرت معاذؓ نے کہا ''یہاں زکوٰۃ کے مستحق کسی شخص کو چھوڑ کر میں نے یہ مال آپ کے پاس نہیں بھیجا ہے۔'' دوسرے سال حضرت معاذؓ نے نصف زکوٰۃ روانہ فرمائی۔ اس بار بھی دونوں کے درمیان اسی طرح کی گفتگو ہوئی۔ پھر تیسرے سال حضرت معاذؓ نے کل زکوٰۃ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھیج دی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس موقع پر بھی وہی بات کہی جو وہ پہلے کہہ چکے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت معاذ نے کہا ''مجھے زکوٰۃ لینے والا کوئی آدمی نہیں ملا۔'' (۳) نبی اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین کے طرز عمل کے پیش نظر فقہاء کے درمیان یہ امر تقریباً متفق علیہ ہے کہ زکوٰۃ کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا جائز نہیں ہے بجز

---

(۱) صحیحین

(۲) بخاری

(۳) کتاب الاموال، ابوعبید، ص ۵۶

Marfat.com

اس کے کہ وہاں زکوٰۃ کا کوئی مستحق موجود نہ ہو۔ شافعی و حنبلی اور مالکی فقہ میں یہی حکم بیان کیا گیا ہے جو مطابقِ سنّت ہے۔(۱)

فقہ حنفی میں اس کو مکروہ کہا گیا ہے۔ ان کے نزدیک ایک شہر سے دوسرے شہر میں زکوٰۃ کا انتقال صرف اس صورت میں جائز ہے جب کہ زکوٰۃ قرابت دار محتاجوں کو منتقل کی جائے یا کسی ایسے شخص کو دی جائے جو اس کے شہر کے محتاجوں سے زیادہ مدد کا مستحق ہو یا طالب علموں کو دی جائے اور یا کسی ایسے عالم کی طرف اسے منتقل کیا جائے جو اپنی خدماتِ دینی کے اعتبار سے مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید ہو۔(۲)

اس مسلک میں گو کہ توسّع ہے لیکن مطابقِ سنت نہیں ہے۔ صحیح بات وہی ہے کہ ایک شہر کی زکوٰۃ دوسرے شہر میں صرف اس صورت میں منتقل کی جا سکتی ہے جب وہاں کوئی طالبِ زکوٰۃ نہ ہو یا فقراء و مساکین کی مدد کے بعد مال بچ گیا ہو۔

زکوٰۃ سے متعلق چند بنیادی مسائل

زکوٰۃ سے متعلق چند بنیادی مسائل ایسے ہیں جن کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ملّت کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ نے اس سلسلے میں مکمل سکوت اختیار کر رکھا ہے۔ یہ مسائل درج ذیل ہیں:

(۱) کیا موجودہ نصابِ زکوٰۃ ناقابلِ تغیر ہے؟

(۲) کیا دینی مدارس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟

(۳) کیا انفرادی طور پر زکوٰۃ نکال دینے سے وہ ادا ہو جاتی ہے؟

(۴) کیا موجودہ حالات میں نظامِ زکوٰۃ کا احیاء ضروری ہے؟

(۵) کیا موجودہ دور کے اقتصادی نظام کے تناظر میں سودی لین دین جائز ہے؟

ان بنیادی مسائل کا اگلے صفحات میں جائزہ لیا گیا ہے اور کسی خوف تردید کے بغیر حق بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک بنیادی مسئلہ کی

(۱) ملاحظہ ہو، الاحکام السلطانیہ، ص ۱۱۹

(۲) الدر المختار، ج ۲، ص ۹۳، ۹۴

Marfat.com

وضاحت ضروری ہے، اور وہ یہ کہ باعتبارِ تشریع قرآن اور سنّت (۱) میں تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے۔

یہ بات متفق علیہ ہے کہ اسلامی قانون سازی میں پہلا اور بنیادی ماخذ قرآن مجید ہے۔اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن میں زیادہ تر احکام کے اصول وکلیات بیان کیے گئے ہیں جن کی مدد سے ہر دور میں جزئی احکام نکالے جاسکتے ہیں۔چنانچہ قرآن کے اصولی احکام کے اوّلین شارح نبی علیہ السلام نے اپنے عہد کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس کے اصول وکلیات سے جزئی احکام مستنبط کیے۔ان ہی جزئی احکام کو سنّت کہا جاتا ہے۔مثال کے طور پر قرآن مجید میں کہا گیا ہے: اقیموا الصلوٰۃ ''نماز قائم کرو'' یہ ایک اصولی حکم ہے۔قرآن نے بالتفصیل یہ نہیں بتایا کہ نماز کیسے پڑھی جائے۔یہ کام رسول اللہ نے انجام دیا۔اسی طرح قرآن میں ہے: واتوا الزکوٰۃ ''زکوٰۃ دو'' یہ بھی ایک اصولی حکم ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ کتنے مال پر اور کتنی مقدار میں زکوٰۃ نکالی جائے، اس کی وضاحت بھی رسول اللہ نے فرمائی۔دوسرے جزئی احکام (سنن) کا بھی یہی معاملہ ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ نے قرآن کے کلّی احکام سے جو جزئی قوانین بنائے وہ حالات وظروف کی تبدیلی کے باوجود ناقابلِ تغیر ہیں؟ علماء کی اکثریت کا خیال ہے کہ وہ ناقابلِ تغیر ہیں۔راقم کا خیال اس سے تھوڑا مختلف ہے۔وہ جزئی احکام (سنن) جن کا تعلق زمانہ کے حالات کے تغیر سے نہیں ہے وہ تو ناقابلِ تغیر ہیں۔مثلاً نماز وغیرہ سے متعلق تفصیلات۔لیکن جن جزئی احکام کا تعلق سماجی احوال ومسائل سے ہے وہ حالاتِ زمانہ کی تبدیلی سے بقدر ضرورت تبدیل ہوسکتے ہیں۔اور یہ تبدیلی منشائے شریعت کے عین مطابق ہوگی۔(۲)

---

(۱) سنّت سے ہماری مراد قرآن کے مجمل احکام کی وہ تشریح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کے حالات وظروف کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے ارشاد فرمائی ہے۔(مصنف)

(۲) اس تبدیلی کا مجاز صرف مسلمانوں کا امیر اور اس کی مجلسِ شوریٰ ہوگی نہ کہ انفرادی طور پر علماء وفقہاء۔

Marfat.com

کیا موجودہ نصاب نا قابلِ تغیر ہے؟

متذکرہ بالا اصولی گفتگو کے بعد اب ہم پہلے مسئلہ کی طرف آتے ہیں، یعنی کیا موجودہ نصابِ زکوٰۃ عہد جدید کے حالات وضروریات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟

اس سلسلے میں اکثر علماء کا خیال یہ ہے کہ موجودہ نصابِ زکوٰۃ نا قابلِ تغیر ہے۔ البتہ اگر عصری ضرورتیں داعی ہوں تو نوائب کے نام سے نئے ٹیکس لگائے جاسکتے ہیں۔ (۱)

لیکن مسئلہ محض ضرورتوں کے پورا ہونے کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ نصاب زکوٰۃ جس حدِ غنا کی بنیاد پر وضع کیا گیا تھا وہ حدِ غنا اب باقی ہے یا نہیں؟ نصاب زکوٰۃ پر ایک گہری نگاہ ڈالنے سے بالکل واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں حدِ غنا وہ نہیں ہوسکتی جو نبی ﷺ کے عہد میں تھی۔

آیئے دیکھیں کہ اس بارے میں ہم کو قرآن مجید سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں مصارفِ زکوٰۃ متعین کر دیے گئے ہیں اور ''فریضة من اللہ'' کہہ کر بتا دیا گیا ہے کہ وہ آئندہ بھی نا قابلِ تغیر ہیں۔ لیکن نصاب زکوٰۃ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ آخر اس سکوت کی وجہ؟ جس طرح مصارفِ زکوٰۃ متعین کئے گئے تھے اسی طرح چند جملوں میں نصاب کی تفصیل بھی ممکن تھی لیکن اس سے گریز کیا گیا۔

اس کی وجہ اس کے علاوہ کوئی دوسری نہیں کہ مصارفِ زکوٰۃ کا تعلق چونکہ حالات زمانہ کی تبدیلی سے نہیں تھا اس لیے ان کی تفصیل کر دی گئی اور ایسے جامع الفاظ اور اسلوب میں کی گئی کہ وہ ہر دور کے حالات پر منطبق ہوسکتی ہے۔ لیکن نصاب کا معاملہ حالات زمانہ کی تبدیلی سے جڑا ہوا تھا اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا گیا اور یہ کام نبی ﷺ نے انجام دیا۔ اب ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو نصاب بنایا وہ اپنے عہد کے معاشی حالات کی روشنی میں بنایا تھا اور ایسا کر کے اُمت کو تعلیم دی تھی کہ وہ بھی اپنے عہد کے معاشی حالات کو سامنے رکھ کر نیا نصاب مقرر

---

(۱) ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بھاولپور، ص ۲۴۴

Marfat.com

کریں تاکہ مالی قدر کے لحاظ سے نصابِ زکوٰۃ میں عدمِ توازن اور اس کے مقاصد کے حصول میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ نصابِ زکوٰۃ عصری معاشی حالات میں بالکل غیر متوازن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ رکھا تھا۔ مشہور حدیث ہے: لیس فیما دون خمس اواق من الورق صــدقة (موطا، رقم ۵۷۸) ''پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔'' چاندی ہی کو بنیاد بنا کر دوسری اجناسِ زکوٰۃ کا نصاب مقرر کیا گیا اور ان سب کی مالی قدر (Valuation) پانچ اوقیہ چاندی کے مساوی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جو مالی قدر پانچ اوقیہ چاندی کی تھی یعنی ۲۰۰ درہم، وہی قیمت پانچ وسق کھجور، پانچ اونٹ اور چالیس بکریوں کی تھی۔

لیکن موجودہ زمانے میں اجناسِ زکوٰۃ کی قدر و قیمت میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت (۱۵/اگست ۲۰۰۴) دلّی میں ایک کلو چاندی کی قیمت ۱۰۴۷۵ روپے ہے۔ اس حساب سے نصاب کی پانچ اوقیہ چاندی (تقریباً ۶۴۲ گرام) کی قیمت ۶۷۲۴ روپے ہوئی۔ فقہاء نے سونے کا نصاب ۲۰ مثقال (۷ تولہ) رکھا ہے(۱)۔ اس وقت (۱۵/اگست ۲۰۰۴) دلّی میں ۱۰ گرام سونے کی قیمت ۶۰۲۰ روپے ہے۔ اس حساب سے ۷ تولہ (تقریباً ۷۷ گرام) سونے کی قیمت تقریباً ۴۶۳۵۴ ہوئی۔ صاف ظاہر ہے کہ چاندی اور سونے کے نصاب میں مالی قدر کے لحاظ سے بہت فرق آ گیا ہے۔ اب دیکھیں کہ اگر کسی مسلمان کے پاس ۶۴۲ گرام چاندی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ اس کی موجودہ قیمت ۶۷۲۴ روپے ہے۔ لیکن اگر کسی کے پاس ساڑھے چھ تولہ سونا ہے، جس کی موجودہ قیمت تقریباً ۳۹۱۳۰ روپے ہے، تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ کیا اس صورت حال کے باوجود علماء کا اصرار صحیح ہوگا کہ موجودہ نصاب ناقابلِ تغیر ہے۔

یہی معاملہ نصاب کے جانوروں اور پھلوں کا ہے جن کی مالی قدر چاندی کی موجودہ قدر سے کہیں زیادہ ہے۔ اس بنا پر اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں کہ موجودہ نصاب کو

---

(۱) علماء فرنگی محل کے نزدیک سونے کا نصاب پانچ تولہ اڑھائی ماشہ ہے۔

Marfat.com

تبدیل کیا جائے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ موجودہ دور میں حدِ غنا کیا ہو علماء کے نزدیک غنی سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کے روز مرّہ کے اخراجات پورا کرنے کے بعد دوسو درہم سرمایہ کا مالک ہو(۱)۔ نبی ﷺ کے عہد میں ایک متوسط درجہ کے آدمی کا ماہانہ خرچ ۲۰ سے ۳۰ درہم تھا۔ ۸ ہجری میں جب مکہ فتح ہوا تو نبی ﷺ نے حضرت عتاب بن رسیدؓ کو مکہ کا عامل (گورنر) بنایا اوران کی تنخواہ ۳۰ درہم ماہانہ مقرر کی، جس میں ان کے گھر کے خرچ کے علاوہ نوکر چاکر کی کفالت بھی شامل تھی۔(۲)

اس تاریخی حوالے کی مدد سے اس دور میں حدِ غنا کا تعین بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یقیناً اس سے بہت مختلف ہوگی جو نبی ﷺ کے عہد میں تھی۔

زکوٰۃ اور دینی مدارس

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ زکوٰۃ اور دوسری خیراتی رقوم کا بڑا حصہ دینی مدارس میں چلا جاتا ہے۔اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس میں غریبوں اور ناداروں کے بچے مفت تعلیم پاتے ہیں۔بعض لوگ مصارفِ زکوٰۃ کی ایک مد ''فی سبیل اللہ'' کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ اس میں دینی تعلیم بھی داخل ہے اس لیے دینی مدرسوں کو زکوٰۃ وخیرات دی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں ہی دلیلیں بہت کمزور ہیں۔

ہم اس سے پہلے مصارفِ زکوٰۃ پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں ان کو قارئین ایک بار پھر دیکھ لیں۔زکوٰۃ کے مصارف خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیے ہیں اس لیے اب کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر کرے۔نصاب زکوٰۃ کی پیروی صرف یہی نہیں ہے کہ جن مدات میں مال خرچ کرنے کو کہا گیا ہے ان میں خرچ کیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن میں مصارف کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے اس کی مکمل پیروی کی جائے۔اب دیکھیں کہ قرآن کے بیان کے مطابق زکوٰۃ کا اوّلین مصرف فقراء اور مساکین ہیں (الصدقات للفقراء والمساکین)۔فقہاء تسلیم کرتے ہیں کہ ''الصدقات للفقراء والمساکین

---

(۱) اسلامی معاشیات، مولانا سید مناظر احسن گیلانی ص ۴۲۳

(۲) خطبات بھاولپور، ص ۳۹۱

Marfat.com

الخ“ میں لام تملیک کا ہے۔ یعنی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک کہ وہ فقراء اور مساکین کے حوالے نہ کردی جائے اور اس پر ان کو تصرّف کا کلی اختیار حاصل نہ ہو۔ دینی مدارس میں اس اصول پر عمل نہیں ہوتا اور زکوٰۃ نادار طلبہ کے حوالے نہیں کی جاتی ہے۔

اس معاملے میں دینی مدارس میں جو طریقے مروّج ہیں وہ حد درجہ نامناسب ہیں۔ مختلف حیلوں سے فقراء و مساکین کے مال کو جائز بنایا جاتا ہے۔ مثلاً اکثر مدرسوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ غریب طلبہ کو بلا کر کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا مال ہے اب تم اس کو اپنی خوشی سے اس مدرسہ کو دیدو۔ غور فرمائیں، یہ جبر اور استحصال نہیں تو کیا ہے اور اس کو کس طرح تملیک کہا جاسکتا ہے۔ یہ تو اسی قسم کا حیلہ ہے جس کے عادی کبھی علماء یہود رہ چکے ہیں۔ سبت (۱) کا واقعہ خود قرآن میں مذکور ہے (۲)۔ دینی مدارس کے علماء اس سے عبرت لیں۔ (۳)

بعض مدارس میں یہ صورت رائج ہے کہ زکوٰۃ کا مال نادار بچوں سے قرض کے طور پر لے لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی تملیک کی شرط مفقود ہے۔ اس کے علاوہ یہ حق انھیں کس نے دیا کہ وہ نادار بچوں سے ان کا مال بطور قرض لیں۔ پھر کیا قرض کی یہ رقم آج تک نادار بچوں کو واپس کی گئی؟ ان وجوہ سے یہ طریقہ بھی ناجائز ہے۔

یہ گفتگو ہم نے یہ بات مان کر کی ہے کہ دینی مدرسوں کے بچوں پر زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کے فقراء و مساکین سے مراد زیر تعلیم غریب بچے نہیں بلکہ عام فقراء و مساکین مراد ہیں۔ اور ان کا مقصد تعلیم سے کہیں زیادہ حوائجِ ضروریہ کی فراہمی ہے۔ یہ بات طے کرنا فقراء و مساکین کا کام ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال کا کتنا حصہ اپنی خانگی ضرورتوں پر خرچ کریں اور کتنا حصہ اپنے بچوں کی تعلیم وغیرہ پر۔

جہاں تک ”فی سبیل اللہ“ کے مصرف کا تعلق ہے تو اس میں بلاشبہ توسّع ہے۔ لیکن اس

---

(۱) سنیچر کا دن یہودیوں کے یہاں بہت متبرک دن خیال کیا جاتا ہے۔ اس دن عبادت کے علاوہ ہر کام ممنوع ہے۔ لیکن ماضی میں یہودیوں نے مختلف حیلے بہانے سے اس دن کی حرمت کو پامال کیا۔ دیکھیں سورہ اعراف آیت ۱۶۳۔

(۲) سورہ اعراف، ۱۶۳

(۳) فقراء و مساکین کا حق کھانے ہی کی وجہ سے آج دینی مدارس سے علم اور روحانیت دونوں ہی چیزیں رخصت ہوچکی ہیں۔

Marfat.com

اصطلاح کا صحیح مفہوم جہاد فی سبیل اللہ ہے اور جہاد کی جو صورتیں کسی دور میں ممکن ہوں ان میں زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔ دینی تعلیم بھی اس میں آسکتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کل زکوٰۃ دینی مدرسوں کو دے دی جائے اور سماج کے فقراء و مساکین سے صرف نظر کرلیا جائے۔ ہم بتکرار لکھ چکے ہیں کہ زکوٰۃ کا اوّلین مصرف سماج کے فقراء اور مساکین ہیں۔ ان کی امداد و اعانت کے بعد درجہ بدرجہ، جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے، دوسرے مستحقین کو زکوٰۃ دی جائے۔

کیا زکوٰۃ انفرادی طور پر نکالی جاسکتی ہے؟

اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو کسی شخص کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ اپنی زکوٰۃ انفرادی طور پر نکالے، اور اگر وہ اس طور پر زکوٰۃ نکالتا ہے تو از روئے شریعت وہ ادا نہ ہوگی اور حکومت اس سے محاسبہ کرے گی۔ (۱)

لیکن اگر اسلامی حکومت قائم نہیں ہے تو اس صورت میں انفرادی طور پر زکوٰۃ نکال دینے سے وہ ادا ہوجائے گی لیکن مستحسن یہ ہے کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ وغیرہ بیت المال میں جمع کرے اور وہاں سے فقراء اور مساکین میں اس کو مناسب ڈھنگ سے تقسیم کیا جائے۔

یہ بات فراموش نہ ہو کہ زکوٰۃ نماز ہی کی طرح ایک عبادت ہے۔ جس طرح انفرادی طور پر فرض نماز ادا کرنے سے وہ ادا ہوجاتی ہے لیکن اس کا درجہ بہر حال نماز باجماعت سے کم ہے اور اس صورت میں نمازی بہت سے ان روحانی اور مادی فوائد سے محروم ہوجاتا ہے جو نماز باجماعت سے حاصل ہوتے ہیں یا حاصل ہونے چاہئیں۔ ٹھیک یہی معاملہ انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنے کا ہے۔ اجتماعی طور پر زکوٰۃ نکالنے میں جو روحانی اور مادی فائدے ہیں، بالخصوص ریا و نمود سے حفاظت، وہ انفرادی زکوٰۃ کی صورت میں حاصل نہیں ہوسکتے ہیں۔

نظامِ زکوٰۃ کا احیاء

ابھی ہم نے اوپر انفرادی زکوٰۃ کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اس سے بالکل واضح ہوگیا کہ زکوٰۃ کے متنوع مقاصد و مصالح کے حصول کے لیے نظام زکوٰۃ کا قیام نہایت ضروری

---

(۱) بدقسمتی سے موجودہ دور میں اکثر مسلم ممالک کے حکمراں اس فرض شرعی کی طرف سے بالکل غافل ہیں جس سے ملت مسلمہ کو بے اندازہ نقصان پہنچ رہا ہے۔

Marfat.com

ہے۔ یاد رکھیں کہ اسلام میں اجتماعیت کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ کیا نماز اور کیا روزہ سب عبادتوں کی روح اجتماعیت ہے۔

حج سب بڑی اجتماعی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمرہ پر حج کو فضیلت حاصل ہے حالانکہ قیامِ عرفات کے علاوہ عمرے میں تقریباً سارے اعمالِ حج انجام پاتے ہیں لیکن ایک اجتماع کے نہ ہونے کی وجہ سے اللہ نے اس کا درجہ حج سے کم رکھا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ زکوٰۃ جیسی اہم عبادت کو اس اجتماعی عمل سے الگ رکھا جائے۔

عہدِ رسالت اور عہد خلافت میں (حضرت عثمانؓ کا آخری دور چھوڑ کر) زکوٰۃ و صدقات اجتماعی طور پر ادا کیے جاتے تھے اور ایک نظام کے تحت وہ تقسیم کیے جاتے تھے۔ بعد کے ادوار میں جب مسلمانوں میں ملوکیت کا غلبہ ہوا تو نظام زکوٰۃ بھی اس سے متاثر ہوا۔ لیکن کسی نہ کسی طور پر وہ بہر حال قائم رہا۔

ہم نے نماز اور زکوٰۃ میں جن مناسبات کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا ہے ان کی موجودگی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان نماز کی ادائیگی کا اجتماعی انتظام تو کریں گے لیکن زکوٰۃ کے اجتماعی نظم سے ان کو کوئی سروکار نہ ہوگا۔ ماضی میں مسلمانوں نے اس وقت بھی اس نظام کو باقی رکھا جب نام نہاد خلفاء زکوٰۃ کو اپنے ذاتی عیش و آرام پر خرچ کرنے لگے تھے۔ بنی اُمیہ کے زمانہ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ اب زکوٰۃ کس کو دیں؟ آپ نے فرمایا: وقت کے حاکم کو۔ اس نے کہا: اذا یتخذون بہا ثیابا وطیبا ''اس وقت بھی جب کہ وہ زکوٰۃ کی رقم اپنے کپڑوں اور عطر پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔'' عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا'' اگر چہ ایسا کرتے ہوں مگر دو ان ہی کو۔(۱)

اس سے نظام زکوٰۃ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ عبداللہ ابن عمرؓ نے بیت المال میں خلیفۂ وقت کے ناجائز تصرف کو تو گوارا کر لیا لیکن اس کی وجہ سے نظام زکوٰۃ کے ٹوٹ جانے کے خطرے کو پسند نہیں کیا۔

مسلمانوں میں نظام زکوٰۃ کے قیام و بقا کا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں تاتاریوں کی یلغار سے اسلامی خلافت کا بیشتر حصہ

(۱) مسند احمد، رواہ ابن ابی شیبہؒ

Marfat.com

مغلوب ومحکوم ہوگیا۔اس وقت یہ سوال اٹھا کہ اب زکوٰۃ کس کو دی جائے اور اس کا نظام کس طرح قائم ہو؟ ان حالات میں علماء وفقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ کہ غیر مسلم حاکم کو دینے کے بجائے زکوٰۃ انفرادی طور پر نکال کر غربا و مساکین کو دے دی جائے ۔وہ بادشاہت کا دور تھا جس میں کسی دوسرے نظام کا قیام، خواہ وہ بظاہر مذہبی نوعیت رکھتا ہو، ممکن نہ تھا اس لیے اس وقت علماء نے انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنے کے جواز کا فتویٰ دیا، اور وہ بالکل صحیح تھا۔لیکن عہدِ حاضر میں اس عمل کو جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔اس دور میں نظام زکوٰۃ کے قیام کی راہ میں کہیں بھی کوئی دشواری حائل نہیں ہے، غفلت و بے التفاتی کی بات دوسری ہے۔

اگر میں یہ کہوں، اور مجھے اس تلخ نوائی کے لیے معاف کیا جائے ، کہ اس وقت مسلمانوں کے عبادتی نظام سے زکوٰۃ کے اخراج کے ذمہ دار علماء کرام ہیں بالخصوص وہ علماء جو دینی مدارس سے وابستہ ہیں، تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ان علماء کو یہ خوف دامن گیر ہے کہ اگر زکوٰۃ کا نظام قائم ہوگیا تو دینی مدارس جو ان کا ذریعۂ معاش ہیں اور مسلمانوں میں ان کے مذہبی اقتدار کے قیام کا ذریعہ بھی، بند ہوجائیں گے۔علماء کے اس خودغرضانہ رویے نے ملّت کے اجتماعی مفاد کو ناقابلِ تلافی حد تک نقصان پہنچایا ہے۔آج حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کے فقراء اور مساکین کا، جن میں بیوہ اور مطلّقہ عورتیں اور نادار یتیم بچے بھی شامل ہیں، کوئی کفیل و نگراں نہیں ہے اور وہ ناقابل بیان مصائب میں مبتلا ہیں۔اس کے علاوہ دوسرے ملّی مسائل ہیں جو ایک نظام زکوٰۃ کے نہ ہونے کی وجہ سے ناقابلِ حل نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں مزید غفلت مناسب نہیں ہے۔ہم نے گزشتہ صفحات میں زکوٰۃ وصدقہ کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اس کی روشنی میں درج ذیل امور کی طرف مسلمانوں کو جلد متوجہ ہونا چاہیے۔

(۱) ہر مسلمان یہ بات ذہن نشین کرلے کہ انفاق واجب ہے۔جس طرح نماز کی اقامت دین میں مطلوب ہے اسی طرح راہ خدا میں مال خرچ کرنا بھی لازمی ہے۔جو مسلمان غنی ہیں وہ زکوٰۃ ادا کریں(۱) اور جو صاحب نصاب نہیں وہ حسب استطاعت صدقہ دیں۔

(۲) جس طرح قیامِ نماز کے لیے مساجد کی تعمیر ناگزیر ہے اسی طرح زکوٰۃ وصدقہ

---

(۱) ہندوستان میں چونکہ مسلمان سیاسی اعتبار سے مغلوب ہیں اور وہ حکومت وقت کو مختلف قسم کے ٹیکس ادا کرتے ہیں اس لیے ان کے معاملے میں زکوٰۃ عام انفاق کے حکم میں ہوگی یعنی وہ سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حسب توفیق اپنی مرضی اور خوشی سے راہ خدا میں مال خرچ کریں۔یہ ان کی طرف سے صدقہ نافلہ ہوگا۔

Marfat.com

کی تحصیل و تقسیم کے لیے بیت المال کا قیام ضروری ہے۔ ابتدا میں یہ نظام ضلعی سطح پر قائم کیا جائے، یعنی ہر ضلع کا اپنا ایک بیت المال ہو اور اس کی شاخیں اس ضلع کے شہر اور اس کے تمام قصبات اور دیہاتوں میں قائم ہوں اور ایک امیر یا ناظم کی نگرانی میں زکوٰۃ وصدقہ وغیرہ کی وصولی کے لیے عاملین مقرر ہوں۔

صدقہ و زکوٰۃ کی تقسیم کا کام سورہ توبہ آیت ۶۰ کے مطابق انجام دیا جائے۔ اس کی ایک مناسب صورت یہ ہوگی کہ کل خیراتی رقوم کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ دو حصے فقراء و مساکین، عاملینِ زکوٰۃ اور تالیفِ قلوب کے لیے مخصوص ہوں اور تیسرے حصے سے ان محتاجوں اور حاجت مندوں کی مدد کی جائے جن کے لیے مذکورہ آیت میں حرف ''فی'' استعمال کیا گیا ہے، یعنی غلام، قرضدار، فی سبیل اللہ اور مسافر۔ فی سبیل اللہ کی مد سے دینی مدارس کے نادار طلبہ اور حاجت مند اساتذہ کی مدد کی جاسکتی ہے۔ اس مد سے ان علماء کرام کی بھی اعانت کی جائے جو تبلیغِ دین کی وجہ سے کسبِ معاش پر قادر نہ ہوں گو کہ اس دور میں اس طرح کے داعیانِ دین بہت کم ہیں۔

(۳) ہر ضلع کی زکوٰۃ اسی ضلع کے فقراء و مساکین پر خرچ کی جائے۔ اگر خرچ کے بعد رقم بچ جائے تو وہ صوبائی بیت المال کو بھیج دی جائے۔ اور اگر ابھی صوبائی بیت المال قائم نہ ہوا ہو تو اس کو قریبی ضلع کے ناداروں پر خرچ کیا جائے۔

(۴) زکوٰۃ وصدقہ کے علاوہ فطرہ اور چرمِ قربانی کی رقوم کو بھی ضلعی بیت المال میں جمع کیا جائے اور وہیں سے ان کی تقسیم ہو۔

(۵) چونکہ مسلمانوں میں متعدد مسالک کے لوگ ہیں اس لیے بیت المال کے نظم وانتظام میں ہر مسلک کے ذمہ دار لوگوں کو شریک کیا جائے اور ان کے مشوروں سے اس کا نظم چلایا جائے۔(۱)

(۶) ضلع کی سطح پر بیت المال قائم ہونے کے بعد صوبائی بیت المال قائم کیا جائے، جس کی نگرانی میں تمام ضلعی بیت المال کام کریں۔ صوبے کی سطح پر بیت المال کے قیام کے بعد

---

(۱) اس میں دینی مدارس کے اربابِ حل وعقد کو شامل نہ کیا جائے، کیوں کہ مدارس سے وابستہ ہونے کی وجہ سے وہ غیر جانبدار نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس سے تقسیم زکوٰۃ کا عمل متاثر ہوگا۔

Marfat.com

ایک کل ہند مرکزی بیت المال قائم کیا جائے اور تمام صوبائی بیت المال اس سے منسلک ہوں۔

(۷) ہر ضلع کے بیت المال کا ایک ناظم اور اس کی ایک مجلسِ شوریٰ ہو جس میں تحصیل کی سطح کے تمام اعلیٰ منتظمین شامل ہوں۔ تمام ضلعوں کے ناظم باہم صلاح و مشورہ سے صوبائی ناظم کا انتخاب کریں اور اس کی مجلس شوریٰ ضلعی ناظمین پر مشتمل ہو۔ اسی طرح تمام صوبائی ناظم صلاح و مشورہ سے کل ہند مرکزی بیت المال کے ناظم اعلیٰ کا انتخاب کریں اور پھر یہی لوگ اس کی مجلس شوریٰ کے رکن ہوں۔ ہر سطح کے ناظم کا انتخاب اتفاقِ رائے سے ہو۔ اختلاف سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے کہ اس سے نظم اجتماعی متاثر ہوگا۔

راقم کو یقین ہے کہ اگر ایک بار زکوٰۃ کا اجتماعی نظام اس طور پر قائم ہوگیا، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، تو انشاء اللہ مستقبل میں اس نظام کی بنیاد پر مسلمانوں کا سیاسی نظمِ اجتماعی بھی قائم ہوسکتا ہے بشرطیکہ دلوں میں خوف خدا اور جذبۂ اخلاص ہو۔ اور اس ساری تگ و دو سے مقصود ذاتی مفاد اور جلبِ شہرت کے بجائے محض مسلمانوں کی خدمت اور روز آخرت اللہ کی رضا کا حصول ہو۔ دوسرے لفظوں میں "لَا اُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُوْرًا" جیسا معاملہ ہو۔ (۱)

حقیقتِ ربا (سود)

دیگر کئی مسائل کی طرح ربا کا مسئلہ بھی کافی پیچیدہ ہے۔ اس معاملے میں علماءِ کرام کے اختلاف کی وجہ سے، جس میں ان کی کم اندیشی کا دخل زیادہ ہے، اُمت کا سوادِ اعظم سخت ذہنی تردّد میں مبتلا ہے۔ چوں کہ مسئلۂ ربا کا زکوٰۃ سے گہرا تعلق ہے اس لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلے کا قرآن اور حدیث و آثار کی روشنی میں جائزہ لے کر امر حق کو واضح کریں۔

---

(۱) نظامِ زکوٰۃ کے قیام سے متعلق جو خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے وہ اسی صورت میں عملی جامہ پہن سکتا ہے جب علماء کرام بالخصوص وہ علماء جو دینی مدارس سے وابستہ ہیں، اس معاملے میں ذاتی مفاد سے بالاتر ہوکر غور و فکر کے لیے تیار ہوں۔ معلوم ہے کہ دینی مدارس کے نظم و انصرام کا ایک بڑا ذریعہ زکوٰۃ و صدقہ وغیرہ ہیں۔ اس لیے نظامِ زکوٰۃ کے قیام سے ان مدارس کو چلانے میں دشواری پیدا ہوگی۔ لیکن امت کی اجتماعی فلاح کے لیے اس دشواری پر قابو پانا ہوگا اور دینی مدارس کے قیام و انصرام کے لیے کوئی دوسرا متبادل ڈھونڈنا ہوگا۔ ملحوظ رہے کہ بیت المال کی ایک مد "فی سبیل اللہ" سے دینی مدارس کو بھی مدد مل سکتی ہے۔ بہر حال بیت المال کا قیام امت مسلمہ کی دنیوی اور اُخروی فلاح و بہبود کے لیے نہایت ضروری ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ (سورہ النساء:۲۹)

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ، ہاں اگر باہم رضامندی سے بطور تجارت ہو تو یہ جائز ہے۔''

اس آیت میں تجارت(۱) کے سوا ہر قسم کے مالی مبادلے کو ناجائز بتایا گیا ہے اور تجارت میں بھی یہ شرط ہے کہ وہ فریقین کی رضامندی سے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فریقین میں سے کسی ایک کی رضامندی شامل نہ ہو تو اس مالی معاملت پر تجارت کا اطلاق نہ ہوگا بلکہ وہ جبری مبادلہ کہلائے گا اور اسی کو قرآن نے اکلِ اموال بالباطل سے تعبیر کیا ہے۔

ناجائز طریقے سے مال کھانے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک دھوکہ اور فریب سے کسی کا مال ہڑپ کر لینا اور ظاہر ہے کہ یہ صاحب مال کی مرضی کے بغیر ہوگا۔ اگر صاحب مال کو معلوم ہو کہ اس کو دھوکا دیا جا رہا ہے تو وہ ہرگز مال کے تبادلے پر راضی نہ ہوگا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو بیع فاسد کہا جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہم آگے چل کر کریں گے۔

اکلِ اموال بالباطل کی دوسری صورت وہ ہے جس میں ایک دولت مند کسی آدمی کی محتاجی و مفلسی یا کسی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور یہ قرض یا ادھار میں ممکن ہے۔ اس صورت میں دائن (قرض دینے والا) اور مدیون (قرض لینے والا) میں جو بھی معاہدہ ہوگا اس میں لازماً مدیون کی مرضی کا کچھ دخل نہ ہوگا، اس کی حیثیت ایک مجبور فریق کی ہوگی۔ ناجائز انتفاع یا اکلِ اموال بالباطل کی یہ سب سے ظالمانہ صورت ہے۔ اور اسی کو قرآن مجید میں ربا کہا گیا ہے۔

ناجائز انتفاع کی تیسری صورت جھوٹے مقدمات ہیں۔ ایک شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ مال یا جائداد اس کی مِلک نہیں ہے محض قانونی داؤں پیچ سے اور کبھی قاضی یا حاکم کو رشوت دے کر اس پر قابض ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

---

(۱) تجارت اس مالی معاملت کو کہتے ہیں جس میں دو اشخاص اپنے اپنے مال کا مبادلہ، خواہ نقد ہو یا ادھار، باہم رضامندی سے بغرض نفع کرتے ہیں اور دونوں اشخاص اس معاملے میں بالکل آزاد ہوتے ہیں۔

Marfat.com

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O

(سورہ بقرہ۔۱۸۸)

''اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور مال کے ذریعہ حکام تک رسائی حاصل نہ کرو کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ ہڑپ کر سکو درانحالیکہ تم جانتے ہو کہ یہ حق تلفی ہے۔''

یہاں میری گفتگو اکلِ اموال بالباطل کی مذکورہ دوسری صورت یعنی ربا تک محدود رہے گی۔

ربا کا مفہوم

ربا کے لفظی معنی مطلق زیادتی کے ہیں، اور شریعت میں اس سے مراد وہ اضافہ ہے جو ایک خاص شرح کے ساتھ اصل یعنی راس المال پر لیا جاتا ہے(۱) فقہاء کی اصطلاح میں ربا اس زیادتی کو کہتے ہیں جو کسی مالی معاوضہ کے بغیر حاصل ہو (الرباھوفضل خال عن عوض) یعنی کسی قرض پر بغیر کسی مالی معاوضہ کے محض مدتِ ادائیگی بڑھا دینے کی بنا پر اضافہ کا استحقاق حاصل ہو جائے(۲)

ربا کی قسمیں

فقہاء نے ربا کی دو بنیادی قسمیں قرار دی ہیں، ربا الفضل اور ربا النسیئہ (ربا الدین)۔ ربا الفضل سے مراد وہ زیادتی اور اضافہ ہے جو ہم جنس چیزوں کے دست بدست مبادلہ کرنے سے حاصل ہو۔ مثلاً ایک کیلو جو کے بدلے میں اگر دو کیلو جو لیا جائے تو یہ فقہاء کے نزدیک ربا ہے۔ اسی طرح ایک تولہ چاندی کے عوض میں دو تولہ چاندی ربا ہے۔ فقہ حنفی میں ہم جنسیت کیل و وزن کے ساتھ مشروط ہے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

''ربا (زیادتی) ہر اس چیز میں حرام ہے جو ناپ کر یا وزن کر کے فروخت ہوتی ہے بشرطیکہ ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس سے زیادتی کے ساتھ کیا جائے۔ پس ہمارے

---

(۱) مفردات راغب، مزید دیکھیں، اقرب الموارد وغیرہ

(۲) دیکھیں الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۶ ص ۶۴۰، مزید دیکھیں بدایۃ المجتہد، ج ۶ ص ۱۰۶

Marfat.com

(علماء احناف) نزدیک حرمتِ ربا کی علت جنسیت ہے کیل و وزن کے ساتھ مشروط۔...... اور امام شافعی کے نزدیک علتِ حرمت ماکولات میں غذائیت (طعم) اور نقود میں ان کی قیمت (ثمنیت) ہے...... اور (علماء احناف کے نزدیک) جب یہ دونوں وصف یعنی جنسیت اور کیل و وزن نہ ہوں تو زیادتی (تفاضل) اور ادھار (النسیہ) دونوں جائز ہیں...... اور ایک انڈے کو دو انڈوں سے، ایک کھجور کو دو کھجوروں سے اور ایک اخروٹ کو دو اخروٹوں کے عوض میں بیچنا جائز ہے اس لیے کہ معیار (یعنی وزن و کیل) اس میں معدوم ہے ـــ امام شافعی کو اس معاملے میں علماء احناف سے اختلاف ہے کیونکہ ان اشیاء میں غذائیت ہے ـــ اور ایک پیسہ کا دو پیسوں سے تبادلہ بجنسہٖ جائز ہے...... اور گیہوں کی فروخت آٹے یا ستّو سے جائز نہیں ہے کیونکہ ان میں مجانست باقی ہے یعنی یہ دونوں چیزیں گیہوں ہی کے اجزاء ہیں اور ان کا پیمانہ ناپ ہے اور ناپ ان میں اور گیہوں میں مساوی نہیں ہوسکتی ہے کیونکہ پس جانے کی وجہ سے آٹے اور ستو کی مقدار پیمانہ میں زیادہ آجائے گی اور گیہوں دانوں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے نسبتاً کم مقدار میں آئے گا...... اور آٹے کا آٹے سے برابر مقدار میں لین دین کرنا جائز ہے...... اور گوشت کی فروخت جانور کے عوض میں جائز ہے...... اور روٹی کی فروخت گیہوں یا آٹے سے زیادتی کے ساتھ جائز ہے کیونکہ روٹی یا تو شمار کر کے بکتی ہے یا وزن کی جاتی ہے۔ جس سے وہ کیل سے خارج ہو جاتی ہے...... اور مسلم اور حربی کے درمیان ربا نہیں (ولا ربا بین المسلم والحربی)‘‘(۱)

مولانا عبدالحیؒ نے ایک استفتاء کے جواب میں لکھا ہے:

’’ربا کو حرام قرار دینے کی وجہ کیا ہے؟ جواب ہے، ناپ، تول یا اتحادِ جنس۔ اگر یہ دونوں باتیں موجود نہ ہوں تو مثلاً ایک تھان کپڑے کے عوض دو تھان کپڑا تفاضل اور نسیہ دونوں طرح سے حلال ہے۔‘‘(۲)

لیکن امام شافعی کے نزدیک قیمتی چیزوں (ثمنیت رکھنے والی) جیسے سونا، چاندی اور

---

(۱) مرغینانی، الھدایہ، کتاب البیوع، ج ۳، ص ۶۱۔۷۰

(۲) مجموعۂ فتاویٰ، مولانا عبدالحی، ج ۳، ص ۱۰۷

Marfat.com

خوردنی (طعمیت رکھنے والی) اشیاء میں زیادتی ربا ہے، یعنی علتِ حرمت غذائیت اور ثمنیت ہے۔ امام مالک کے نزدیک قیمتی مال (سونا، چاندی) اور وہ چیزیں جن کا بقائے حیات سے تعلق ہے، مثلاً نمک وغیرہ اس میں تفاضل ربا ہے۔

علتِ ربا کے تعین میں اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک امام کے نزدیک ایک چیز جو ربا کے حکم میں داخل ہے وہی چیز دوسرے امام کے نزدیک ربا سے خارج ہے۔ مثلاً امام شافعیؒ کے نزدیک لوہا اور چونا جیسی چیزوں میں تفاضل ربا نہیں ہے کیونکہ ان کا تعلق کھانے پینے کی چیزوں سے نہیں ہے جب کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان میں اضافہ ربا ہے۔ اسی طرح ایک صاع سے کم غلہ کے مبادلے میں اضافہ حنفی فقہ میں ربا نہیں ہے جب کہ امام شافعی اس کو ربا قرار دیتے ہیں۔ پھل اور کھانے کی چیزوں میں، جو کیل و وزن سے نہیں بکتیں، بڑھوتری امام ابوحنیفہ کے نزدیک ربا نہیں ہے جب کہ امام شافعی کے نزدیک وہ حکم ربا میں داخل ہے کیونکہ ان میں غذائیت (طعمیت) ہے۔

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ فقہِ حنفی میں ہم جنس ہونے کی قید میں شے ـ جید (عمدہ) اور ردی (خراب) اور کھرا اور کھوٹا ہونے کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور ان میں صرف تساوی (برابر برابر ہونا) کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی احمق ہی ہوگا جو ایک کیلو خراب کھجور کے بدلے میں ایک کیلو اچھی کھجور دے گا۔ ایسی معاملت تو آج تک دنیا میں شاید ہی کہیں واقع ہوئی ہوگی۔ کسی خراب چیز کا مبادلہ اسی جنس کی اچھی چیز سے صرف اس وقت ممکن ہے جب خراب چیز مقدار میں زیادہ دی جائے۔

اس کے علاوہ کیل و وزن کی شرط بھی قابلِ غور ہے۔ اس شرط کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اضافہ کے باوجود ان پر ربا کا اطلاق نہ ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات ایک چیز کیل یا وزن کے بغیر شمار کر کے بکتی ہے لیکن دوسرے وقت میں وہی چیز کیل یا وزن کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے۔ اس صورت میں ایک ہی چیز پر کبھی ربا کا اطلاق ہوگا اور کبھی وہ حکم ربا سے باہر ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں پھل وزن کر کے نہیں بکتے تھے لیکن آج کل اکثر پھل وزن کر کے بکتے ہیں اس لیے اس میں اضافہ ربا میں داخل ہوگا

Marfat.com

حالانکہ فقہ حنفی کی رو سے وہ ربا سے خارج ہے(۱)

حقیقت یہ ہے کہ ربا الفضل دست بدست بیع (مراطلت) کے زمرے میں آتا ہے، اور یہ ربا نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت اسامہؓ سے مروی ہے کہ: لا ربا فیما کان یداً بید ''دست بدست معاملات میں ربا نہیں ہے۔''(۲) اس معاملے میں فقہاء کو غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے بیعِ فاسد کی بعض شکلوں کو ربا سمجھ لیا اور اسی کو ربا الفضل کہا ہے۔ اس سلسلے میں جو حدیثیں مروی ہیں ان سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر میں عامل مقرر کیا تھا، وہ جنیب کھجوریں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: کیا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ عامل نے کہا: واللہ نہیں۔ ہم ان کھجوروں کی ایک صاع (معمولی) کھجوروں کے دو صاع کے عوض میں خریدتے ہیں اور اسی طرح دو صاع، تین صاع کے عوض میں۔ آپ نے فرمایا: یہ نہ کرو۔ (معمولی) کھجوروں کو سکوں کے بدلے فروخت کرو اور پھر ان سکوں سے جنیب کھجوریں خریدو۔''(۳)

اسی نوعیت کا ایک دوسرا واقعہ ہے جس کے راوی حضرت بلالؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''میرے پاس رسول اللہ ﷺ کی ایک مد(۴) کھجور تھی۔ میں نے اس سے عمدہ

---

(۱) مولانا عبدالحیؒ نے اپنے ایک فتویٰ میں لکھا ہے کہ اگر خریدار بصورت خرید نقد ایک مال کو سو روپیہ میں خریدتا ہے اور ادھار کی شکل میں ایک ماہ کی مدت کے بعد ایک سو تین روپیہ، دو ماہ کے بعد ایک سو چھ روپیہ، تین ماہ کے بعد ایک سو نو روپیہ ادا کرتا ہے تو جائز ہے اور ہر ماہ تین روپے کے اضافے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ (فتاویٰ مولانا عبدالحی، ص ۳۹۴۔۳۹۵) اسی طرح ایک تھان کپڑا دے کر اسی حیثیت کے دو تھان لینا دست بدست اور ادھار دونوں صورتوں میں جائز ہے۔ محض اس لیے کہ اتحادِ جنس کے باوجود کیل و وزن سے اس کو خریدا نہیں جاتا۔ (فتاویٰ مولانا عبدالحی، ص ۱۰۷)

دیکھا آپ نے، ایک ہم جنس شے میں زیادتی کو محض اس لیے جائز بتادیا گیا کہ وہ ہم جنس ہونے کے باوجود کیل و وزن کے بغیر فروخت کی گئی ہے۔ اسی طرح کے تماشے فقہ کی کتابوں میں کثرت سے ملیں گے۔

(۲) بخاری میں ہے: التمر بالتمر ربا الا ھاء وھا ''کھجور کے بدلے میں کھجور (لینا دینا) سود ہے مگر ہاتھ در ہاتھ'' (بخاری، کتاب البیوع، باب بیع التمر بالتمر۔ مزید دیکھیں فتح الباری، ج ۴، ص ۳۰۰)

(۳) بخاری، کتاب الوکالۃ، باب الوکالت فی الصرف والمیزان، مزید دیکھیں فتح الباری، ج ۴، ص ۳۷۹ و صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، ج ۲، ص ۱۲۱۵

(۴) وزن ہے، ایک تہائی رطل کے برابر

Marfat.com

کھجور دیکھی جو دو صاع کے بدلے ایک صاع ملتی تھی تو میں نے اس کھجور میں سے خرید لیا اور آپ کے پاس لایا۔ آپ نے پوچھا: بلال، یہ کھجور تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ میں نے کہا: دو صاع دے کر ایک صاع خریدی ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کو واپس کر دو اور ہماری کھجوریں واپس لاؤ۔'' (۱)

مذکورہ دونوں حدیثوں سے صاف ظاہر ہے کہ عہد نبوی میں ہم جنس اشیاء کے مبادلے کی ایک صورت یہ بھی تھی اور لوگ بظاہر اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن نبی ﷺ کی باریک بیں نگاہ نے دیکھ لیا کہ مبادلے کی یہ شکل خریدار کے لیے نقصان دہ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس طریقۂ بیع کو ناپسند کیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا مناسب طریقہ تجویز کیا۔ ان دونوں حدیثوں کا کوئی تعلق ربا سے نہیں ملحوظ رہے کہ ان حدیثوں میں لفظ ربا نہیں آیا ہے۔ یہ دراصل بیعِ فاسد کی ایک شکل ہے۔ لیکن بعد کے راویوں نے اس میں اپنی ذاتی رائے شامل کر کے اس کو ربا قرار دے دیا، جیسا کہ درج ذیل روایت سے بالکل ثابت ہے:

''ابو سعید خدری کہتے تھے: بلال برنی کھجوریں نبی ﷺ کے پاس لائے۔ آپ نے پوچھا: کہاں سے لائے ہو؟ انھوں نے عرض کیا: میرے پاس خراب کھجوریں تھیں۔ اس میں سے ایک صاع کے عوض میں دو صاع دے کر حضور کے کھانے کے لیے لایا ہوں۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اوہ! یہ تو عین ربا ہے (اوہ، اوہ، عین الربا) ایسا نہ کرو۔ جب تمہیں کھجور کے بدلے کھجور خریدنا ہو تو پہلے اپنی کھجوروں کو کسی دوسری چیز سے بیچو پھر اس سے کھجور خریدو۔'' (۲)

اس روایت میں ایک اضافہ اور ایک حذف ہے۔ اضافہ کا تعلق ''عین الربا'' کے الفاظ سے اور حذف کا تعلق ''دراہم'' سے ہے۔ پہلی روایت میں، جس کا تعلق خیبر کے عامل سے ہے اور جس کے راوی خود حضرت ابو سعید خدریؓ ہیں، اس طرح کی کھجوروں کو سکوں (دراہم) سے بیچنے کی ہدایت ہے۔ لیکن اس دوسری روایت میں سکوں کے بجائے ''بیع آخر''

---

(۱) سنن دارمی، ج ۲، ص ۲۵۷

(۲) صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب: اذا باع الوکیل شیئاً فاسداً فبیعہ مردود، مزید دیکھیں فتح الباری، ج ۴، ص ۳۸۶

Marfat.com

کے الفاظ ہیں جو واضح طور پر بعد کے راوی کا سہو ہے۔ عربوں میں ہم جنس یا قریب الجنس اشیاء کے مبادلے (مراطلت) کا رواج تھا جیسا کہ حضرت بلالؓ سے مروی روایت سے بالکل واضح ہے۔ نبی ﷺ نے اس طریقے کو بالکلیہ ممنوع قرار نہیں دیا بلکہ اس کی بعض فاسد شکلوں کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا۔ بعض واقعات سے اس کی تائید ہوئی ہے۔

۷ ہجری میں فتحِ خیبر کے موقع پر بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا جن میں نقرئی اور طلائی ظروف بھی شامل تھے۔ بعض صحابہ نے بے خبری میں ان طلائی ظروف کو بہت کم قیمت پر یہودیوں کے ہاتھ بیچنا شروع کیا۔ نبی ﷺ کو جب علم ہوا کہ سونے کے سامان کم قیمت چاندی کے سکوں کے عوض میں فروخت کیے جا رہے ہیں تو آپ نے صحابہ کو اس عمل سے روکا۔ حضرت فضالہ بن عبیدؓ روایت کرتے ہیں:

> ''ہم لوگ فتح خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور ہم یہودیوں کو ایک اوقیہ(۱) سونے کا سامان دو یا تین دیناروں کے عوض فروخت کرتے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا: سونے کو بعوض سونے کے برابر وزن کے ساتھ ہی بیچو''(۲)

یہ مطلق حکم نہیں ہے۔ اس کا تعلق صرف ان چیزوں کی فروخت سے ہے جن میں سونا ایک جز کے طور پر شامل ہو۔ اس ممانعت کی علت بالکل واضح ہے۔ طلائی ظروف وغیرہ کو بیچنے کی صورت میں نقصان کا احتمال ہے کیونکہ اس شکل میں سونے کا وزن معلوم کرنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ طلائی ظروف وغیرہ میں بسا اوقات نگینے وغیرہ جڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے بہتر شکل یہ ہے کہ سونے کو الگ کر لیا جائے اور اگر نگینہ ہو تو اس کو بھی جدا کر لیا جائے اور پھر ان کو الگ الگ فروخت کیا جائے۔ اس صورت میں سامان کی پوری قیمت وصول ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت فضالہ بن عبیدؓ ہی فرماتے ہیں:

> ''فتح خیبر کے دن مجھے سونے کا ایک ہار جڑاؤ ملا۔ میں اس کو بیچنا چاہتا تھا اور اس ارادے کا ذکر نبی ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا: نگینہ اور سونا دونوں کو علیحدہ کرو پھر بیچو۔(۳)

---

(۱) ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے

(۲) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، ج ۲، ص ۱۲۱۴

(۳) نسائی، کتاب البیوع، ج ۷، ص ۲۷۹

Marfat.com

جن روایتوں میں سونے کو سونے سے، چاندی کو چاندی سے، گیہوں کو گیہوں سے اور جو کو جو سے برابر برابر فروخت کرنے کا حکم آیا ہے وہ محلِ نظر ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ وہ صحابہؓ یا بعد کے راویوں کا ذاتی اجتہاد ہے جس کی بنیاد تمرِ ردی والی وہ روایت ہے جو حضرت بلالؓ سے مروی ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ وزن اور وصف میں مساوی ہم جنس اشیاء کا مبادلہ محض خیالی بات ہے۔ دنیا میں کبھی نہ اس قسم کا مبادلہ ہوا ہے اور نہ آیندہ ہوگا۔ ہم جنس اشیاء کا مبادلہ اسی وقت ممکن ہے جب وصف یا وزن کے اعتبار سے ان میں کمی وبیشی ہو۔ اور اس صورت میں، جیسا کہ ذکر ہوا، رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے کہ خراب شے کو پہلے سکہ کے عوض بیچ لیا جائے پھر اس سے اچھی چیز خریدی جائے۔

اس گفتگو سے بالکل واضح ہو گیا کہ دست بدست اشیاء کے مبادلے کا کوئی تعلق ربا سے نہیں ہے۔ اور اگر اس طرح کے معاملات میں ناپسندیدہ اضافہ ہوتا ہے تو اس پر بیع فاسد کا اطلاق ہوگا، جو شریعت میں ممنوع ہے۔ بیع سے متعلق بعض حدیثوں میں ربا کے الفاظ بے شک آئے ہیں لیکن اس کا تعلق فرمودۂ رسول سے نہیں بلکہ بعد کے راویوں کا استنباطی اضافہ ہے جو ارشادِ رسول کا صحیح منشاء نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا۔ رسول اللہ کا واضح ارشاد ہے:

لا ربا فیما کان ید بید(۱)

''دست بدست معاملات میں ربا نہیں ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ ابن عباسؓ صرف قرض میں ربا کے قائل تھے اور نقد معاملات میں ربا (اضافہ) کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ خدا نے بیع کو حلال کیا ہے، اس میں ایک درہم کو دو درہموں کے عوض دست بدست بیچنا داخل ہے۔ ''وحرم الربوا'' سے صرف وہ بڑھوتری حرام ہے جو ادھار میں ہو اور بیع کے حلال کرنے سے وہ اضافہ جو نقداً دست بدست

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، ج ۲، ص ۱۲۱۸ (حدیث نمبر ۱۰۳)، رواہ اسامہؓ

Marfat.com

ہو حرام کے زمرے میں داخل نہیں ہو سکتا ہے۔(۱)

کہا جاتا ہے کہ ابن عباسؓ نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن عکرمہ کا کوئی بیان اس رجوع کے حق میں نہیں ملتا حالانکہ وہ ان کے معتمد شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اگر ابن عباسؓ کے رجوع کو درست مان لیا جائے تو بھی اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ بیع فاسد کے اضافہ کو وہ پہلے جائز سمجھتے تھے پھر اس کو ناجائز قرار دیا لیکن یہ کہاں مذکور ہے کہ وہ اس اضافہ کو ربا مصطلحہ بھی سمجھتے تھے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ بعض احادیث میں غیر مماثل اشیاء کے تبادلے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں، جیسا کہ فقہاء کا خیال ہے، کہ اس میں ربا ہے بلکہ وہ ایک غلط طریقۂ بیع تھا جس سے معاملے کے ایک فریق کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ تھا۔ بہر حال نقد اَدست بدست مباطلہ میں اضافہ پر اصطلاحی ربا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کی بعض شکلیں بے شک بیعِ فاسد کے زمرے میں آتی ہیں، اور وہ شریعت میں ممنوع ہے۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ قرآن کی جس آیت میں ربا کو حرام کیا گیا ہے اس کا تعلق آخری زمانۂ وحی سے ہے اور روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حقیقتِ ربا کی کوئی وضاحت نہیں کی اور آپ کی وفات ہو گئی۔ اس لیے ربا کی ممانعت کا اطلاق اسی طریقۂ مبادلہ پر ہو گا جو عہد رسالت میں عربوں میں مروّج تھا اور وہ ربا النسیہ ہے۔

ربا النسیہ

فقہاء کی تشریح کے مطابق، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ربا کی دوسری قسم کا نام ربا النسیہ ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

> الربا ھو القرض علی ان یودی الیه اکثر و افضل مما اخذ(۲)

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں تفسیر کبیر (آیت تحریم)

(۲) حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۱۶۱

Marfat.com

"ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر دیا جائے کہ مدیون (قرض لینے والا) دائن (قرض دینے والا) کو اس سے زیادہ اور اس سے اچھا واپس کرے۔"

اس وضاحت سے نہ صرف یہ متعین ہو جاتا ہے کہ ربا کا تعلق دراصل قرض سے ہے بلکہ اس کی اصل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں جو ربا معروف و مشہور تھا وہ یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے کو کچھ مال ایک معیّنہ مدت کے لیے بطور قرض دیتا تھا اس شرط پر کہ مدیون ہر مہینہ ایک معیّن مقدار اس کو دے اور راس المال بدستور مدیون کے ذمہ باقی رہے۔ جب قرض کی ادائیگی کا وقت گذر جاتا تو دائن راس المال کو اس سے طلب کرتا تھا۔ اگر وہ ادائیگی پر قادر نہ ہوتا تو دائن معیاد اور راس المال دونوں کو بڑھا دیتا تھا اور حسب دستور سابق ہر مہینہ معین مقدار وصول کرتا تھا (۱)

عربوں میں ربا کی ایک دوسری صورت بھی رائج تھی۔ زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں:

"ایامِ جاہلیت میں ربا اس طور پر ہوتا تھا کہ ایک شخص کا قرض دوسرے شخص پر متعین میعاد کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب میعاد گذر جاتی تو قرض خواہ قرض دار سے کہتا کہ تم قرض ادا کرو گے یا اس میں اضافہ منظور ہے؟ اگر وہ قرض ادا کر دیتا تو معاملہ ختم ہو جاتا ورنہ دائن اپنے راس المال میں اضافہ کر دیتا اور مہلت بڑھا دیتا تھا۔" (۲)

ربا سے قرآن کی مراد

قرآن میں جس ربا (اضافہ) کو حرام کیا گیا ہے کیا اس سے وہی ربا مراد ہے جو عربوں میں معروف تھا اور جس کا اوپر ذکر ہوا یا اس کے علاوہ بھی اس کا کچھ مفہوم ہے؟ ربا (۳) کے لغوی معنی زیادتی اور اضافہ کے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر قسم کی بڑھوتری پر اس کا اطلاق نہ ہوگا ورنہ بیع و تجارت سے حاصل ہونے والا اضافہ (نفع) بھی ربا میں شمار ہوگا جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے ربا سے یقیناً ایک خاص طرح کا اضافہ مراد ہے۔

---

(۱) تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۸۵

(۲) موطا امام مالک، کتاب البیوع، باب: ماجاء فی الربا فی الدین

(۳) انگریزی میں اس کا مترادف "Usury" ہے، جس کا مطلب ہے سود کی قانونی شرح سے زائد ہونا۔

Marfat.com

یہ خاص قسم کا اضافہ وہی ہے جو عہد جاہلیت کے عربی معاشرے میں رائج تھا اور فتح مکہ سے پہلے مسلمان تاجر بھی اس طریقے پر عمل کرتے تھے۔ امام بغوی نے آیت تحریم کی تفسیر میں لکھا ہے:

''عطاء اور عکرمہ کا قول ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ یہ دونوں حضرات کھجور کی فصل تیار ہونے کے قبل پیداوار کے معاملات کرتے تھے (یعنی درہم و دینار یا کھجوریں دے کر) اور جب فصل کی تیاری کا زمانہ آجاتا تو کھجور والا کہتا کہ اگر آپ لوگوں نے اپنا پورا حق لے لیا تو اتنا کہاں بچے گا جو میرے بال بچوں کے لیے کافی ہو، اس لیے اس وقت صرف آدھی کھجوریں لے لیجیے بقیہ آدھی کو دوگنا کر کے اگلی فصل میں لے لیجئے گا۔ اس پر معاملہ طے ہو جاتا۔ اور جب مقررہ وقت آجاتا تو یہ لوگ اضافے کے طالب ہوتے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ نے منع فرمایا اور اللہ نے یہ آیت نازل کی۔''(۱)

امام رازی نے آیت تحریم کی تفسیر میں لکھا ہے:

''اس آیت کے شان نزول میں چند روایات ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ اس میں اہل مکہ مخاطب ہیں۔ وہ سودی لین دین کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب وہ مسلمان ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اپنے راس المال لے لیں اور اضافہ (ربا) نہ لیں...... تیسری روایت یہ ہے کہ آیت حضرت عباسؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ کے بارے میں نازل ہوئی کہ دونوں کھجوروں کا معاملہ بطور قرض کیا کرتے تھے۔ جس وقت فصل کی تیاری کا وقت آجاتا تھا تو کچھ لے لیتے تھے، اور بقیہ میں اضافہ کر دیتے تھے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ عطا و عکرمہ کا قول ہے۔ چوتھی روایت یہ ہے کہ حضرت عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ کے بارے میں نازل ہوئی کہ دونوں کھجوروں میں قرض کا معاملہ کرتے تھے۔''(۲)

ان تفسیری روایات سے معلوم ہوا کہ اہل عرب جس طرح کے لین دین کو ربا کہتے

(۱) معالم التنزیل، (مع تفسیر خازن)، ج۱، ص ۳۸۹

(۲) تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۸۷

Marfat.com

تھے وہ دراصل بیع سلف تھا۔ امام رازیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:
انها نزلت فی السلف "یہ آیت بیع سلف کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"(۱)

حقیقی ربا کا تحقق دو حالتوں سے مشروط ہے، ایک نوعیت معاملہ اور دوسرے اشخاصِ معاملہ۔ اگر معاملے کی نوعیت ادھار یا قرض کی ہے اور صاحب معاملہ (مدیون) محتاج و مفلس ہے تو اصل میں، خواہ وہ مقدار میں قلیل ہو یا کثیر، ہر نوع کا اضافہ حقیقی معنی میں ربا کہلائے گا، اور وہ قرآن کی نظر میں مال حرام ہے۔ قرآن مجید میں جن مقامات پر حرمت ربا کا ذکر آیا ہے ان کے سیاق و سباق سے ربا کے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

"فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِىْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝ (سورہ روم: ۳۸، ۳۹)

"پس قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی دو۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو سود تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسروں کے مال کے اندر (شامل ہو کر) بڑھ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں بڑھتا۔ اور جو زکوٰۃ تم دو گے اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھانے والے ہیں۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا

---

(۱) تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۹۴

Marfat.com

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۝ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ ۝ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝

(سورہ بقرہ۔۲۷۴۔۲۷۶)

''جو لوگ اپنے مال شب و روز، پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (روز آخرت) اس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطان نے چھو کر باولا بنادیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور سود کو حرام۔ تو جس کو اللہ کی تنبیہ پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا ہے وہ اس کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اور جو لوگ اس کے بعد بھی اس فعل کا ارتکاب کریں گے تو وہی دوزخی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا۔''

مذکورہ دونوں آیات میں ربا کا ذکر زکوۃ اور صدقہ کے بالمقابل ہوا ہے۔ اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حرمتِ ربا کی علت ظلم و زیادتی یعنی غربا کا استحصال ہے۔ عہدِ جاہلیت میں اصحابِ ثروت سماج کے غربا و مساکین کی دست گیری کے بجائے اپنے فاضل مال سے مزید مال پیدا کرنے کی فکر میں رہتے تھے اور بسا اوقات غربا سے بھی سودی معاملہ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک روایت ملاحظہ ہو:

''حضرت علیؓ نے ہم لوگوں کو خطبہ دیا کہ عنقریب لوگوں پر سخت زمانہ آنے والا ہے جب کہ دولت منداپنی مٹھی بند رکھے گا حالانکہ ان کو اس کا حکم نہیں ملا ہے۔ خدا فرماتا ہے'' آپس میں فراخدلی کو نہ بھولو'' (بقرہ، ۲۳۷)، اور مضطر (محتاج و مجبور) سے معاملت کی جائے گی حالانکہ نبی ﷺ نے بیع مضطر سے منع کیا ہے۔''(۱)

---

(۱) ابوداؤد، کتاب البیوع، حدیث نمبر ۳۳۸۲، ج ۳، ص ۲۵۵

Marfat.com

معلوم ہوا کہ جو لوگ صدقہ و زکوٰۃ کا استحقاق رکھتے ہیں ان کے قرضوں میں کسی طرح کا اضافہ جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں یہودیوں کے اکلِ اموال بالباطل کے ذکر میں فرمایا گیا ہے:

فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَثِیْرًا ۝ وَ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (سورہ نساء: ۱۶۰، ۱۶۱)

''پس ان یہودیوں کے ظلم کے سبب سے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال تھیں اور اس کے سبب بھی کہ وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اور بایں وجہ بھی کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے، اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کے سبب سے بھی۔ اور ہم نے ان کے ناشکروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

ان آیات میں یہودیوں کے جو جرائم بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک سود کھانا بھی ہے۔ وہ اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرنے کے بجائے ان سے سودی کاروبار کرتے تھے حالانکہ ان کی مذہبی کتابوں میں صاف لفظوں میں لکھا ہے:

''اگر تو محتاج شخص کو اپنی چاندی بطور قرض کے دے تو اس کے لیے اضافہ نہ لے۔''(۱)

''اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تہی دست ہو جائے اور دستگیری کے قابل ہو تو اس سے سود اور نفع نہ لے، اسے سودی قرض نہ دے۔ نہ نفع کے لیے کھانا کھلا۔''(۲)

''اور تو اپنے بھائی کو سودی روپے اور سودی طعام یا کوئی چیز عاریت اور قرض مت دے۔ تو اجنبی کو سودی قرض دے سکتا ہے پر اپنے بھائی کو سودی قرض مت دیجو تاکہ خداوند تیرا خدا اس زمین پر جس کا تو وارث ہونے جاتا ہے تجھ کو ہر اس کام

(۱) سفر خروج، ۱۰، اصحاح ۲۲، آیت ۲۵

(۲) لاویین ۱۰، اصحاح ۲۵، آیات ۳۵۔۳۷، مزید دیکھیں کتاب احبار، باب ۲۵: ۳۵-۳۸

Marfat.com

میں برکت دے جس میں تو ہاتھ ڈالے۔"(۱)

یہ ٹھیک اسی قسم کا ربا ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ میں ہوا ہے، یعنی محتاجوں اور مفلسوں کی اعانت کے بجائے ان کو سودی قرض دینا اور پھر سود کھانا۔ دونوں شریعتوں میں اس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

کیا غنی کے قرض میں اضافہ جائز ہے؟

غربا اور مساکین کے قرض میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اضافہ (ربا) تو حرام ہے لیکن کیا مستطیع اشخاص (غنی) سے، جو اپنی مختلف خانگی ضرورتوں، مثلاً تعمیر مکان وغیرہ یا تجارتی اغراض کے لیے قرض لیتے ہیں، اضافی مال لینا ناجائز ہے اور وہ حکم ربا میں داخل ہے؟ بہت سے علماء کا خیال ہے کہ اس صورت پر بھی حکم ربا کا اطلاق ہوگا۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> "اس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانہ نزول قرآن سے پہلے جو سود رائج تھا، یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے ربا قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھہرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانے میں رواج ہے تو ان کا نہ اس زمانے میں دستور تھا، نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔ ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اسی آیت (سورہ بقرہ۔۲۸۰) کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرض دار تنگ دست (ذوعسرۃ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرۃ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مالدار لوگ بھی ہوتے تھے۔"(۲)

"وان کان ذوعسرۃ" کی مذکورہ تاویل محلِ نظر ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں مدیون دو طرح کے تھے۔ ایک وہ لوگ جن کا تعلق سماج کے متوسط طبقہ سے تھا۔

---

(۱) تثنیہ ۱۰، صحاح ۲۳، آیات ۱۹، ۲۰

(۲) تدبر قرآن، ج ۱، ص ۶۳۹ (سورہ بقرہ، آیت ۲۸۰)

Marfat.com

ان کے بارے میں حکم ہوا کہ دائن ان سے اپنا راس المال واپس لے لے اور سود چھوڑ دے۔ دوسرے وہ مدیون تھے جن کا تعلق سماج کے غریب طبقہ سے تھا۔ ان کے متعلق حکم ہوا کہ ان کو راس المال کی واپسی کے لیے مہلت دی جائے۔ چونکہ یہ لوگ زیادہ غریب اور مفلوک الحال تھے اس لیے دائن کو ترغیب دی گئی کہ اگر وہ ان کے حق میں راس المال سے بھی دست بردار ہو جائے تو اس کے لیے موجبِ اجر ہوگا۔

اس سلسلے میں صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ غنی کے قرضوں پر، خواہ وہ تجارتی ہو یا غیر تجارتی، ایک معقول اضافی رقم لینا عقل اور نقل دونوں کے لحاظ سے بالکل جائز ہے۔ معلوم ہے کہ سودی قرضوں میں اضافی رقم کا تعین مدیون کی مرضی کے بغیر ہوتا ہے اور تحریمِ ربا کی یہ ایک بڑی علت ہے۔ اگر راس المال میں ایک معقول اضافہ مدیون کی مرضی اور خوشی سے ہو تو اس پر ربا کا اطلاق نہ ہوگا۔ ملحوظ رہے کہ دائن مال دے کر اپنا حقِ انتفاع مدیون کو منتقل کر دیتا ہے اس لیے تقاضائے انصاف ہے کہ وہ اس حقِ انتفاع کے عوض میں ایک معقول اضافی رقم دائن کو اس وقت دے جب وہ قرض کی رقم واپس کرے۔ اس اضافی رقم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ پہلے سے طے ہو۔ اور اگر مدیون کی مرضی سے کسی جبر کے بغیر یہ پہلے سے طے کر لی گئی ہو تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن اوّل الذکر صورت راجح ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اَحۡسَنُکُمۡ اَحۡسَنُ قَضَاءً " (۱)

''تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرض کی ادائیگی میں بہتر ہو۔''

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے ایک دو سالہ اونٹ قرض لیا اور ویسا ہی ایک اونٹ واپس دیا، اور اس کے اوپر سے ایک اونٹ اور دیا اور فرمایا کہ تم میں سے اچھا وہ ہے جو بہتر طور پر قرض ادا کرے۔'' (۲) صحابہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل پیرا تھے۔ مجاہدؒ روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص سے کچھ دراہم

---

(۱) ابوداؤد، کتاب البیوع، (حدیث نمبر ۳۳۴۶)، ج ۳، ص ۲۵۵

(۲) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب: من استلف شیئا فقضی خیرا منہ (حدیث نمبر ۱۲۱) ج ۲، ص ۱۲۲۵

Marfat.com

قرض لیے۔ جب واپس کیا تو اس سے عمدہ دراہم واپس کیے۔ اس نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! یہ میرے درہموں سے اچھے ہیں۔ عبداللہ بن عمر نے کہا: میں بھی جانتا ہوں لیکن میرا دل اس سے خوش ہے (قد علمت ولكن نفسي بذلك طيبة)(۱)

اس مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیں۔ موجودہ معاشی دور میں جس طرح مہنگائی روز افزوں ہے اور سکوں بالخصوص ہندی سکّے کی قوت خرید جس تیزی سے گرتی جاتی ہے اس کے پیش نظر دائن کو مالی نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے جب کہ بوقت واپسی مدیون اس کو کوئی اضافی رقم نہ دے۔ مثال کے طور پر زید نے احمد کو آج ایک لاکھ روپے دیے اور احمد نے دو چار سال کے بعد کسی اضافے کے بغیر اصل رقم واپس کردی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے زید کو باعتبار مالیت ایک لاکھ کے بجائے پچاسی ہزار ہی واپس کیے۔ کون عقلمند اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مال سے انتفاع کا حق چھوڑے اور پھر راس المال میں کمی بھی برداشت کرے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کل بہت سے دولت مند مسلمان ضرورت مند مسلمانوں کو قرض کی بڑی رقم دینے سے احتراز کرتے ہیں اور کوئی بہانہ کردیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ مستطیع اشخاص کے قرضوں میں ایک معقول اضافہ کو جائز تسلیم کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں تجارت کو فروغ ہو اور ان کی دوسری سماجی ضرورتیں پوری ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرض کو، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، تحریری شکل دی جائے اور تمام ضروری امور لکھ لیے جائیں تاکہ قرض کی واپسی کے وقت دائن اور مدیون کے درمیان کوئی نزاع واقع نہ ہو جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰىٓ اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ...... وَلَا تَسْـَٔمُوْآ اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰىٓ اَجَلِهٖ ، ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰىٓ اَلَّا تَرْتَابُوْآ O (سورہ بقرہ۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳)

---

(۱) موطا امام مالک، کتاب البیوع، باب: مایجوز من السلف (حدیث نمبر ۱۳۷۳) ص ۴۷۴

Marfat.com

''اے ایمان والو! جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو......اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو۔ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔''

بینک سود اور بیمہ سود کی حقیقت

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ربا کا تعلق قرضوں کی اس اضافی رقم سے ہے جو مدیون کی مرضی کے بغیر اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لی جاتی ہے۔ قرآن نے اسی نوع کی اضافی رقم کو حرام قرار دیا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ بینک وغیرہ سے جمع مال کی صورت میں جو اضافی رقم ملتی ہے یا بینک سے قرض لینے پر جو اضافی رقم اس کو دی جاتی ہے اس پر قرآنی ربا کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟

آج کل ساری تجارتی سرگرمیوں کا محور و مرکز بینکنگ نظام ہے۔ بینکوں کے مالی تعاون (قرض) کے بغیر کوئی شخص کاروبار نہیں کرسکتا ہے۔ تاجر لوگ جہاں تجارتی قرضے لیتے ہیں وہاں وہ اپنے راس المال کا ایک بڑا حصہ بینکوں میں رکھتے ہیں اور حسب ضرورت اس کو نکالتے اور پھر جمع کرتے ہیں۔ اوّل الذکر صورت میں وہ بینک کو سود دیتے ہیں اور مؤخر الذکر صورت میں اس سے تھوڑا بہت سود لیتے بھی ہیں۔ بہت سے لوگ غیر تجارتی ضرورتوں کے لیے بینکوں سے قرض لیتے ہیں، مثلاً تعمیر مکان یا موٹر گاڑی وغیرہ خریدنے کے لیے۔ اس صورت میں بھی بینک کو سود دینا پڑتا ہے۔ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کی ستم رانی سے بچنے کے لیے بھی لوگ ان مقاصد کے لیے بینک سے قرض لیتے ہیں، بہت سے ملازمت پیشہ، اور غیر ملازمت پیشہ لوگ بھی اپنی پس انداز کی ہوئی رقم کو بینکوں میں فکسڈ ڈیپازٹ کی شکل میں رکھتے ہیں۔ اس سے تھوڑا بہت نفع ان کو مل جاتا ہے جس سے ان کی بہت سے ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ کیا ان تمام صورتوں میں بینک سے جو اضافی رقم ملتی ہے یا اضافی رقم اس کو دینی پڑتی ہے وہ شریعت کے حکم ربا میں داخل ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء اس کو

Marfat.com

جائز اور بعض ناجائز بتاتے ہیں (۱) جواز کے قائل علماء میں مولانا سید احمد علی سعید، جو دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم رہ چکے ہیں، قابل ذکر ہیں۔ ایک استفتاء کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

''اسی طرح بینک میں جو رقم جمع کی جائے اور اس پر بنک اپنی طرف سے جو زائد رقم دے، امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے مسلک کی رو سے وہ سود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ بینک کو رقم قرض نہیں دی جاتی کہ ''کل قرض جر نفعا فهو ربا'' کے تحت اس کو داخل کیا جائے۔ اور یہ بھی عام طور پر معلوم ہے کہ بینک تجارت کرتا ہے تو جو رقم کسی نے اس میں داخل کی تو اس کو اپنی رقم کے تناسب کے اعتبار سے تجارت میں شریک مانا جائے اور صورت مضاربت کی بن جائے، اس زائد رقم کو سود کہہ کر اقتصادیات اور معاشرہ کو نقصان پہنچانا مذہب کے بھی خلاف ہے اور عقل و سیاست کے فقدان کی دلیل بھی۔ شامی میں ہے کہ: ان البیوع الفاسدة لیست کلها من الربٰو (ج ۴، ص ۲۴۵) ''ہر بیع فاسد میں ربا و سود نہیں ہوتا'' البتہ یہ حکم وہاں جاری ہوگا جس ملک میں اقتدار اعلیٰ مسلمان کا نہ ہو، اور اس ملک پر جہاں حدود و تعزیرات کا نفاذ نہ ہو اور مسلم حکومت ہو دار الحرب کا اطلاق درست نہ ہوگا، نہ ہی مذکورہ احکامات جائز قرار دیے جاسکیں گے...... شدید ضرورت میں خواہ تجارت کے لیے ہو یا کسی اور ضروری مقصد کے لیے ہو، فقہاء کے ضابطے ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے تحت لون (قرض) کے لینے کی گنجائش ہے جب کہ کہیں سے غیر سودی رقم نہ مل سکے۔ (۲)

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''جو زائد رقم کمپنیاں اپنے قواعد و ضوابط کے تحت رضامندی سے دیتی ہیں خواہ وہ اس کو سود کہیں حقیقت میں سود نہیں، نام سے حقیقت نہیں بدلا کرتی۔ سود نام رکھ دینے سے مال مباح یا مباح رقم سود نہیں بن جائے گی۔'' (۳)

---

(۱) یہ علماء کہتے ہیں کہ مجبوری کی وجہ سے بینک سے سودی قرض تو لیا جاسکتا ہے لیکن بینک میں جمع شدہ رقم پر جو اضافہ ملتا ہے وہ سود ہے اور حرام ہے۔ اس کو لے کر بیت الخلا وغیرہ تعمیر کر دیا جائے، اس کو ذاتی استعمال میں نہ لایا جائے۔ علماء کا یہ نقطۂ نظر متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔

(۲) رسالہ ترجمان دار العلوم جدید دہلی، نمبر ۲۰، ۲۱ (۲: ۸-۹) جنوری۔ فروری ۱۹۶۵ء ص ۲۰ - ۳۲

(۳) ایضاً

Marfat.com

مولانا بینک کے سود کی طرح انشورنش کمپنی کے ذریعہ دیے گئے زائد مال کو بھی سود نہیں کہتے اور اس کو جائز بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''امام صاحب اور امام محمد رحمہما اللہ تعالی کے مسلک کی رو سے یہ ماننا صحیح ہوگا کہ بینک سے جو زائد رقم ملتی ہے یا بیمہ کمپنی سے ملے وہ سود نہیں ہے، نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدلے گی۔''(۱)

مولانا نے آخر میں افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ مسلمانوں کو یہ تو بتایا جاتا ہے کہ اسلام میں سود لینا اور دینا حرام ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ کہاں اور کس صورت میں حرام ہے؟ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''مسلمانوں کو یہ تعلیم دینی ضروری تھی کہ سود کا لینا دینا حرام ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کو یہ بتلایا جاتا کہ جہاں تم رہتے ہو وہاں غیر مسلم کو ایک روپیہ دے کر دو روپے لوگے تو جو زائد ایک روپیہ لیا ہے وہ سود ہی نہیں ہے۔ لیکن اس کی عدم وضاحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس (غیر مسلم) سے منافع نہ لے سکا اور سود دے کر اپنی جائداد، مکانوں، زمینوں اور باغات کو سود در سود کی بھینٹ چڑھاتا رہا۔''(۲)

دارالحرب کی شرط

یہاں قارئین یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ جواز سود کی مذکورہ بحث کا مدار اس بات پر ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ لیکن کیا فی الواقع ہندوستان دارالحرب ہے؟ ماضی میں یہ مسئلہ اس وقت اٹھا جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اس وقت کے حالات میں اس کو دارالحرب قرار دیا تھا۔ لکھتے ہیں:

''اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں بلکہ نصاری کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے...... اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ اور عیدین اور اذان اور گاؤکشی وغیرہ سے یہ لوگ تعرض نہیں کرتے ہیں تو بھلے نہ

---

(۱) رسالہ ترجمان دارالعلوم جدید دہلی نمبر ۲۰،۲۱ (۲:۸_۹) جنوری_فروری ۱۹۶۵

(۲) ایضاً

Marfat.com

کریں۔ ان احکام کی اصل الاصول ان کے نزدیک بالکل ہیچ ہیں۔ انگریزوں سے پناہ لیے بغیر اگر کوئی شخص دلی یا اس کے گرد و نواح کی کسی مسجد میں داخل ہونا چاہے تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان لوگوں کی اجازت کے بغیر اس شہر میں نہیں آسکتے ہیں...... غرضیکہ حدیثوں اور صحابہ کرام اور خلفائے عظام کی سیرت پر متجسس نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ شہر دارالحرب کا حکم رکھتا ہے۔(۱)

مولانا عبدالحئی، جو سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں شامل تھے، فرماتے ہیں:

''عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحق ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدوں کے صوبے تک) سب کے سب دار الحرب ہیں کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے۔ اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دارالحرب ہے۔''(۲)

بعد کے اکثر علماء نے اسی مسلک کی پیروی کی ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں کلام ہے جیسا کہ گذشتہ روایاتِ منقولہ سے تم کو معلوم ہوا ہوگا۔ اگر چہ اس ہیچ مداں کے نزدیک راجح یہی ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔''(۳)

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی ایک فتویٰ میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے(۴) مولانا حسین احمد مدنی اور شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کشمیری کا بھی یہی خیال تھا۔ اوّل الذکر لکھتے ہیں:

''ہند دارالحرب ہے۔ وہ اس وقت تک دارالحرب باقی رہے گا جب تک اس میں

---

(۱) فتاویٰ عزیزیہ، ص ۱۶ (مطبع مجتبائی)

(۲) نقش حیات، ص ۴ (بر حاشیہ)

(۳) قاسم العلوم، ج ۱، ص ۳۵ (مکتوب ہشتم)

(۴) فتاویٰ رشیدیہ، ص ۴۳۰

Marfat.com

کفر کو غلبہ حاصل رہے گا۔ دارالحرب کی جس قدر تعریفیں کی گئیں ہیں اور جو شروط بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔(۱)

موٴخر الذکر یعنی مولانا انور شاہ کشمیری کا فتویٰ ملاحظہ ہو:

''ہندوستان پر کفر کا تسلط اس درجہ پر ہے کہ اس سے زیادہ کسی وقت میں بھی کسی دارالحرب میں نہیں تھا۔ مسلمان جو مراسم اسلام پر عمل کرتے ہیں ان کی اجازت سے کرتے ہیں اور مسلمانوں سے زیادہ عاجز یہاں کوئی دوسری قوم نہیں ہے۔(۲)

بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ ہندوستان دارالحرب کے بجائے دارالاسلام ہے۔ مولانا ابوالحسنات عبدالحئ فرنگی محلی لکھنوی نے ایک استفتاء کے جواب میں لکھا ہے:

''دارالاسلام کے دارالحرب ہونے میں یہ شرط ہے کہ احکام کفر علانیہ جاری ہوں اور احکام اسلام بالکلیہ موقوف کردیے جائیں، اور شعائرِ اسلام اور ضروریاتِ دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں اور یہ شرط متفق علیہ ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں عائد کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس بلدہ میں اور دارالحرب میں کوئی بلدہ مملکت اہل اسلام کا باقی نہ رہے، دوسرے یہ کہ امان اول اٹھ جائے اور بامانِ کفار اقامت کی نوبت آگئی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ بلادِ ہندوستان میں یہ مفقود ہے۔ اس لیے کہ شعائر اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت اور ممانعت نہیں ہے اگرچہ اکثر قضاۃ کفار ہیں اور خلاف اسلام احکام جاری کرتے ہیں۔ مگر بہت سے امور میں مذہب اسلام و شرع کے موافق بھی فیصلہ کرتے ہیں۔ پس ہندوستان امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے نزدیک دارالحرب

(۱) فیصلۃ الاعلام فی دارالحرب و دارالاسلام، اردو ترجمہ ''کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟ دو فتوے ان کی طرف اور بھی منسوب ہیں۔ ایک میں سکوت ظاہر کیا گیا ہے اور دوسرے میں ہندوستان کو دارالامن کہا گیا ہے۔ دیکھیں فیصلۃ الاعلام، ص ۱۶

(۲) ترجمان دارالعلوم جدید دہلی نمبر ۲۰۔۲۱ جنوری و فروری ۱۹۶۵ء ص ۳۲

Marfat.com

نہیں ہے۔''(۱)

مولانا کرامت علی جونپوری نے بھی نفی دار الحرب کا فتویٰ دیا ہے:

''وہابی لوگ بطمعِ دنیاوی اس ملک کو دار الحرب کہتے ہیں... یہ ملک بلاشبہ دار الاسلام ہے۔''۔(۲)

ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے معاملے میں علماء ہند کے ان اختلافات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں وقت اور حالات کا بڑا دخل ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ انگریزوں نے مسلم ہندوستان پر بزورِ شمشیر قبضہ کیا تھا اور اس کے بعد جس طرح قابض قومیں مفتوحین کے ساتھ سلوک کرتی ہیں تقریباً وہی سلوک انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا اور جبر و تعدی کے متعدد واقعات پیش آئے۔ان حالات میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے جو فتویٰ دیا وہ صحیح تھا۔لیکن بعد کے علماء نے محض انگریز دشمنی کی وجہ سے اس فتویٰ کی پیروی کی حالانکہ حالات میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔یہی وجہ ہے کہ جو علماء انگریز دشمنی میں مبتلا نہ تھے انھوں نے تبدیلی حالات کی وجہ سے ہندوستان کو دار الحرب قرار نہیں دیا بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کو دار الاسلام قرار دیا۔(۳)

لیکن آج صحیح معنی میں دنیا میں کہیں دار الاسلام نہیں ہے کیونکہ کسی ملک میں اسلام کے احکام بالکلیہ نافذ نہیں ہیں، اس بنا پر دار الحرب کا وجود بھی باقی نہیں رہا۔صاحبین نے دار الحرب کی تعریف میں لکھا ہے کہ جس میں احکام اسلام جاری نہ ہوں(ان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام) ۔معلوم ہوا کہ دار الحرب کی اصطلاح دار الاسلام کی ضد ہے۔اس تعریف کے مطابق جس طرح ہندوستان دار الحرب قرار پاتا ہے اسی طرح بنگلہ دیش، پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک پر بھی اس کا اطلاق ہوگا کیوں کہ ان ممالک میں بھی اسلام کے اکثر قوانین نافذ نہیں ہیں۔ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری لکھتے ہیں:

---

(۱) مجموعۃ الفتاویٰ (اردو ترجمہ)، ج۱،ص ۱۲۳-۱۲۶(قیومی کانپور)

(۲) اطمینان القلوب،ص۲۰(طبع تاریخ ندارد)،مزید دیکھیں،ہندوستانی مسلمان،ص۵

(۳) صحیح بات یہ ہے کہ انگریزوں کے عہد میں ہندوستان دار الاسلام کے بجائے دار الامن تھا اور یہی صورت آزاد ہندوستان میں بھی برقرار ہے۔(مصنف)

Marfat.com

" قسم الاسلام الارض الى قسمين ، دار الاسلام ، وهى الديار التى تسودها شريعة الاسلام و تقام فيها حدوده، وان كان جل أهلهامن غير المسلمين، الثانى دار الحرب، وهى الارض التى تسودها فيها شرائع غير شريعة اللّٰه وإن كان جل اهلها من المسلمين۔ والواقع أنه ليس فى الدنيا اليوم أرض فيها الاسلام الا القليل۔(۱)

''اسلام نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک دارالاسلام جس میں اسلامی شریعت کو غلبہ حاصل ہو اور اس کے قوانین جاری ہوں اگرچہ غیر مسلموں کی اکثریت ہو۔ دوسری قسم دارالحرب ہے اور اس سے مراد وہ ملک ہے جس میں خدائی شریعت کے برخلاف شریعت غالب ہو اگرچہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ فی الواقع اس وقت دنیا میں کہیں بھی اسلام پورے طور پر موجود نہیں ہے۔''

اس افسوسناک صورت حال کے پیش نظر بعض علماء نے دارالحرب کی تعریف میں تبدیلی کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاں مسلمانوں کو غلبہ و تسلّط حاصل نہ ہو وہ دارالحرب ہے۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں۔

باید دانست کہ مدار بودن بلدہ یا ملکے دارالاسلام یا دارالحرب بر غلبۂ مسلمان و کفار است(۲)

''معلوم ہونا چاہئے کہ کسی شہر یا ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار صرف مسلمانوں اور کافروں کے غلبہ پر ہے۔''

اس تعریف کی رو سے ہندوستان بدستور دارالحرب قرار پائے گا اور یہاں سودی لین دین جائز ہوگا۔ لیکن جو علماء ہندوستان کو دارالاسلام کہتے ہیں ان کے مسلک کے لحاظ سے یہاں سودی لین دین ناجائز ہوگا۔ جن علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر سودی لین

---

(۱) حاضر العالم الاسلامی وقضایاہ المعاصرۃ، ج ا ص ۱۳

(۲) ترجمان دارالعلوم جدید، دہلی، جنوری، فروری ۱۹۶۵ء ص ۳۲

Marfat.com

دین کو جائز بتایا ہے انھوں نے صورت معاملہ کو پوری طرح پیش نہیں کیا ہے۔ حقیقی معنی میں جس قسم کے دار الحرب میں سودی لین دین جائز ہے اس کا تعلق دار الاسلام کے مسلمان تاجروں سے ہے۔ اگر دار الاسلام کا کوئی مسلمان تاجر کسی دار الحرب میں وہاں کی حکومت کی امان لے کر بغرض تجارت جاتا ہے تو از روئے فقہ اسلامی اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر مسلموں سے ان کی مرضی سے سود لے بلکہ ناجائز ذرائع (۱) مثلاً قمار اور شراب سے بھی کسب مال کرے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ وہ سودی رقم کو دار الحرب کے بجائے دار الاسلام میں استعمال کرے۔ اس اجازت کا تعلق دار الحرب کے ان مسلمانوں سے نہیں ہے جو وہاں مستقل سکونت رکھتے ہوں۔

بینک انٹرسٹ کا جائزہ غیر حربی زاویہ نگاہ سے

اکثر علماء نے، جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا، سود کے جواز اور عدمِ جواز کا فیصلہ ہندوستان کے دار الحرب اور دار الاسلام ہونے کی بنیاد پر کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ موجودہ دور کے حالات میں دار الحرب اور دار الاسلام جیسی فقہی اصطلاحیں حد درجہ مغالطہ انگیز ہیں اس لیے ان سے اجتناب ضروری ہے۔

سود کا معاملہ حقیقی اسلامی ریاست کے معاشی نظام سے جڑا ہوا ہے۔ اس سے الگ کر کے اس کے جواز اور عدمِ جواز کا فتویٰ دینا بالکل غلط ہوگا۔ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ جب تک مدینہ کی اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی بہت سے اصحابِ رسول سودی کاروبار کرتے تھے، حتیٰ کہ مدنی ریاست کے قیام کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس کا سلسلہ قائم رہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات کے بالکل آخری ایام میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی حرمت کا اعلان کیا۔

کیا اس طرزِ عمل سے واضح نہیں ہو جاتا کہ اگر حقیقی اسلامی ریاست موجود نہیں ہے تو پھر مسئلہ سود کا جائزہ اس دور کے معاشی حالات کی روشنی میں لینا ہوگا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ غرباو

---

(۱) راقم کے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اسلام میں مال کی طہارت کے ساتھ کسب مال کے ذرائع کی پاکی بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ دار الحرب اور دار الاسلام دونوں میں یکساں طور پر مطلوب ہے۔

Marfat.com

مساکین سے سودی معاملہ ہر حال میں ممنوع ہے۔لیکن غنی سے لین دین میں، چاہے وہ کوئی فرد ہو یا کوئی تجارتی ادارہ (مثلاً بینک وغیرہ)، باہم رضامندی سے ایک معقول اضافی رقم لینا یا دینا بالکل جائز ہے۔

غور سے دیکھیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بینک میں جو رقم فریقین کی باہم رضامندی سے جمع کی جاتی ہے اس کو بینک کے اربابِ معاملہ تجارت وغیرہ میں لگاتے ہیں اور اس سے ان کو جو نفع حاصل ہوتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ وہ اصل رقم کے ساتھ فریق ثانی کو واپس کرتے ہیں۔ اس صورت پر ربا کا اطلاق نہیں ہوگا خواہ اس کا نام کچھ بھی رکھا جائے۔ یاد رکھیں، تحریم ربا کی ایک بڑی علت ظلم واستحصال ہے(۱) اور یہاں یہ علت موجود نہیں ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جمع کنندہ کا نفع پہلے سے متعین ہے اس لیے اضافی رقم سود ہے(۲) یہ خیال کم نظری کا پیدا کردہ ہے۔ نفع اس لیے متعین ہے کہ ہر جمع کنندہ کو بینک کے کاروبار میں شریک کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ اس کو بینک جو اضافی رقم دیتا ہے وہ نفعِ قلیل ہے اور چونکہ وہ نقصان میں شریک نہیں ہوتا اس لیے نفعِ قلیل پر راضی ہو جاتا ہے گویہ یہ نقصان میں عدم شرکت کا بدل ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ موجودہ حالات میں مال کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کو بینکوں میں رکھا جائے۔ لیکن ایک خطرہ یہاں بھی ہے اور وہ سکے کی قیمت میں گراوٹ ہے۔ ہندوستانی سکے کی قدر و قیمت میں گراوٹ کے موجودہ رجحان سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کے علاوہ مہنگائی روز افزوں ہے۔ ان حالات میں اگر بینک میں جمع شدہ رقم کو جوں کا توں لیا جائے تو اس میں جمع کنندہ کا خسارہ ہے۔ اس مالی خسارے سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ بینک کی اضافی رقم کو لیا جائے۔ یہ اضافہ حق انتفاع سے دست برداری اور سکے کی قیمت میں گراوٹ کا بدل ہوگا۔ بینکوں میں اضافی رقم کو سود سمجھ کر چھوڑنا بدترین حماقت ہے جس میں آج کل بہت سے نادان مسلمان علماء کی غلط

---

(۱) ملاحظہ ہو یہ آیت: وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم ط لا تظلمون ولا تظلمون (سورہ بقرہ:۲۷۹)

(۲) یہ اصول فقہاء کا وضع کردہ ہے، کسی نص صریح یا سنت ثابتہ سے ثابت نہیں ہے۔ (مصنف)

Marfat.com

رہنمائی کی وجہ سے مبتلا ہیں۔اس سفیہانہ طرزِ عمل سے مسلم قوم کو بھاری اقتصادی خسارہ پہنچ رہا ہے۔

جہاں تک بغرضِ تجارت یا تعمیر مکان یا کسی اور بڑی ضرورت کے لیے بینکوں سے قرض لینے کی صورت میں اضافی رقم دینے کا تعلق ہے اس کو بھی ربا نہیں کہیں گے کیوں کہ موجودہ حالات میں جو دراصل حالتِ اضطرار ہے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔کون نہیں جانتا کہ آج دنیا کے بیشتر ملکوں میں جن میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں، سرمائے کے حصول کے لیے غیر سودی مالیاتی ادارے موجود نہیں ہیں۔کثیر سرمائے کی فراہمی کا اب ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ بینک ہیں جو سودی لین دین کے نظام پر قائم ہیں اور اضافی رقم (سود) دیے بغیر ان بینکوں سے کوئی رقم لینا ممکن نہیں ہے۔

منافقانہ طرزِ عمل

دیگر معاملات زندگی کی طرح سود کے بارے میں بھی اکثر مسلمان تضادِ قول وفعل میں مبتلا ہیں۔انجمنوں اور اداروں کے لوگ، جن میں مذہبی اشخاص اور ادارے بھی شامل ہیں، بڑی رقوم (لاکھوں اور کروڑوں) کو بینکوں میں فکسڈ ڈیپازٹ کی شکل میں رکھتے ہیں اور اس سے حاصل شدہ اضافی رقم کو پردہ داری کے ساتھ ذاتی اور جماعتی کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ یہ سود ہے لیکن حبِ مال یا ذاتی اور جماعتی ضرورتیں انھیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ اس سود کو پوشیدہ طور پر کھائیں۔اس منافقت میں قوم کا سوادِ اعظم مبتلا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ جس مال کو وہ سود سمجھ کر کھاتے ہیں وہ دراصل سود نہیں ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی طبقہ سود کے معاملے میں بظاہر جس قدر حساس واقع ہوا ہے اس قدر وہ اکلِ اموال بالباطل کے دوسرے طریقوں (جھوٹے مقدمات، تعویز و گنڈے وغیرہ) سے خائف نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ غیبت سے بچیں کہ وہ مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے برابر ہے لیکن اس شدید تنبیہ کے باوجود یہ ہر محفل کا پسندیدہ موضوع ہے حتیٰ کہ علماء کی مجلسیں بھی اس برائی سے محفوظ نہیں ہیں۔اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ میں سود کی برائی کو کم کر رہا ہوں۔ربا غریبوں کا

Marfat.com

خون چوسنے کے مترادف ہے تو اس کو معمولی درجہ کی برائی کون سمجھے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

"الربوٰ سبعون حوباً ایسرھا ان ینکح الرجل امه" (۱)

''سود اس قدر بڑا گناہ ہے کہ اگر اس کے ستر حصے کیے جائیں تو سب سے ہلکا حصہ اس بات کے برابر ہوگا کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔''

اگر آپ عہد نبوی کے مکی اور مدنی سماج کا جائزہ لیں، جس میں عربی مہاجنوں کا طبقہ (۲) سماج کے غریب طبقہ کا دردناک معاشی استحصال کر رہا تھا، تو مذکورہ روایت کا صحیح مفہوم آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ اور یہ بات بھی اچھی طرح جان لیں گے کہ سود کھانے کو قرآن میں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے مترادف کیوں کہا گیا ہے (سورہ بقرہ۔ ۲۷۹) اس تاریخی تناظر میں مسئلہ ربا کو نہ دیکھنے کی وجہ سے ہم مسلمان غلط تعبیر وتشریح کا شکار ہوئے اور اس وقت اس کے تلخ معاشی نتائج سے دوچار ہیں۔

اقتصادی استحکام سے امت مسلمہ کی غفلت

مسلمانوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اور خود ان کی جو اخلاقی، علمی اور اجتماعی حالت ہے اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں کہ مستقبل قریب میں ان کو سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی توجہ قوم کی علمی، اخلاقی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے پر مرکوز کریں، جدید کاروباری طریقے سیکھیں، خود اپنے بینک قائم کریں تاکہ مسلمان تاجروں کو بآسانی تجارتی قرضے حاصل ہو سکیں۔ قوم کی اقتصادی حالت کے مضبوط ہونے سے مسلمانوں کا سیاسی وزن بڑھے گا اور وہ ہندوستان میں ایک معزز قوم بن کر زندہ رہ سکیں گے۔

تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ جس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی

---

(۱) ابن ماجہ (حدیث نمبر ۲۳۰۴)

(۲) اس طبقے میں عربوں کے ساتھ یہود مدینہ بھی شامل تھے اور ان کی معاشی قوت سودی کاروبار پر مبنی تھی اور اس کا شکار زیادہ تر انہی عرب تھے۔

Marfat.com

حکومت قائم تھی تو اہل ہنود بلاشبہ سیاسی اعتبار سے مغلوب تھے، لیکن اقتصادی اعتبار سے وہ بہر طور طاقتور تھے۔ ان کی یہی اقتصادی مضبوطی تھی جس کی وجہ سے وہ جدید علوم وفنون کے میدان میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے اور جوں ہی ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اس کی زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ بیرون ہند اس کی مثال یہودی قوم ہے جو اسرائیل کے سوا ہر جگہ عددی اعتبار سے اقلیت میں ہے لیکن اقتصادی قوت کی وجہ سے امریکہ اور یورپ کے بعض ملکوں کے سیاسی نظام میں دخیل ہے۔ اس سلسلے میں جاپانی قوم بھی قابل ذکر ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں شکست کے بعد اس کا سیاسی وزن بالکل گھٹ گیا لیکن اس نے اقتصادی میدان میں تیزی سے ترقی کر کے دوبارہ اپنے کھوئے ہوئے قومی وقار کو حاصل کر لیا۔ آج ساری دنیا، جس میں ترقی یافتہ ممالک بھی شامل ہیں، اس کی اقتصادی قوت کا لوہا مانتی ہے اور اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان میں دیگر اسباب کے علاوہ سود کے بارے میں علماء کی غلط رہنمائی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسلامی احکام کی تعبیر و تنفیذ میں احوال وظروف کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو علماء بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرزِ فکر کو بدلنا ہوگا۔ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ سود کی علی الاطلاق حرمت اسلامی ریاست کے قیام سے مشروط ہے۔ بدقسمتی سے آج دنیا میں کہیں بھی حقیقی معنی میں اسلامی ریاست موجود نہیں ہے اس لیے سود کی موجودہ مروّجہ صورتوں پر قرآنی ربا کا اطلاق کرنا صحیح نہ ہوگا۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بات فراموش نہ ہو کہ غربا و مساکین سے ہر طرح کا سودی معاملہ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، ناجائز ہوگا۔ اہل ثروت مسلمانوں کی دینی اخوت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کی خبر گیری سے کسی حال میں غافل نہ ہوں۔

Marfat.com

باب چہارم

صوم (روزہ)

Marfat.com

Marfat.com

روزہ اور مذاہبِ عالم

دنیا کی مذہبی تاریخ بتاتی ہے کہ جس طرح خدا کی پرستش ہر دور میں کی گئی ہے خواہ اس کی شکل وصورت کچھ بھی رہی ہو اسی طرح روزہ بھی ایک قدیم مذہبی عبادت ہے اور اس کو ایک عالم گیر حیثیت حاصل رہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

> Fasting is an almost Universal Phenamenon within both Eastern and Western Culture. (1)
>
> ''روزہ بڑی حد تک ایک آفاقی عمل ہے جو مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں میں شامل ہے۔''

چنانچہ بابلی اور آشوری تہذیبوں میں، جو دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں کہلاتی ہیں، روزہ کا رواج تھا، قدیم مصری تہذیب میں بھی روزے رکھے جاتے تھے، رومیوں کے یہاں بھی اس کا چلن تھا، قدیم یونانی بھی روزہ کی افادیت کے قائل تھے۔ فیثا غورس جو ایک مشہور یونانی فلسفی تھا، یونان کے باشندوں کو روزہ رکھنے کی تلقین کرتا تھا۔ (۲) مشرق بعید کے ملکوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ چین کے قدیم مذاہب (تاؤازم اور کنفیوشیزم) اور ہندوستان کے

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن (۱۹۸۷ء)، ج ۵، ص ۲۸۶ (Fasting)

(۲) فیثا غورث نہ صرف روزہ کے مذہبی عمل کو بہ نظرِ تحسین دیکھتا تھا بلکہ خود بھی مسلسل چالیس دن کا روزہ رکھتا تھا۔ اس کے پیرؤوں کا یہ خیال تھا کہ انسانیت گناہوں سے آلودہ ہونے کی وجہ سے مقامِ تقدس سے، جس پر وہ پہلے فائز تھی، نیچے گر گئی اور اس کی پرہیزگاری جاتی رہی۔ اس کا مداوا روزہ اور دوسری عابدانہ ریاضتیں ہیں جن کے ذریعہ نہ صرف اس کا کھویا ہوا تقدس واپس ہوگا بلکہ عالم بالا کے پوشیدہ حقائق کا ادراک اور غیبی خدائی قوتوں سے ربط وتعلق بھی اسی ذریعہ سے حاصل ہوگا دیکھیں انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن: فاسٹنگ)

Marfat.com

ہندو، جینی اور بدھ مذہبوں کے مذہبی نظام میں بھی روزہ شامل تھا(۱)

یہاں عصر حاضر کے چندے بڑے مذاہب کے روزوں کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے تا کہ یہ بات معلوم ہو کہ اسلام اور دوسرے مذاہب کے روزوں میں کیا فرق واختلاف ہے۔

ہندو مذہب میں نہ صرف روزہ (برت) ہے بلکہ اس کے نظام عبادت میں اس کو اہم مقام حاصل ہے(۲) اس برت کا تعلق زیادہ تر مذہبی طبقہ سے ہے گو کہ ہندو عوام کو بھی برت رکھنے کی اجازت ہے۔ برہمن ہر ہندی مہینے کی گیارہ اور بارہ تاریخوں میں اکاوشی کا برت رکھتے ہیں اور اس کو فرض جانتے ہیں۔ بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں دوشنبہ کو پابندی سے روزہ رکھتے ہیں۔ ویدوں کی تلاوت کے اختتام پر بھی روزہ رکھا جاتا ہے۔

چونکہ ہندو اجرامِ سماویہ کی پوجا کرتے ہیں اور زمین پر پیش آنے والے حادثات اور واقعات کو ان کی گردش کا نتیجہ سمجھتے ہیں اس لیے ان کے بعض روزوں کا تعلق فلکی اجرام کے مظاہر سے ہے۔ چنانچہ ویدوں میں لکھا ہے کہ ہر مرد اور اس کی بیوی نئے اور پورے چاند کے دنوں میں روزہ رکھیں۔ (۳) اسی طرح گھر اور خاندان کے بزرگوں، مثلاً باپ، بڑا گرو اور نیک بیوی کی وفات پر بھی چوبیس گھنٹے کا روزہ رکھنے کا حکم ہے۔(۴)

گناہوں کے کفارہ کے طور پر بھی روزے رکھے جاتے ہیں۔ ویدوں میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شودر کسی گائے کو جو دودھ دیتی ہو یا جوان بیل کو کسی وجہ کے بغیر مار ڈالے یا کسی کو بے وجہ گالی دے تو اس پر بطور کفارہ سات دن کا روزہ رکھنا لازم ہے۔(۵) عجیب بات ہے کہ اگر یہی کام کوئی برہمن کرے تو اس کے لیے کفارے کا برت نہیں ہے۔

اسی طرح اگر میزبان کو کھانے کے دوران میں احساس ہو جائے کہ اس نے

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا، برٹانیکا (۱۹۶۳) ج ۹، ص ۱۰۶: فاسٹنگ

(۲) دیکھیں: A Hand Book on living Religions by John R Hinnells: (Hinduism)

(۳) Sacred Books of the East, Vol.2, P.100

(۴) ایضاً، ج ۲، ص ۱۳۷

(۵) ایضاً، ج ۲، ص ۸۴

Marfat.com

اپنے مہمان کا ٹھیک ڈھنگ سے سواگت نہیں کیا ہے تو وہ فوراً ہی کھانا چھوڑ دے اور برت رکھے۔(۱) گرو کے ساتھ بے ادبی کرنے کی سزا یہ بیان کی گئی ہے کہ بے ادب اس وقت تک کھانا پینا چھوڑ دے جب تک کہ گرو اس کو معاف نہ کر دے۔(۲) بدشگونی کے اثراتِ بد سے بچنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ برت رکھا جائے۔ چنانچہ وید میں لکھا ہے:

''اگر گرو اور چھاتر کے بیچ سے کتا، نیولا، سانپ، بلی یا مینڈک گذر جائے تو ان کے لیے تین دن کا برت رکھنا ضروری ہے۔''(۳)

زیادہ تر برہمن اور کٹر ہندو چوبیس گھنٹے کا برت رکھتے ہیں لیکن ہندو جوگی اس معاملے میں زیادہ شدت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور چالیس چالیس دن تک کچھ کھائے پیے بغیر رہتے ہیں (۴) عام ہندو صرف بارہ گھنٹے کا برت رکھتے ہیں اور اس میں اناج کے علاوہ ہر چیز کے کھانے پینے کی اجازت ہے۔ لیکن اکثر ہندو برت کے دوران نمک آمیز پانی یا پھلوں کا عرق استعمال کرتے ہیں۔

عام ہندوؤں میں برت کا مقصد نفس کشی کے بجائے محض دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ویکنتا اکادشی کے تہوار کے موقع پر جو برت رکھا جاتا ہے اور جس میں تمام فرقوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں وہ وشنو دیوتا کی طرف منسوب ہے۔ مذہبی تہواروں اور تیرتھ استھانوں کی زیارت کے موقع پر بھی بہت سے ہندو تیاری کے طور پر برت رکھتے ہیں (۵) منت اور شکرانے کے روزوں کا بھی ان میں رواج ہے۔

بدھ مذہب میں بھی روزہ ہے۔ بدھا نے اس سلسلے میں اعتدال کی تعلیم دی ہے لیکن

---

(۱) Sacred Books of the East, vol.2, p.121

(۲) ایضاً، ص ۱۳۰

(۳) ایضاً، ص ۱۸۴

(۴) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج ۹، ص ۱۰۶

(۵) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن، ج ۵، ص ۲۸۷

Marfat.com

ان کے پیروؤں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ بہت سے بدھ بھکشو اور نن معمولاً دن میں صرف ایک بار دوپہر کے وقت کھانا کھاتے ہیں۔ شروع میں دو ہی روزے تھے، ایک چاند کے طلوع کے وقت اور دوسرا اس کے مکمل ہونے پر، اور ان دو روزوں کا رکھنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ تعداد چار ہوگئی ہے جو اعتراف گناہ کے طور پر ہر ماہ رکھے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بدھ بھکشو بدھا کے یوم وفات پر بھی روزہ رکھتے ہیں، جو پانچ دن پہلے سے شروع ہوتا ہے۔ عوام ان دنوں میں گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ بدھ بھکشو برت رکھنے والوں کو بتاتے ہیں کہ برت کا مقصد نفس کو پاک کرنا ہے۔ اگر برت رکھ کر بھی کسی کا نفس بے قابو ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پاکی حاصل نہیں ہوئی۔ (۱)

ہندومت کی طرح جینی مذہب میں زیادہ تر برت مختلف تہواروں اور مقدس مذہبی مقامات کی زیارت کے موقع پر رکھے جاتے ہیں، بانیِ مذہب مہاویر کے یوم پیدائش پر بھی برت رکھا جاتا ہے اور گناہوں سے توبہ کی جاتی ہے۔ (۲) ہندو جوگیوں کی طرح جینی سنیاسی بھی برت کے دوران پُرمشقت ریاضتیں کرتے ہیں۔ ان کا برت عام طور پر ہفتہ دو ہفتہ کا ہوتا ہے لیکن کبھی یہ مدت چالیس دن بھی ہوتی ہے۔ (۳)

پارسی مذہب، جس کے بانی زرتشت ہیں، دنیا کا واحد مذہب ہے جس میں برت رکھنا ضروری نہیں ہے اور اس کو اچھا خیال نہیں کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ظاہرداری ہے اور جسم کے ساتھ ناانصافی بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ برت کا مقصد یہی تو ہے کہ اعضاء و جوارح، مثلاً زبان، آنکھ، کان، دل اور ہاتھ، سے کوئی گناہ صادر نہ ہو، اور ہمارے ہاں گناہ نہ کرنا ہی روزہ ہے۔ (۴)

یہودیوں کی شریعت میں صرف ایک دن کا روزہ فرض تھا جس کو یم کپور

---

(۱) دیکھیں انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس: فاسٹنگ

(۲) The Religions of India, by David Moss & John B Noss, P.120

(۳) انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، ج۹، ص۱۰۶: فاسٹنگ

(۴) دیکھیں، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس: فاسٹنگ

Marfat.com

(Yam Kippur) کہتے ہیں، یعنی کفارے کے دن کا روزہ۔(۱) تورات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چالیس دن تک بھوکے پیاسے رہے(۲) اور چالیسویں دن ان کو تورات کے احکامِ عشرہ (دس احکام) عطا ہوئے، اس لیے اس دن روزہ رکھنا ہر یہودی پر فرض ہے۔ یہ دن ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے۔(۳) اسی لیے اس کو عاشورہ (دسواں) کہتے ہیں۔ کفّارہ کے روزے کا ذکر کتاب احبار میں کئی مقامات پر ہوا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

''اور یہ تمہارے لیے ایک دائمی قانون ہے کہ ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو اپنی جان کو دکھ دینا اور اس دن خواہ کوئی پردیسی ہو یا دیسی جو تمہارے درمیان بود و باش رکھتا ہو کسی طرح کا کوئی کام نہ کرے کیونکہ اس روز تمہارے واسطے تم کو پاک کرنے کے لیے کفارہ دیا جائے گا۔ سو تم اپنے سب گناہوں سے خداوند کے حضور پاک ٹھہرو گے۔''(۴)

دوسری جگہ ہے۔

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اسی ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو کفارہ کا دن ہے۔ اسی روز تمہارا مقدس مجمع ہو اور تم اپنی جانوں کو دکھ دینا اور خداوند کے حضور آتشیں قربانی گذارنا۔ تم اس دن کسی طرح کا کام نہ کرنا کیونکہ وہ کفارہ کا دن ہے جس میں خداوند تمہارے خدا کے حضور تمہارے لیے کفارہ دیا جائے گا۔(۵)

کفارہ کے روزہ سے مقصود تزکیۂ نفس تھا، جیسا کہ اوپر کے اقتباسات سے بالکل

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج۹، ص۱۰۶: فاسٹنگ

(۲) خروج، باب ۳۴: ۲۸

(۳) آغاز اسلام میں جب ابھی رمضان کے روزے فرض نہیں ہوئے تھے تو مسلمان بھی نبی ﷺ کی پیروی میں عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ عہد جاہلیت میں قریش مکہ بھی عاشورہ یعنی محرم کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے کیونکہ اس دن خانۂ کعبہ پر نیا غلاف چڑھایا جاتا تھا (دیکھیں، مسند ابن حنبل، ج۶، ص۲۴۴)

(۴) احبار، باب ۱۶: ۲۹، ۳۰

(۵) ایضاً، باب ۲۳: ۲۶، ۲۷، ۲۸

Marfat.com

واضح ہے۔ حضرت یسعیاہ فرماتے ہیں۔

''کیا وہ روزہ جو میں (خداوند) چاہتا ہوں یہ نہیں کہ ظلم کی زنجیریں توڑی جائیں اور جوئے کے بندھن کھولے جائیں اور مظلوموں کو آزاد کریں، بلکہ ایک ایک جوئے کو توڑ ڈالیں، کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے، اور جب کسی ننگا کو دیکھے تو اسے پہنائے اور تو اپنے ہم جنس سے روپوشی نہ کرے۔ تب میری روشنی صبح کی مانند پھوٹے گی۔ اور تیری صحت کو ترقی جلد ہو جائے گی۔ تیری صداقت تیرا ہراول ہوگی اور خداوند کا جلال تیرا چنڈاول ہوگا۔ تب تو پکارے گا اور خداوند جواب دے گا، تو چلائے گا اور وہ جواب دے گا، میں یہاں ہوں، اگر تو انگشت نمائی اور ہرزہ سرائی سے تائب ہو جائے اور اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ دل کو آسودہ کرے تو تیرا نور تاریکی میں چمکے گا اور تیری رات دوپہر کی مانند ہوگی۔'' (۱)

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں:

''پس اب تم اس طرح کا روزہ نہیں رکھتے ہو کہ تمہاری آواز عالم بالا پر سنی جائے۔ کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن کہ اس میں آدمی اپنی جان کو دکھ دے اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے۔ کیا تو اس کو روزہ اور ایسا دن کہے گا کہ جو خداوند کو مقبول ہو۔'' (۲)

اس اقتباس میں ''جان کو دکھ دینے'' کا مطلب نفس کی اصلاح و تربیت، اور ''سر کو جھاؤ کی طرح جھکانے اور نیچے ٹاٹ بچھانے'' کا مفہوم غرور و تکبر سے اجتناب اور عاجزی و خاکساری کا اظہار ہے۔ لیکن یہودیوں نے روزہ کے ان مقاصد کو بالکل فراموش کر دیا تھا جیسا کہ مذکورہ اقتباسات سے واضح ہے۔ ان کا سارا زور غم کے ان روزوں پر تھا جو انھوں نے ایجاد کر لیے تھے۔ یہ روزے ہیکل کے انہدام و احراق اور بابل کی اسیری کے ایام کی یاد میں یہودی کلینڈر کے چوتھے (ماہ مئی) پانچویں (ماہ جون) اور دسویں مہینے (ماہ نومبر) میں رکھے

---

(۱) یسعیاہ، باب ۵۸: ۶۔۱۱

(۲) یسعیاہ، باب ۵۸: ۵

Marfat.com

جاتے تھے۔(۱) یہودی ان روزوں کے دوران میں غم والم کے اظہار کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتے تھے۔ کچھ نہیں تو صورت ہی غمگین بنالیتے تھے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو غم کے یہ اختراعی روزے یہودیوں میں مروج ومقبول تھے۔آپ نے اپنے پیروؤں کو ان مبتدعانہ روزوں کے رکھنے سے منع کردیا۔ چنانچہ فریسیوں (یہودی فقہاء) نے شکایت کی کہ ان کے شاگرد (غم کے) روزے نہیں رکھتے۔آپ نے فرمایا:

''کیا براتی جب تک دولھا ان کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں۔ جب تک دولھا ان کے ساتھ ہے روزہ نہیں رکھ سکتے۔ پر وہ دن آئیں گے جب دولھا ان سے جدا کیا جائے گا تب وہ ان ہی دنوں میں روزہ رکھیں گے۔''(۲)

اس تمثیل میں دولھا سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور براتی سے مراد ان کے حواری ہیں، یعنی اگر روزہ کا مقصد محض اظہار غم ہے تو حواری یہ روزہ اس لیے نہیں رکھ سکتے کہ ابھی پیغمبران کے درمیان میں موجود ہے۔ جب پیغمبران میں نہیں رہے گا تو وہ اظہار غم میں نفلی روزہ رکھیں گے۔ بہر حال معلوم ہوا کہ یہودی ایک طرف کفارہ کے روزہ کی حقیقت وغایت فراموش کر چکے تھے تو دوسری طرف انھوں نے غم کے روزوں کی اہمیت بہت بڑھادی تھی اور محض رنج وغم کے اظہار کو روزے کا مقصد سمجھ لیا تھا۔

یہودی مذہب کی طرح عیسائی مذہب میں بھی روزے فرض تھے۔ اناجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود بھی روزے رکھے(۳) اور اپنے پیروؤں کو بھی روزہ رکھنے کی ہدایت کی(۴) البتہ یہ نصیحت فرمائی کہ روزے کی حالت میں یہودیوں کی طرح نمود ونمائش سے مکمل طور پر پرہیز کیا جائے۔انجیل متی میں ہے:

''پھر جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج۹ (۱۹۶۳ء) ص ۱۰۶

(۲) مرقس، باب۲: ۱۹

(۳) لوقا، باب۴: ۲

(۴) مرقس، باب۲: ۲۰، ۲۱ مزید دیکھیں متی باب۹: ۱۵

Marfat.com

اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ تا کہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھ کو آشکار بدلہ دے۔"(۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے مصنوعی یعنی غم کے روزوں کو منسوخ کر دیا لیکن فرض روزے کو باقی رکھا تھا۔ آگے چل کر ان کے پیروؤں نے اس سنت سے انحراف کیا۔ ایک طرف عیسائی درویشوں نے روزے میں غلو اور تشدد یعنی نفس کشی کی راہ اختیار کی اور دوسری طرف ان کے علماء نے شریعت موسوی کے روزے یک قلم ترک کر دیے اور نئے روزے گھڑ لیے، جن میں سے بعض کا تعلق موسموں سے ہے(۲)

ابتدا میں اختراعی روزوں کے احکام وضوابط متعین نہیں تھے، کلیسا نے ان کو متعین کیا۔ شروع میں ایسٹر (Easter) کا روزہ چالیس گھنٹوں کا تھا۔ عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتنے ہی گھنٹے اپنی قبر میں رہے اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔

دوسری صدی عیسوی کے بعد بعض عیسائی ملکوں میں ہفتہ میں بدھ اور جمعہ کے دن روزہ رکھا جاتا تھا۔ بعد میں تمام عیسائی ملکوں میں اسی دستور پر عمل ہونے لگا۔ آگے چل کر سنیچر کے دن کا روزہ بھی اس فہرست میں شامل کر لیا گیا جس کی پابندی ہر عیسائی کے لیے ضروری تھی۔ نفلی روزے ان کے علاوہ تھے(۳)

مشرقی چرچوں نے روزنے کے اس مغربی دستور کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ ان کے دستور کے مطابق سنیچر اور اتوار کے دن روزہ رکھنا ممنوع تھا لیکن بدھ اور جمعہ کے روزوں کو باقی رکھا گیا۔ اس کے علاوہ چالیس دن کا روزہ بھی ہے جو پندرہ نومبر سے شروع ہو کر کرسمس تک رہتا ہے، اور اس کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش (Nativity of Lord) سے ہے(۴)

---

(۱) متی باب ۶:۱۶-۱۸

(۲) دیکھیں، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن (۱۹۸۷ء) ج۵، ص ۲۸۸

(۳) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج۹، ص ۱۰۷

(۴) ایضاً

Marfat.com

ریفارمیشن کے بعد چرچ آف انگلینڈ نے اپنی کتاب عبادت میں روزوں کے دن متعین کر دیے اور ان کی اہمیت بھی واضح کر دی لیکن لازمی قرار نہیں دیا بلکہ ہر شخص کے ضمیر اور اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ کتنے روزے رکھے(۱)

دیگر مذاہب کی طرح، جن کا اس سے پہلے ذکر ہوا، اسلام میں بھی روزہ اس کے مذہبی نظام کا لازمی جز ہے، فرمایا گیا:

یا ایھا الذین امنو کتب علیکم الصیام کم کتب علی الذین من قبلکم ط (سورہ بقرہ، ۱۸۳)

''اے ایمان والو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض تھا۔''

لیکن اسلام اور دوسرے مذاہب کے روزوں میں ایک بیّن فرق یہ ہے کہ اس میں روزہ ایک یا چند دنوں کے لیے نہیں، اور نہ ہی سال کے متفرق دنوں میں ہے بلکہ اس کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا ہے یعنی رمضان کا مہینہ۔ فرمایا گیا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ط

(سورہ بقرہ۔۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کی ہدایت کے لیے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے کھلے دلائل اور واضح علامات کے ساتھ، پس تم میں سے جو شخص اس مہینے میں موجود ہو اس کے لیے اس میں روزہ رکھنا ضروری ہے۔''

چنانچہ اسلام کی طویل تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں گذرا جب روزے کے ایام میں کوئی ردو بدل واقع ہوا ہو، جیسا کہ اہل کتاب اور دیگر مذاہب کے روزوں میں برابر تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ آج بھی سارے عالم میں ماہ رمضان میں پابندی کے ساتھ روزے رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح تقریباً دو ہزار سال پہلے خدا اور اس کے رسول نے روزے کے جو قواعد و ضوابط مقرر کر دیے تھے آج بھی ہر مسلمان، خواہ شہری ہو یا دیہاتی، خواندہ ہو یا ناخواندہ، مشرق کا رہنے

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج ۹ ص ۱۰۷

Marfat.com

والا ہو یا مغرب کا، ان پر عمل پیرا ہے اور اس باب میں کبھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔

اسلامی روزے کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کسی طرح کی افراط و تفریط نہیں ہے۔ اس میں نہ عیسائیوں کی نفس کشی ہے اور نہ ہی ہندوؤں کی سہل انگاری کہ برت کے دوران میں پانی اور پھلوں کا رس پیا جاتا ہے۔ اسلامی روزہ میں پورے ایک ماہ تک دن بھر کے لیے اکل و شرب ممنوع ہوتا ہے لیکن اس کا مقصد تربیت و اصلاح ہے کہ انسان اپنی خواہشاتِ نفس پر قابو یافتہ ہو جائے۔ خواہشاتِ نفس کو فنا کرنا غایتِ روزہ نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔

دیکھیں کہ خدا نے حکم دیا کہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ہر طرح کا کھانا پینا ممنوع ہے تو نفس کی شدید خواہش کے باوجود ایک روزہ دار کھانا تو کجا پانی کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہیں لے جاتا ہے۔ اور غروب آفتاب کے بعد اس کا حکم ہے کہ اب کھاؤ پیو تو وہ فوراً ہی اس حکم کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس تعمیلِ حکم کا نام، جس میں دل کی کامل رضامندی شامل ہو، تقویٰ ہے اور یہی غایتِ روزہ ہے۔ (سورہ بقرہ-۱۸۳)

تقویٰ کی اس اہمیت کے باوجود اسلامی روزہ میں کوئی بے جا سختی نہیں رکھی گئی ہے۔ اس میں مریض اور مسافر اور دوسرے معذورین کے لیے رعایت ہے۔ مریض اور مسافر بعد کے دنوں میں روزہ رکھ سکتے ہیں (بقرہ-۱۸۳) اور عدم قدرت کی صورت میں فدیہ (ایک مسکین کو کھانا کھلانا) کی اجازت ہے (بقرہ-۱۸۳)، حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) کو بھی رخصت ہے، وہ روزے چھوڑ سکتی ہیں (۱)، بوڑھے لوگ بھی فدیہ کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ روزہ دار کو صرف دن میں کھانے پینے اور جنسی مقاربت سے پرہیز کرنا ہے، شب میں اکل و شرب حتیٰ کہ بیوی سے ہم بستری کی بھی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ روزہ کی حالت میں اگر کسی نے بھول چوک سے کچھ کھا پی لیا تو وہ معاف ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ (۲)

اس گفتگو سے واضح ہو گیا کہ اسلامی روزہ دوسرے مذاہب کے روزوں سے مختلف ہے، جیسا کہ اگلے صفحات سے قارئین کو زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہو گا۔

---

(۱) ترمذی، عن انس بن مالکؓ

(۲) ایضاً عن ابی ہریرۃؓ

Marfat.com

صوم (روزہ)

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی طرح، جن کا تفصیلی ذکر گذشتہ دو ابواب میں ہو چکا ہے، اسلام میں صوم کو تزکیۂ نفس کے پہلو سے بڑی اہمیت حاصل ہے جیسا کہ اگلے صفحات میں اس کے تفصیلی بیان سے معلوم ہوگا۔

لغوی معنی

صوم کے لغوی معنی کسی فعل سے رک جانے یا اس کو ترک کرنے کے ہیں، خواہ اس فعل کا تعلق کھانے سے ہو، گفتگو سے ہو، یا چلنے سے ہو۔ چنانچہ اس گھوڑے کو جو بھوکا ہو، یعنی چارہ کھانے سے رک گیا ہو، صائم کہتے ہیں۔ نابغہ کا شعر ہے:

خیل صائم و خیل غیر صائمة
تحت العجاج و اخری تعلك اللجما (۱)

''بہت سے بھوکے اور بہت سے آسودہ گھوڑے میدان جنگ کے غبار میں کھڑے تھے اور دوسرے بہت سے اپنی لگام چبا رہے تھے۔''

مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب ''اصول الشرائع'' میں صوم کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اہل عرب اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لیے باقاعدہ ان کی تربیت کرتے تھے تاکہ مشکل اوقات میں وہ زیادہ سے زیادہ سختی

---

(۱) لسان العرب، مزید دیکھیں، المفردات للراغب، ص ۲۹۱، تفسیر طبری، ج ۲، ص ۱۲۸، تفسیر قرطبی، ج ۲ ص ۲۵۳

Marfat.com

برداشت کرسکیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھوڑوں کو تند ہوا کے مقابلے کی تربیت دیتے تھے۔ یہ چیز سفر اور جنگ کے حالات میں جب کہ ہوا کے تھپیڑوں سے سابقہ پیش آئے، بڑی کام آنے والی چیز ہے......... جریر نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

ظللنا بمستن الحرور کاننا

لدی فرس مستقبل الریح صائم

''ہم لوکے تھپیڑوں کی جگہ جمے رہے گویا ہم ایک ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہیں جو بادِ تند کا مقابلہ کر رہا ہو اور روزہ رکھے ہوئے ہو۔''

اس شعر میں اس نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کے حال کی تشبیہ ایک ایسے شخص سے دی ہے جو اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہو اور اس کو بھوک اور بادِ تند کے مقابلے کی تربیت دے رہا ہو۔''(۱)

صوم کا اصطلاحی مفہوم ہے، صبح سے شام تک کھانے پینے اور جنسی مقاربت سے پرہیز کرنا، اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ شرع کی زبان میں صائم یعنی روزہ دار ہے۔

ماہِ صیام کی فضیلت

اسلام سے پہلے بھی رمضان کا مہینہ تھا لیکن عربوں کے نزدیک اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ اسلام آیا تو اس مہینے کی قسمت جاگ اٹھی اور وہ تمام مہینوں کا سرتاج بن گیا۔ اسی مہینے میں مسلمانوں پر روزہ فرض ہوا، اور اب روزہ اور رمضان ہم معنی ہو گئے ہیں۔ ماہ رمضان کا نام آتے ہی روزہ یاد آجاتا ہے۔

اس ماہِ مبارک میں روزہ کے اجتماعی عمل کی وجہ سے خدا پرستی کا ایک ایسا ماحول بن جاتا ہے جو دوسرے مہینوں اور دنوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ذکر و عبادت کی کثرت، مرغوباتِ نفس سے بے اعتنائی، تلاوتِ قرآن، اور غربا و مساکین کے ساتھ ہمدردی و غم خواری جیسے نیک اعمال اس مہینے میں بکثرت انجام پاتے ہیں۔ اسی لیے حدیثوں میں اس مہینے کی

---

(۱) تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، ج ۱، ص ۴۴۵

Marfat.com

فضیلت اور اس کی برکتوں کا ذکر کثرت سے آیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

''جب رمضان آتا ہے تو جنّت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور شیاطین کو مقید کردیا جاتا ہے۔''(۱)

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''ایک منادی کرنے والا آواز دیتا ہے کہ اے خیر کے چاہنے والے آگے بڑھ، اور اے برائی کا قصد کرنے والے باز آ، اور ہر رات اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے۔''(۲)

عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار رمضان کا مہینہ آیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''رمضان کا مہینہ تمہارے لیے برکت لایا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو برکتوں سے ڈھانک دے گا، اپنی رحمت نازل کرے گا، گناہوں کو ساقط کرے گا اور دعاؤں کو قبول کرے گا۔ اللہ تعالیٰ رمضان میں تمہاری مقابلہ آرائی دیکھتا ہے اور اپنے فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی طرف سے خیر و برکت دکھاؤ۔ بدبخت ہے وہ شخص جو اس مہینہ میں اللہ کی رحمت سے محروم رہے (یعنی روزہ نہ رکھے۔'')(۳)

یہی وجہ ہے کہ اس مہینے کا ایک ایک عمل دوسرے مہینوں کے اعمال سے کہیں زیادہ خدا کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس مہینہ میں جس شخص نے اچھے خصائل میں سے کسی ایک اچھی خصلت سے بھی خدا کا تقرب حاصل کیا تو اس کا ثواب اس شخص کے برابر ہے جس نے رمضان کے علاوہ مہینوں میں کوئی فرض ادا کیا۔ اسی طرح جو شخص اس مہینے میں کوئی فرض ادا کرے گا تو وہ اس آدمی کی مانند ہوگا جو دوسرے مہینوں میں ستر فرض ادا

---

(۱) صحیحین، مؤطا

(۲) ترمذی، نسائی، حاکم

(۳) رواہ الطبرانی

Marfat.com

کرے الخ''(۱)

رسول اللہ سے دریافت کیا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے تو آپ نے فرمایا، رمضان کا صدقہ (قال: صدقۃ فی رمضان)، حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ سب سے زیادہ سخی تھے لیکن رمضان کے مہینے میں آپ کی سخاوت کہیں زیادہ بڑھ جاتی تھی اور آپ کثرت سے صدقہ کرتے تھے۔(۲)

اس مہینے میں عمرہ حج کے برابر ہے۔ایک عورت جس کا نام اُمِّ سنان تھا وہ حج کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں جاسکی تھی۔آپ نے اس سے پوچھا: ''ہمارے ساتھ حج کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟ اس نے کہا: ہمارے پاس صرف دو پانی لادنے والے اونٹ تھے۔میرے لڑکے کے باپ اور بیٹے نے ایک اونٹ پر حج کیا اور دوسرا اونٹ ہمارے لیے چھوڑ دیا جس پر ہم پانی لادتے تھے۔آپ نے فرمایا کہ جب رمضان آئے تو عمرہ کر لینا کیونکہ رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔''(۳)

ماہ رمضان کی فضیلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اسی مہینے میں قرآن مجید نازل ہوا۔(سورہ بقرہ-۱۵۸) یہ کتاب ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جو ہر پہلو سے کامل اور برحق ہے۔اپنے برحق ہونے کے لیے وہ کسی خارجی دلیل وثبوت کا محتاج نہیں، اپنی صداقت کا خود آپ ثبوت ہے۔آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔جو شخص بھی اس کو طلب ہدایت کے لیے پڑھے گا وہ تسلیم کرے گا کہ خدا کی اس زمین پر اس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہیں جو اس سے زیادہ معتبر ہو، جس میں کسی طرح کی لفظی ومعنوی آمیزش نہ ہوئی ہو، اور جو ہر نوع کی افراط وتفریط سے پاک ہو۔ایک روشن شاہراہ، ایک سیدھا راستہ جس پر چل کر طالبِ حق بآسانی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔یہ کتاب صاف لفظوں میں بتاتی ہے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔

یہ کتابِ مبین اور فرقان ہے۔یہاں باطل کے لیے کوئی جگہ نہیں، اس میں حق کے

(۱) بیہقی، فی شعب الایمان، رواہ سلمان فارسیؓ

(۲) متفق علیہ

(۳) صحیح مسلم، رواہ ابن عباسؓ

Marfat.com

سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ایسی حق نما کتاب کا نزول یقیناً ایک عظیم نعمت اور ایک لازوال خزانہ ہے۔ اس لیے ہر صاحب ایمان پر لازمی ہے کہ وہ اس مہینے میں خدائے بزرگ و برتر کی بڑائی بیان کرے اور اس کا شکر بجالائے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلِتُكَبِّرُو اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

(سورہ بقرہ۔۱۸۵)

''اور اللہ نے جو ہدایت تمہیں بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی بیان کرو، اور تا کہ تم اس کے شکر گذار بنو۔''

خدائے قدوس کی بڑائی اور شکر کا مفہوم یہاں یہ ہے کہ ماہ رمضان میں کثرت سے ذکرِ خدا اور تلاوتِ قرآن کا اہتمام کیا جائے، اور جو حکم و ہدایت اس میں مرقوم ہے اس کے مطابق حتی الوسع عمل کیا جائے۔

صوم کی اہمیت

ہر مذہب میں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، روزہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کے نظام عبادت میں بھی اس کو ایک اہم حیثیت دی گئی ہے۔ یہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ نبی علیہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا۔''(۱)

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ط (سورہ بقرہ، ۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض تھا۔''

---

(۱) بخاری و مسلم، روادہ ابن عمرؓ

Marfat.com

تزکیہ نفس کے اعتبار سے روزہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تقریباً تمام انبیاء کرام نے تفویضِ نبوت سے پہلے روزے رکھے ہیں۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کو طور پر احکامِ عشرہ ملنے سے پہلے بھوکے پیاسے رہے۔(۱) عیسیٰ علیہ السلام نے بیابان میں روزے رکھے۔(۲) نبی ﷺ نے بھی آغازِ نبوت سے پہلے غارِ حرا میں خدا کی عبادت کی اور روزے رکھے۔ تمام صلحاء و اتقیاء کا معمول رہا ہے کہ انھوں نے کثرت سے روزے رکھے اور ان کے ذریعہ اپنے قلوب کو مجلّیٰ بنایا۔

متعدد احادیث میں روزے کی غیر معمولی اہمیت اور فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اللہ فرماتا ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو مجھے مشک کی بو سے زیادہ پسند ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی خواہشوں اور کھانے پینے کو صرف میرے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ پس روزہ میرے واسطے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ ہر نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملے گا بجز روزہ کے کہ وہ میرے واسطے ہے اور اس کا بدلہ میں ہی دوں گا۔''(۳)

ہر عبادت کا اجر متعیّن ہے لیکن روزے کا اجر غیر معیّن ہے یعنی بے حساب و بے اندازہ، اس لیے کہ روزہ دار کا شمار صابرین میں ہوتا ہے اور ان کے متعلق فرمایا گیا ہے: اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (سورہ زمر۔۱۰) ''بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''

جنت کا ایک دروازہ صرف روزہ داروں کے لیے مخصوص ہوگا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام ریان ہے۔ اس سے روزہ دار کے سوا کوئی دوسرا داخل نہ ہوگا، اور وہ اپنے روزہ کے بدلے میں اپنے رب کی ملاقات کا شرف حاصل

---

(۱) خروج، باب ۳۴:۲۸

(۲) متی، باب ۴:۲

(۳) بخاری و مسلم، رواہ ابو ہریرہؓ

Marfat.com

کرے گا۔(۱)

یہ مقام و مرتبہ ایک مومن کو اس لیے حاصل ہو گا کہ وہ روزے کے ذریعہ پاک و صاف ہو چکا ہو گا۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے رمضان کے روزے ایمان و احتساب کے ساتھ رکھے خدا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دے گا۔'' (۲) یہی مضمون ایک دوسری حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے حدود کو ملحوظ رکھا اور اس میں جن چیزوں کا تحفظ مطلوب ہے اس کا تحفظ کیا تو اس کے پچھلے گناہوں کا کفّارہ ہو جائے گا۔'' (۳)

ایک مسلمان کے جو اچھے اعمال اس کو جنّت میں لے جائیں گے ان میں ایک روزہ بھی ہے۔ رسول اللہ نے ایک بار صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''کیا آج تم میں سے کوئی روزہ سے ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا ''میں روزہ سے ہوں''۔ آپ نے فرمایا: کیا آج کسی نے صدقہ کیا ہے؟ ابوبکر نے کہا ''میں نے'' آپ نے فرمایا: تم میں سے کسی نے مریض کی عیادت کی ہے؟ ابوبکر نے کہا ''میں نے'' پھر فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے جنازہ کی متابعت کی ہے؟ ابوبکر نے کہا ''میں نے'' رسول اللہ نے اس پر ارشاد فرمایا کہ کسی آدمی میں یہ تمام عادتیں نہیں جمع ہوں گی مگر یہ کہ اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔'' (۴)

حقیقتِ صوم

ہم نے شروع میں صوم کی جو لغوی تشریح کی ہے اس سے روزہ کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ وہ دراصل نفس کی اصلاح و تربیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نفس اور جسم دو چیزیں عطا کی ہیں۔ ان میں نفس غیر مرئی اور جسم مرئی اور قابل مشاہدہ ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسم ایک علٰحدہ اور مستقل بالذات چیز ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ نفس کا

---

(۱) بخاری و مسلم، رواہ ابو ہریرہؓ

(۲) ایضاً

(۳) مسند احمد، رواہ ابو سعید خدریؓ

(۴) صحیح مسلم، رواہ ابو ہریرہؓ

Marfat.com

آلہٴ اظہار ہے۔ اس کی حیثیت ایک وفادار غلام کی سی ہے۔ انسانی نفس میں دو قوتیں رکھی گئیں ہیں، ایک مثبت اور دوسری منفی۔ مثبت کا نام تقویٰ اور منفی کا نام فجور ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (سورہ شمس-۸)

''پس ہم نے اس (نفس) پر الہام کیا، اس کا فجور اور اس کا تقویٰ۔''

مختلف خارجی اور داخلی اسباب کے تحت نفس کی ان دو متضاد قوتوں میں سے ایک غالب اور دوسری مغلوب ہو سکتی ہے لیکن ان میں سے کسی قوت کو بالکلیہ فنا کر دینا انسان کے بس سے باہر ہے۔ اگر انسان میں محبت کا جذبہ ہے تو نفرت کا بھی ہے۔ تاریخ انسانی میں کوئی دور ایسا نہیں گذرا جب ان دونوں میں سے کوئی قوت ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئی ہو۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم مختلف تدابیر سے نفس کی مثبت قوت (تقویٰ) کو فروغ دیں اور اس کی منفی قوت (فجور) کو مغلوب کر کے رکھیں اور اسے بے قابو نہ ہونے دیں۔

نفس کے اندر مختلف قسم کی خواہشات رکھی گئی ہیں، مثلاً کھانا پینا، جنسی مقاربت، طلبِ جاہ و منزلت اور تکاثرِ مال و اولاد وغیرہ۔ جسم کے تحفظ، نسل انسانی کی بقا اور تمدن کی ترقی کے لیے ان خواہشات کا وجود ناگزیر ہے۔ طبعاً یہ خواہشات بڑی منہ زور اور سرکش ہیں۔ ان کے قدم کسی حد و انتہا سے بالکل ناآشنا ہیں، یہ بگٹٹ گھوڑے کی طرح بے لگام ہیں۔ ان میں تنوع بھی ہے اور توسّع بھی۔ کسی حال میں ان کو سیری حاصل نہیں ہوتی، ہر آن ایک نیا لباس پہن کر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ وہ آگ کی مانند ہیں کہ ان کو آپ جتنا بجھائیں گے وہ اتنا ہی زیادہ شعلہ زن ہوں گی۔

اس صورت حال کا علاج ہر مذہب کے غالی عابدوں اور زاہدوں نے یہ تجویز کیا، اور اس پر عمل بھی کیا، کہ سرے سے خواہشاتِ نفس کی نفی کی جائے اور مختلف تدابیر، مثلاً تجرد، ترکِ علائق، خلوت گزینی اور تقلیلِ غذا سے اس کی قوت کو بالکل فنا کر دیا جائے۔ لیکن تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔

Marfat.com

اس سلسلے میں اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اعتدال کی تعلیم دی اور انھیں بتایا کہ خواہشاتِ نفس کو فنا کرنا ممکن نہیں اور یہ ایک غیر فطری عمل ہوگا۔ البتہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس کی منفی قوت کو مغلوب اور اس کی غیر معتدل خواہشات کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہی تزکیۂ نفس ہے جو روزے کے ذریعہ مطلوب ہے۔ اور یہی حقیقتِ صوم بھی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (سورہ شمس۔ ۸)

''جس نے اس (نفس) کا تزکیہ کیا وہ فلاح یاب ہو گیا اور جس نے اس کو (فجور کے نیچے) دبا دیا وہ ناکام و نامراد ٹھہرا۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام نے اپنے پیرووں کو نفس کشی کے بجائے اس کے تزکیہ کی تعلیم دی ہے اور اسی کو دنیا اور آخرت میں فلاح کا ضامن قرار دیا ہے۔

مقاصدِ صوم

دوسرے مذاہب میں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، روزے کا مقصد نفس کشی ہے۔ چنانچہ روزے کی حالت میں نفس اور جسم کو مختلف تدبیروں سے تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں۔ اسلام نے اس خیال کی نفی کی اور بتایا کہ روزے کا مقصد نفس کشی نہیں بلکہ اس کی تربیت و اصلاح ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس کے علاوہ غربا کی امداد اور اعترافِ نعمت بھی اسلامی روزے کے مقاصد میں داخل ہیں جیسا کہ آگے تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

روزے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ روزہ دار کے اندر خدا کی فرماں برداری کا سچا جذبہ پیدا ہو۔ اس جذبے کا نام قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

(سورہ مائدہ۔ ۲)

''نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور عدوان میں تعاون نہ کرو۔''

Marfat.com

اس آیت میں تقویٰ کے بالمقابل عدوان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔عدوان کے معنی سرکشی اور حکم عدولی کے ہیں اس لیے تقویٰ کے معنی لازماً اطاعت وفرماں برداری کے ہوئے۔قرآن مجید میں ''وَاتَّقُوْااللّٰہ''(۱) کا جملہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں ''اللہ سے ڈرو''۔لیکن خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حکموں کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے۔اس مفہوم کو دوسری آیات میں کھول دیا گیا ہے۔مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سورہ آل عمران۔۱۰۲)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور حالتِ اسلام میں تمہیں موت آئے''

اس آیت میں ''مسلمون'' کا لفظ ''اتَّقُوْااللّٰہ'' کے مفہوم کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ فرماں برداری ہے۔دوسری جگہ ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا (سورہ تغابن۔۱۶)

''اور اللہ سے حتی المقدور ڈرو، اور سنو اور اطاعت کرو۔''

اس آیت میں ''واسمعوا واطیعوا'' کا جملہ ''واتقوا اللّٰہ'' کی تشریح کے لیے لایا گیا ہے کہ اس سے مراد سمع وطاعت ہے۔

تقویٰ کے اس مفہوم کی روشنی میں دیکھیں کہ ایک روزہ دار صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جنسی مقاربت سے مکمل پرہیز کرتا ہے حالانکہ دوسرے دنوں میں یہ چیزیں اس کے لیے حلال ہوتی ہیں۔لیکن ان حلال اشیاء کو وہ محض اس لیے چھوڑ دیتا ہے کہ یہ اس کے خالق ومالک کا حکم ہے۔غور فرمائیں، ایک روزہ دار شدید بھوک اور پیاس کی حالت

(۱) عربی میں ''اتقاء'' کے لغوی معنی ڈرنے اور بچنے کے ہیں۔ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

فامّا ان تکونَ اخی اصدق — فاعرف منک غثی من سمینی

والا فاطرعنی و اتخذنی — عدوا اتقیک و تتقینی

''اگر تم میرے سچے دوست ہو تو میرے عیب وہنر کو پہچانو ورنہ مجھ سے الگ ہو جاؤ اور مجھ کو اپنا دشمن بنالو کہ میں تم سے ڈروں اور تم مجھ سے۔''

Marfat.com

میں چاہے تو لوگوں کی نظروں سے بچ کر اپنی بھوک اور پیاس مٹا سکتا ہے لیکن وہ کھانے کا ایک لقمہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہیں لے جاتا ہے۔ بیوی ہر وقت گھر کے اندر نظروں کے سامنے موجود ہے لیکن وہ جنسی مقاربت تو کجا اس کی طرف شہوت آمیز نگاہ سے دیکھتا بھی نہیں ہے۔ یہ سب ترک واجتناب محض اس لیے کہ اس کے خدا کا حکم ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ روزہ دار سال کے بقیہ مہینوں میں بھی تقویٰ کی راہ میں چلے۔

روزے کا دوسرا مقصد تربیتِ نفس ہے، جو فی الاصل تقویٰ ہی کی ایک شاخ ہے۔ خدا کی نافرمانی پر جو چیز آدمی کو ابھارتی ہے وہ نفس کی غیر معتدل خواہشات ہیں۔ انسان کی تمام چھوٹی بڑی خواہشات کا اگر استقصاء کیا جائے تو ان کو چند بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، یعنی خورد ونوش، لباس، مکان اور جنسی تلذذ۔ یہ خواہشات بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ غور سے دیکھیں تو انھیں خواہشات کے دم سے عالمِ آب وگل میں چہل پہل اور زندگی کی مختلف سرگرمیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن جس وقت ان خواہشات کا دائرہ حدِ اعتدال سے بڑھ جاتا ہے اور انسان ان خواہشات کے پیچھے آنکھ بند کر کے بھاگنے لگتا ہے تو وہ اپنے فطری مقام و منصب سے نیچے گر جاتا ہے، یعنی خواہشات معبود اور وہ ان کا عابد بن جاتا ہے، فرمایا گیا ہے:

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِلٰهُهُ هَوَاهُ الخ (سورہ جاثیہ۔ ۲۳)

"کیا تمہیں اس شخص کا حال معلوم نہیں جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنایا"

ایک دنیا پرست انسان جن اعمال واشغال میں شب وروز مشغول رہتا ہے وہ اس کے علاوہ اور کیا ہیں کہ کھانے کے لیے انواع واقسام کی غذائیں، پینے کے لیے خوش رنگ اور خوش مزہ مشروبات، رہائش کے لیے عالیشان مکان، جنسی خواہش کی تسکین کے لیے خوب رو عورت اس کو حاصل ہو۔ انھیں زخارفِ دنیوی اور لذاتِ مادی کی طلب وفراہمی میں اس کی زندگی کے ایام بسر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے پیش نظر زندگی کا مقصد محض تسلینِ نفس ہے اور اس کی تمام جدّ وجہد اور جانفشانی اسی ایک مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ اس پہلو سے ایک انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ حیوان کی زندگی کا مقصد بھی فرج وشکم کے تقاضوں کی تکمیل ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

Marfat.com

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ (سورہ محمد۔۱۲)

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اس طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں، اور دوزخ ہی ان کا ٹھکانا ہے۔''

قرآن کی درج ذیل آیت بھی ملاحظہ ہو جس میں ایک دنیا پرست عالم کا عبرت انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ فرمایا:

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْھَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِھَا وَ لٰکِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰهُ ۚ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْهُ یَلْھَثْ ؕ (سورہ اعراف۔۱۷۶)

''اور ان کو اس شخص کی داستان سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عطا کیں تو وہ (ان کی پیروی سے) نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور انجام کار وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ دنیا اور آخرت دونوں میں سربلندی عطا کرتے لیکن وہ تو زمین ہی کی طرف جھک گیا اور اپنی خواہشات کی پیروی میں لگ گیا۔ پس اس کی مثال کتے کی ہے کہ اگر تم اس کو مارو دھتکارو تو بھی وہ (اپنی حرص آلود) زبان نکالے رہتا ہے اور چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رہتا ہے۔''

انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس شرف و فضیلت کا تقاضا ہے کہ وہ حیوان کی سطح سے بلند ہو کر زندگی گذارے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کا نفس اس کے قابو میں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کے غلبہ کو توڑنے اور اس کے جوش و ہیجان میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کے لیے روزہ سے زیادہ کارگر کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے۔ جو لوگ فقر و فاقہ کی وجہ سے شادی کی قدرت نہیں رکھتے ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ روزے رکھیں۔

قرآن میں مختلف مقامات پر فدیہ اور کفارہ کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً، حج

Marfat.com

میں قربانی کے بعد حلق یعنی سر منڈانا ضروری ہے لیکن سر میں تکلیف ہو یا کوئی بیماری لاحق ہو تو سر منڈانے کے بجائے حکم ہے:

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (سورہ بقرہ۔۱۹۶)

''پس اس کے لیے روزہ یا صدقہ یا قربانی کی شکل میں فدیہ ہے۔''

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام سے کریں، جس کو حجِ تمتع کہتے ہیں، تو ان پر قربانی واجب ہے۔ لیکن قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو اس کا بدل ہے:

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ط تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ط (سورہ بقرہ۔۱۹۶)

''وہ تین دن کے روزے دوران حج میں رکھے اور سات روزے واپسی کے بعد (اپنے گھر پر)، یہ کل دس روزے ہوئے۔''

یہ حکم قابل غور ہے۔ حج میں قربانی اور سر منڈانے سے مقصود نفس کی تربیت ہے۔ ان کا بدل بھی وہی چیز ہو سکتی ہے جو تربیتِ نفس کے زمرہ سے ہو اور اس کے لیے روزہ سے زیادہ موزوں کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی ہے۔

قتلِ عمد میں ایک غیر مسلم کے قتل کا کفارہ، اگر اس کا تعلق اس قوم سے ہو جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے، خون بہا اور ایک مومن غلام کی آزادی ہے۔ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو:

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ط (سورہ نساء:۹۲)

''پس وہ مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کی ہوئی توبہ ہے۔''

''تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ'' کے الفاظ پر غور کریں۔ ایک غیر مسلم کا قتل نفس کی بے عنانی ہی کا نتیجہ تھا اس لیے حکم دیا گیا کہ مسلسل دو ماہ تک روزے رکھے جائیں تا کہ جس نفس سرکش کے اکسانے سے اس معصیت کا صدور ہوا اس کی اصلاح ہو۔

قرآن مجید میں قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اس طرح کا کھانا کھلایا جائے جو ایک متوسط درجے کا آدمی اپنے بال بچوں کو کھلاتا ہے، یا ان کو کپڑا پہنایا جائے، یا ایک

Marfat.com

غلام آزاد کیا جائے۔ جو شخص ان میں سے ایک چیز کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو اس کے لیے حکم ہے:

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَ احْفَظُوْا اَيْمَانَكُمْ (مائدہ۔ ۸۹)

''وہ تین دن کے روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفّارہ ہے جب کہ تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔''

اس آیت میں ''واحفظوا ایمانکم'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی قسم کو کسی حال میں نہ توڑے۔ اب اگر کوئی شخص قسم کھا کر اس کو توڑتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ نہیں ہے۔ اس کمزوری کا علاج روزہ ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے لیے حرام قرار دے لے اور پھر اس سے رجوع کرنا چاہے تو اس پر شریعت نے لازم کیا ہے کہ وہ ایسا کرنے سے پہلے غلام آزاد کرے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو:

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (سورۂ مجادلہ۔ ٤)

''وہ دو ماہ تک مسلسل روزے رکھے''

بیوی کو حرام ٹھہرا لینے کا فعل اسی شخص سے صادر ہو سکتا ہے جو نہایت درجہ جذباتی اور مغلوبُ الغضب ہوگا۔ چونکہ شریعت کی نظر میں یہ ایک سنگین جرم ہے اس لیے اس معاملے میں تربیت و اصلاح کا ضابطہ سخت رکھا گیا ہے یعنی دو ماہ کا مسلسل روزہ۔ اتنی طویل مدت کا روزہ نفسِ سرکش کی بے عنانی کو ختم کرنے میں یقیناً معاون ثابت ہوگا۔

حج کے دنوں میں حالتِ احرام میں جانوروں کا شکار ممنوع ہے۔ اگر کوئی شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ جو جانور اس نے شکار کیا ہے اس کے مثل ایک جانور کی قربانی کرے۔ اگر قربانی کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چند مسکینوں کو کھانا کھلائے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر:

عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ (سورہ مائدہ، ۹۵)

''اس کے برابر اس کو روزہ رکھنا ہوگا تا کہ اپنے کیے کا مزہ چکھے۔''

Marfat.com

حالت احرام میں جانور کے شکار کا مطلب یہ ہے کہ حاجی کا نفس ابھی بے قابو ہے اور جانور کا گوشت اور اس کی کھال سے حاصل ہونے والا نفع اس کو زیادہ عزیز ہے۔ آیت میں ''لیذوق وبال امرہ'' کا جملہ بتاتا ہے کہ گناہ کا کفارہ دراصل مرتکب گناہ کے لیے سزا کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس سے مقصود نفس کی تربیت واصلاح ہے۔

روزے کا تیسرا مقصد اعترافِ نعمت ہے۔ معلوم ہے کہ قرآن کا نزول رمضان کے مہینے کی ایک مبارک رات میں ہوا۔ (سورہ دخان۔۳) اس مبارک رات کا نام لیلۃ القدر ہے (سورہ قدر۔۱) اس رات کی فضیلت اسی سورہ میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ○ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ○ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ سَلَامٌ ۛ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ (سورہ قدر، ۲ تا ۵)

''اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے! شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس میں فرشتے اور روح (یعنی روح الامین) اترتے ہیں، ہر معاملے میں اپنے رب کی اجازت کے ساتھ۔ یہ رات یکسر سلامتی ہے طلوع صبح تک۔''

ہزار رات سے بہتر رات میں قرآن مجید کا نزول اس کے شرف وفضیلت کو ظاہر کرتا ہے۔ معلوم ہے کہ یہود اپنی قومی تاریخ کے اہم واقعات کی یاد میں روزے رکھتے تھے، جو غم کے روزے کہلاتے تھے۔ لیکن مسلمان نہ تو غم کے اظہار کے لیے روزہ رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی تاریخی واقعے کی یادگار کے طور پر۔ مسلمانوں کے لیے قرآن سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اس مبارک مہینے میں روزہ رکھ کر اس عظیم نعمت کا اعتراف کرتے ہیں اور خدا کا شکر بجالاتے ہیں۔ اور اسی لیے اس مہینے میں قرآن کی بکثرت تلاوت کی جاتی ہے۔

لیکن آج کل اس معاملے میں مسلمانوں کا طرز عمل ٹھیک وہ ہے جو کبھی یہودیوں کا تھا جو تورات کی تلاوت تو کرتے تھے لیکن اس کو سمجھتے نہیں تھے، اور ان کے علماء اس میں غور وفکر نہیں کرتے تھے۔ تورات ہی میں لکھا ہے:

Marfat.com

''میرے بندے تجھے شرم نہیں آتی کہ اگر سفر کے دوران تیرے بھائی کا خط تیرے پاس سرِ راہ پہنچتا ہے تو تو ٹھہر جاتا ہے، یا راستے سے الگ ہو کر بیٹھتا ہے اور اس کے ایک ایک حرف کو پڑھتا ہے اور اس میں غور و فکر کرتا ہے، اور یہ کتاب (تورات) میرا فرمان ہے جو میں نے تجھے لکھا ہے کہ تو اس میں برابر غور و فکر کرتا رہے اور اس کے احکام پر عمل کرے، لیکن تو...... تو اس سے انکار کرتا ہے اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے جی چراتا ہے، اور اگر پڑھتا بھی ہے تو غور و فکر نہیں کرتا۔'' (۱)

حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے: ''آج مسلمانوں کا وہی حال ہے جو کبھی بنی اسرائیل کا تھا۔ اسلاف کو پورا یقین تھا کہ قرآن خدا کا فرمان ہے اور اسی کی طرف سے نازل ہوا ہے، چنانچہ وہ راتوں میں غور و فکر کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے اور دن میں انھی کے احکام پر عمل کرتے، تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ بس اس کے الفاظ پڑھتے ہو، اس کے حروف کے زیر و زبر درست کرتے ہو اور رہا عمل تو اس میں نہایت سُست اور کوتاہ ہو۔'' (۲)

غربا و مساکین کی امداد و اعانت بھی روزے کے مقاصد میں داخل ہے۔ جو لوگ بڑھاپے یا کسی بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے ہیں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں:

فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ

(سورہ بقرہ۔۱۸۴)

''تم میں سے جو مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے، اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں تو ہر روزے کے عوض میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں، جو شخص اپنی خوشی سے کچھ مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔''

ایک فاقہ کش آدمی کو بھوک اور پیاس سے جو تکلیف پہنچتی ہے اس کا احساس صرف

---

(۱) تورات، بحوالہ کیمیائے سعادت، ص۱۱۴

(۲) ایضاً

Marfat.com

وہ شخص کر سکتا ہے جس نے خود بھی کبھی بھوک اور پیاس کی تکلیف اٹھائی ہو۔ چنانچہ جب وہ کسی بھوکے آدمی کو دیکھتا ہے تو فوراً ہی اس کو اپنی بھوک اور پیاس اور اس سے پیدا ہونے والی تکلیف یاد آجاتی ہے اور اس کے دل میں اس بھوکے آدمی کے ساتھ رحم اور ہمدردی کے جذبات لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

روزہ ایک صائم کے اندر اسی قسم کے صالح جذبات اور احساسات بیدار کرتا ہے تا کہ سماج کے غربا اور حاجت مندوں کی دست گیری ہو اور ان کی تکالیف کا ازالہ ہو سکے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ صیام کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ صبر اور غم خواری کا مہینہ ہے۔(۱)

مفسداتِ صوم

دوسری عبادات کی طرح روزے کے معاملے میں بھی ہمارا رویہ سطحی اور ظاہر داری کا ہے۔ عام خیال کے مطابق جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا اس میں خرابی آجاتی ہے وہ یہ ہیں: بھول چوک سے کچھ کھا پی لینا، منہ بھرتے ہونا، کان اور ناک میں تیل یا کوئی سیال دوا ڈالنا جو حلق تک پہنچ جائے، منجن (ٹوتھ پیسٹ) کا استعمال اور انجکشن لگوانا وغیرہ۔ لیکن جو باتیں فی الواقع روزے کو توڑتی ہیں اور اس کے فوائد کو بالکلیہ زائل کر دیتی ہیں ان کی طرف ہماری توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، مثلاً روزے کی حالت میں لڑائی جھگڑا کرنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا اور خرید و فروخت میں بے ایمانی وغیرہ۔ اس صورت حال کے ذمہ دار علماء و فقہاء ہیں جو مسائلِ روزہ کے بیان میں ان باتوں کا کم ہی ذکر کرتے ہیں جو حقیقت میں روزہ خراب کرنے والی ہیں۔

مفسداتِ روزہ میں ریا و نمود سب سے بڑی خرابی ہے۔ ضروری ہے کہ روزہ صرف خدا کی خوشنودی اور اپنے نفس کی اصلاح کے لیے رکھا جائے، ریا اور نمود کا کوئی معمولی عنصر بھی اس میں شامل نہ ہو۔ روزہ دار کے کسی فعل سے بالقصد ظاہر نہ ہو کہ وہ روزہ سے ہے، مثلاً

(۱) بیہقی، فی شعب الایمان، رواہ سلمان فارسیؓ، یہ طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔

Marfat.com

صورت کی غمگینی اور سر کے بالوں کی پراگندگی وغیرہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اکثر یہودی ریا آمیز روزے رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے پیروؤں کو تلقین کی:

''پھر جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے۔ پر جب تم روزہ رکھو تو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔''(۱)

روزے کا مقصد، جیسا کہ بیان ہوا، تزکیۂ نفس ہے اس لیے بری باتوں اور برے افعال سے یہ مقصد زائل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشادات قابل توجہ ہیں:

۱۔ ''پانچ چیزیں ایسی ہیں جو روزہ دار کا روزہ توڑ دیتی ہیں، جھوٹ، غیبت، جھوٹی قسم اور بری نظر سے دیکھنا۔''(۲)

۲۔ ''تم میں سے جو شخص روزہ سے ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ بد کلامی اور یاوہ گوئی سے اجتناب کرے اور نہ جہالت (غصہ) کرے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے اور آمادۂ جنگ ہو تو صاف کہہ دے کہ وہ روزہ سے ہے۔''(۳)

۳۔ ''روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو۔ صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ اس میں سوراخ کس چیز سے ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا، جھوٹ اور غیبت سے۔(۴)

۴۔ ''جس نے روزہ رکھ کر بھی جھوٹ اور فریب کے کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''(۵)

---

(۱) متی، باب ۶: ۱۶، ۱۷

(۲) دارمی، کتاب الصوم

(۳) بخاری، کتاب الصوم، ج ۱، ص ۲۵۲، مسلم، کتاب الصوم، ج ۱، ص ۳۲۷، موطا، باب: جامع الصیام

(۴) نسائی

(۵) بخاری، کتاب الصوم، ج ۱، ص ۲۵۵، ترمذی، باب الصوم، ص ۶۴

Marfat.com

اوپر ہم نے جن مفسداتِ روزہ کا ذکر کیا ہے ان سے محفوظ رہنے کے لیے دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، ایک نماز کی محافظت اور دوسرے قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت۔ پابندیِ اوقات کے ساتھ نماز کا اہتمام تو عام دنوں میں بھی ضروری ہے لیکن ماہ صیام میں نگرانی کا یہ عمل زیادہ قوی ہو اور اس میں کمی اور کیفی دونوں اعتبار سے اضافہ ہو، یعنی فرائض کے ساتھ نوافل کا بھی اہتمام کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قیام نماز کا جو مقصد ہے وہ ہر آن پیش نظر رہے یعنی خدا کی یاد اور منکرات سے اجتناب۔

محافظتِ نماز کے بعد فواحش سے روکنے والی دوسری اہم چیز قرآن کی بکثرت تلاوت ہے۔ لیکن یہ فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا جب قرآن کو سمجھ کر پڑھا جائے۔ اس طرح تلاوت کرنے سے دل میں برائیوں سے رفتہ رفتہ تنفر پیدا ہوگا اور خدا کے احکام کی پیروی کا جذبہ ابھرے گا۔ ایک بار نبی ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے اسی طرح دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا، یارسواللہ دلوں کا زنگ کس طرح دور ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا، موت کی یاد اور کثرت سے قرآن کی تلاوت۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ نماز اور روزے کے اہتمام کے باوجود مسلمانوں سے ان کی برائیاں دور نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ قرآن کو بے سوچے سمجھے پڑھنا ہے، اور اس بیماری میں عوام وخواص دونوں مبتلا ہیں۔ عوام اس کو سمجھ کر نہیں پڑھتے اور علماء اس میں تدبر نہیں کرتے۔ یاد رکھیں، علم صحیح کے بغیر عمل صحیح ممکن نہیں ہے، اور علم صحیح کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ قرآن مجید ہے۔ اس لیے ماہ صیام میں نہ صرف کثرت سے قرآن کی تلاوت کی جائے بلکہ اس کو سمجھ کر پڑھا جائے، جو اہل علم ہیں وہ اس میں تدبر کریں تاکہ دلوں پر اثر ہو اور اس کے حکیمانہ پہلو ظاہر ہوں۔

فوائدِ صوم

خدا کا یہ بڑا فضل وکرم ہے کہ دوسری عبادات کی طرح روزے میں بھی اہل ایمان کے لئے جہاں روحانی فائدے ہیں وہاں اس میں مادی فائدے بھی موجود ہیں۔ لیکن افسوس

Marfat.com

ہے کہ مسلمانوں کی نظر نہ اس کے روحانی فائدے پر ہے اور نہ ہی مادی فائدے پر۔ اسی خیال سے ضروری معلوم ہوا کہ یہاں روزے کے فوائد بیان کیے جائیں۔

روزے کے روحانی فوائد میں تقویٰ اور صبر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

تقویٰ کے بارے میں ہم اس سے پہلے تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ روزہ دراصل خدا کی فرماں برداری کی ایک عملی مشق ہے۔ اس عمل سے نفس کی کثافتیں اس طرح دور ہوتی ہیں جس طرح صابن سے کپڑوں کا میل کچیل دور ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اخلاص اور للّٰہیت کے جذبہ سے ہر سال ماہ صیام کے روزے رکھے اور اس کے باوجود اس کا نفس مغلوب نہ ہو اور اس کے اندر خدا کی اطاعت کا جذبہ متحرک نہ ہو، لیکن اگر اس کے برعکس صورت ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ حقیقی روزہ نہیں ہے۔

روزہ اور صبر میں گہرا تعلق ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: الصوم نصف الصبر (۱) ''روزہ نصف صبر ہے'' معلوم ہے کہ انسان کی طبیعت میں عجلت پسندی ہے اور اشتعال پذیری بھی، اور اس کمزوری کا بہترین علاج روزہ ہے۔ اس سے طبیعت کے اندر صبر و استقلال کی خوبی پیدا ہوتی ہے۔ فرد ہو یا قوم، اس کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں صبر اور ثابت قدمی کا جوہر بدرجۂ اتم موجود ہو۔ اس کے بغیر مصافِ زندگی میں کسی طرح کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔

تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ یہود کی تاریخ میں طالوت اور جالوت کا قصہ کافی مشہور ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق طالوت کی فوج قلتِ تعداد کے باوجود محض صبر و ثابت قدمی اور خدا کی غیبی مدد سے جالوت کے لشکرِ جرار پر غالب آ گئی۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ فَهَزَمُوْهُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ

(سورہ بقرہ۔ ۲۵۰)

---

(۱) ترمذی، ابن ماجہ رواہ ابو ہریرہؓ

Marfat.com

"کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں۔ اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ اور جب جالوت اور اس کی فوج سے ان کا سامنا ہوا تو انہوں نے دعا کی، اے ہمارے پروردگار، ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدموں کو جما دے اور کافر قوم پر ہم کو فتح و نصرت عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انھوں نے ان کو (جالوت اور اس کی فوج) شکست دی"

اسلامی تاریخ میں عہد نبوی کے غزوات بالخصوص غزوۂ بدر اور غزوۂ خندق (احزاب) اور خلافتِ راشدہ میں روم و ایران کی عظیم الشان حکومتوں کی پامالی صبر و ثبات کی کرشمہ سازیوں کی زندۂ جاوید مثالیں ہیں۔ قران مجید میں فرمایا گیا ہے:

اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ وَ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا مِّنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا۔۔۔۔ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ۝

(سورہ انفال ـ ۶۵،۶۶)

اگر تم میں سو ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سو ایسے ہوں گے تو وہ ہزار کافروں پر بھاری ہوں گے۔۔۔۔ اور اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔"

روزہ اور صبر کے اس تعلق پر بحث کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے کہ: "یہی صوم (روزہ) ہے جو مذہب نے انسان کی ظاہری اور باطنی تربیت کے لئے تجویز کیا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیت کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے بلکہ صلاحیت کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزہ کے بنیادی مقصد دو بیان کئے گئے ہیں، تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدودِ الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے اپنے باطن سے جو مشکلات و موانع سر اٹھائیں ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ہر مسلمان اسی جہاد کی

Marfat.com

ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔''(۱)

لیکن کیا وجہ ہے کہ ماہ صیام کے روزے رکھ کر بھی مسلمانوں میں صبر کا جوہر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں، معمولی معمولی باتوں پر مشتعل ہو جاتے ہیں، مشکل حالات میں بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔ ہم اس قدر بے صبرے ہو چکے ہیں کہ نماز جمعہ اور عیدین کے مواقع پر مسجد سے نکلتے وقت بھی صبر کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو دھکا دے کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے ماہ صیام میں یہ افسوسناک منظر بھی دیکھا ہے کہ اکثر روزہ دار کھانے اور مشروبات پر بھوکے جانور کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور صبر و برداشت کا جو مظاہرہ انھوں نے دن بھر روزہ رکھ کر کیا تھا اس کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ قومی مسائل پر بحث و گفتگو میں بھی ہم صبر و برداشت سے عاری ہوتے ہیں اور بسا اوقات ہماری محفلیں ہنگاموں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ دراصل رسمیت ہے جو دوسری عبادتوں کی طرح روزے میں بھی موجود ہے۔ علماء بھی اس طرز عمل کے ذمہ دار ہیں جو خود اس خرابی میں مبتلا ہیں۔

روزے کے مادی فوائد بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ اجتماعی شعور کی بیداری ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان ایک مخصوص مہینے میں ایک معینہ مدت تک روزے رکھتے ہیں۔ اس اجتماعی عمل کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک روحانی فضا بنے اور مسلمانوں کا دینی اور قومی شعور پختہ ہو۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر کسی قوم کے اندر سے اجتماعیت کا شعور معدوم ہو جائے تو اس کی حیثیت ایک تودۂ ریت سے زیادہ نہیں ہے نامساعد حالات کا ایک معمولی جھونکا اس کے وجود کو منتشر کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

روزے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے سماج کے غربا و مساکین کے ساتھ ہمدردی اور ان کی دست گیری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ رمضان کے مہینے میں کثرت سے صدقہ و خیرات کریں تاکہ ان کے غریب بھائی بھی بآسانی روزہ رکھ سکیں اور عید کے موقع پر قوم کی اجتماعی خوشی میں برابر کی سطح پر شریک ہوں۔ یہ ایک

(۱) تدبر قرآن، ج ۱ ص ۴۶۲

Marfat.com

حقیقت ہے کہ مسلمان آج بھی اپنی تمام ایمانی کمزوریوں کے باوجود رمضان میں بکثرت صدقہ وخیرات کرتا ہے لیکن افسوس کہ اس کا فائدہ سماج کے غربا و مساکین کو بہت کم پہنچتا ہے۔ دینی مدارس کے لوگ اس کا بڑا حصہ اچک لے جاتے ہیں۔ یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔

روزے کا یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ اس سے بعض بری عادتوں، مثلاً تمباکو نوشی، پان خوری اور بکثرت چائے نوشی وغیرہ سے نجات مل سکتی ہے، بشرطیکہ روزہ دار کی قوت ارادی مضبوط ہو اور وہ ان بے فائدہ عادتوں سے رہائی حاصل کرنے کا قوی عزم رکھتا ہو۔

یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ روزے سے بعض جسمانی عوارض کا ازالہ ہوتا ہے۔ ہماری بہت سی جسمانی تکالیف کی وجہ خورد ونوش میں بے اعتدالی ہے۔ چونکہ رمضان کے دنوں میں کھانا ایک معیّن وقت پر، جس کا وقفہ کافی طویل ہوتا ہے، کھایا جاتا ہے اس لیے معدہ بآسانی ہر طرح کی غذا کو ہضم کر لیتا ہے اور کوئی چیز معدہ کے اندر غیر منہضم حالت میں اکٹھا نہیں ہوتی ہے جس کی وجہ سے جسم مختلف مرضی آفات سے محفوظ رہتا ہے۔ عام طور پر مرغن غذاؤں کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے کولیسٹرال (Cholestrol) اور ٹری گلیسرائیڈ (Tri glyceride) جیسے روغنی اجزا کی مقدار خون میں زیادہ ہو جاتی ہے جس سے قلبی امراض کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ روزہ رکھنے سے یہ خطرات بڑی حد تک کم ہو جاتے ہیں کیوں کہ اس سے خون کے روغنی اجزا کی غیر طبعی مقدار گھٹ جاتی ہے۔

ہندوستان کے امراضِ قلب فاؤنڈیشن کے نائب صدر ڈاکٹر کے۔ کے۔ اگروال نے ایک اسرائیلی تحقیق کے حوالے سے لکھا ہے کہ روزوں سے کولیسٹرال کی سطح مناسب حد پر رہتی ہے۔ یعنی اس سے ایچ۔ ڈی۔ ایل بنتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کل امراض قلب کے ماہرین ایسے طریقوں کی تلاش میں ہیں جن سے ایچ ڈی ایل کی سطح کو بڑھایا جا سکے کیونکہ اس طریقے سے دل کو شریان کی بیماری سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ (۱)

جدید طبی تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ روزے کی حالت میں جسم کے اندر

---

(۱) قومی آواز، یکم جون ۱۹۹۳ء (ایک اسرائیلی تحقیق)

Marfat.com

بعض ہارمون، مثلاً B,Liptrophine، Endrophine وغیرہ، کی مقدار خون میں بڑھ جاتی ہے لیکن جنسی ہارمون کی مقدار گھٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھوک کی حالت میں جنسی خواہش بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی روزے کے دوسرے جسمانی فائدے ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔

صوم پر ایک اعتراض

روزہ پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے انسان کی قوت کار گھٹ جاتی ہے اور اقتصادی اعتبار سے فرد اور قوم دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ غریب مسلمان کو روزی کمانے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے بالخصوص موسم گرما کے روزے میں۔

یہ دونوں اعتراض بالکل سطحی نوعیت کے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ روزے سے، خاص کر گرمی کے دنوں میں، جسمانی قوت میں تھوڑی بہت کمی آجاتی ہے۔ اور یہ بات بھی تسلیم ہے کہ غریب روزہ دار کو کسبِ معاش میں دشواری پیش آتی ہے، بالخصوص ان روزہ داروں کو جو محنت کے کام کرتے ہیں۔ لیکن کیا محض ان دو وجوہ سے روزہ نہ رکھا جائے اور اس کے فوائد سے محرومی قبول کر لی جائے۔ یہ فوائد مادی بھی ہیں اور روحانی بھی اور ان کا ذکر اوپر تفصیل سے ہو چکا ہے۔

یہ بات تجربے سے ثابت ہو چکی ہے کہ چند مقررہ ایام میں بھوکا پیاسا رہنا صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ اور بہت سی جسمانی بیماریوں کا اس میں علاج ہے۔ عربی میں اس گھوڑے کو صائم کہتے ہیں جس کو تربیت دینے کے لیے کم سے کم خوراک دی جاتی ہے اور بادِ مخالف کے رخ پر اس کو چلایا جاتا ہے تاکہ اس کا بدن سبک ہو جائے اور اس میں میدان جنگ کے شدائد برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو۔

اس کے علاوہ انسان اپنے اندر ایک روحانی وجود بھی رکھتا ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہی اصلی وجود ہے۔ اس روحانی وجود کی بقا اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی خواہشاتِ نفسانی کے غلبہ سے مکمل طور پر آزاد ہو۔ اس روحانی زندگی کی پرواز کا رخ اوپر یعنی عالمِ لاہوت کی طرف ہے اور خواہشات نفسانی کا رخ نیچے یعنی عالمِ ناسوت کی طرف (سورہ

Marfat.com

اعراف، ۲۵)، نفسانی خواہشات چاہتی ہیں کہ انسان اپنے روحانی وجود کو بھول کر صرف اپنے مادی وجود کی تسکین و تفریح کا سامان فراہم کرنے میں دلچسپی لے۔ دوسرے لفظوں میں عالمِ ناسوت کو ہی اپنی منزلِ مقصود سمجھ لے اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔

لیکن انسان کی سعی و عمل کی اصلی جولان گاہ یہ عالمِ آب و گل نہیں کہ یہ تو گذر گاہ ہے، اس کی منزلِ مراد تو عالمِ غیر مادی ہے جو چرخِ نیلی فام سے بھی پرے واقع ہے۔ اس منزل کی آرزو اور اس تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس گذر گاہ یعنی عالم مادی کے اسباب و لذائذ اور زخارفِ دنیا کی رنگینیوں میں کھو نہ جائے بلکہ ان سے بے نیازانہ گذر جائے۔

یاد رکھیں، اس راہ کا سب سے بڑا دشمن خود انسان کا اپنا نفس اور اس کی ہمیشہ ناآسودہ رہنے والی خواہشات ہیں۔ یہ سفر کامیابی کے ساتھ اسی وقت طے ہو سکتا ہے جب مسافر نفسِ لمّارہ کے مکر و فریب سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اس صورت حال کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ روزہ رکھنے میں نقصان ہے، یہ تو انسان کی روحانی زندگی کی صحت کے لیے ایک ناگزیر چیز ہے۔

جہاں تک غربا کی روزی روٹی کا مسئلہ ہے تو وہ بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ مذکورہ روحانی اور مادی فوائد کا تقاضا ہے کہ ایک غریب مسلمان بھی اس پر مشقت عمل کو برداشت کرے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ رمضان کے علاوہ مہینوں میں زیادہ محنت و مشقت کر کے اس قدر روزی فراہم کر لے جو ماہ صیام میں ہونے والے متوقع نقصان کی تلافی کر سکے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی فراموش نہ ہو کہ خدا ہی رزق رساں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی رضا کے لیے تکالیف اٹھانے والوں کو اس کی غیبی مدد حاصل نہ ہو، شرط اخلاص اور جذبۂ عمل ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ (سورہ طلاق۔ ۲، ۳)

"اور جو اللہ کا خوف رکھے تو ان کے لیے راہ نکالے گا اور وہاں سے رزق دے گا

Marfat.com

جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنا حکم نافذ کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔''

معذور الصوم

اسلامی روزے کا مقصد، جیسا کہ مکرر لکھا جا چکا ہے، تزکیۂ نفس ہے تا کہ تقویٰ پیدا ہو۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ روزہ دار غیر ضروری مشقت اٹھائے۔ دوسرے مذاہب میں تکلیف اٹھا کر عبادت کرنا مستحسن سمجھا گیا ہے لیکن اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اس زحمت سے روکا ہے اور معذور لوگوں کی معذوری کا لحاظ رکھا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

(سورة بقرة ١٨٤)

''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے، اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔'' (ترجمہ شیخ الہند)

''وعلى الّذين يطيقونه'' کا صحیح مفہوم

اکثر مفسّرین نے مذکورہ آیت میں ''یطیقونہ'' کی ضمیر کا مرجع صوم کو مانا ہے جیسا کہ شیخ الہند کے ترجمہ میں بھی ہے، اور ''اطاقة'' کو اس کے معروف لغوی مفہوم میں لیا ہے یعنی طاقت رکھنے کے مفہوم میں۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کا مطلب ایک روایت کی روشنی میں یہ بیان کیا گیا کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزے نہ رکھیں ان کے ذمّے ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔ بعد میں یہ رعایت منسوخ ہو گئی۔

لیکن آیت کا یہ مطلب اس کے سیاق وسباق سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض

Marfat.com

مفسرّین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس آیت کا تعلق دراصل ایک خاص قسم کے معذور لوگوں سے ہے، اور ''یطیقونہ'' سے پہلے حرف نفی ''لا'' محذوف ہے اور آیت کا ترجمہ ہوگا: ''جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔'' یہ بات اصولِ تاویل میں داخل ہے کہ واضح قرینہ کے بغیر کسی محذوف کو تسلیم نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے تاویلِ فاسد کا دروازہ کھلے گا اور قرآن مجید کی کوئی آیت بھی اس سے محفوظ نہ رہے گی۔ چونکہ یہاں کوئی واضح قرینہ نہیں ہے اس لیے ''یطیقونہ'' سے پہلے حرف نفی کو محذوف ماننا صحیح نہ ہوگا۔ مذکورہ تاویل کی واحد وجہ تطبیقِ روایت ہے۔ حدیث میں ہے کہ متعدد صحابہ اس آیت کا اطلاق کمزور اور عمر رسیدہ لوگوں پر کرتے تھے کہ وہ روزہ نہ رکھ کر اس کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔

تطبیقِ روایت کے باوجود چونکہ یہ ایک بودا نحوی استدلال تھا اس لیے ایک دوسری دلیل یہ دی گئی کہ بابِ افعال کا خاصہ سلبِ ماخذ بھی ہے۔ اس تاویل کے مطابق ''اطاق فلان'' کے معنی ہوئے کہ فلاں شخص میں طاقت نہیں ہے۔ اس صورت میں ''یطیقونہ'' کا ترجمہ ہوگا ''اور جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے (خواہ پیری اور خواہ بیماری کے سبب)۔'' اس تقدیر پر حرف نفی محذوف قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

علامہ سرخسی کا یہی خیال ہے۔ (۱) ہندی مفکرین میں علامہ اقبال بھی اس خیال کے حامی تھے۔ انھوں نے ایک خط کے جواب میں لکھا ہے کہ: ''باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ ہے۔ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ ''یطیقونہ'' میں تمام بوڑھے' پیدائشی کمزور اور حائضہ عورتیں شامل ہیں۔'' (۲)

یہ دوسری تاویل بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر ہم سلبِ ماخذ کی دلیل کو تسلیم بھی کر لیں اور اس کی بنیاد پر آیت کے مفہوم کو اثبات کے بجائے نفی میں لیں، یعنی جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، تو پھر قرآن کا یہ قول کہ: وان تصوموا خیر لکم (اور یہ کہ تمہارا روزہ رکھنا تمہارے

---

(۱) تفسیرات احمدیہ، ص ۱۴۰

(۲) اقبال نامہ (خط بنام سراج الدین پال) مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اول، ص ۴۰

Marfat.com

لیے زیادہ بہتر ہے) بے معنی ہو جاتا ہے۔ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ان سے یہ کہنا کہ فدیہ کے بجائے روزہ رکھ لینا ان کے لیے بہتر ہے، تکلیفِ مالا یطاق کے مترادف ہوگا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط "اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔" اس کی شریعت میں آسانی ہے، تنگی نہیں ہے۔ اس نے خود فرمایا ہے: "يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (سورہ بقرہ۔۱۸۵)" "اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا ہے۔"

اس کے علاوہ یہاں ایک نحوی اشکال بھی ہے اور وہ یہ کہ خاصیاتِ ابواب کا معاملہ قیاسی نہیں سماعی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> "ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ بابِ افعال کے خواص میں سے سلبِ ماخذ بھی ہے، لیکن خاصیاتِ ابواب کا معاملہ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں' قیاسی نہیں بلکہ سماعی ہے۔ اس وجہ سے اصل چیز لفظ کا استعمال ہے۔ اگر اہل زبان نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہو اور اس کی مثالیں موجود ہوں تب تو بلاشبہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اگر اس معنی میں اس لفظ کے استعمال کی کوئی نظیر کلامِ عرب اور قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہے تو محض اس مفروضہ پر کہ بابِ افعال کے خواص میں سلبِ ماخذ بھی ہے لفظ کو اثبات کے بجائے نفی میں لے لینا عربی زبان پر بہت بڑا ظلم ہے، اور یہ چیز دین میں بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اگر کوئی صاحب اس اصول کو بے دھڑک استعمال کرنے لگ جائیں تو وہ دین کے ایک بڑے حصے کو بڑی آسانی سے امر وحکم کے بجائے نفی ونہی سے بدل سکتے ہیں۔" (۱)

علماء کی ایک دوسری جماعت نے حرفِ نفی (محذوف) اور سلبِ ماخذ کی غلطی محسوس کر کے یہ دعویٰ کیا کہ اطاقۃ کے معنی کسی کام کو بمشکل اور بدقت انجام دینے کے ہیں۔ اس لیے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو لوگ دشواری کے ساتھ روزہ رکھیں، مثلاً سن رسیدہ اشخاص، مرضعہ اور حاملہ عورتیں وغیرہ، وہ روزہ چھوڑ سکتے ہیں اور اس کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا

(۱) تدبرِ قرآن ج ۱، ص ۴۴۷، ۴۴۸

Marfat.com

دیا کریں۔ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ پطرس بستانی لکھتے ہیں:

''طاقت(۱) کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنے کے ہیں لیکن یہ قدرت کی اس مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بمشقت کر سکتا ہو۔ دراصل یہ لفظ طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ ''لاتحملنا مالا طاقۃ لنا'' کے یہ معنی نہیں کہ ہم پر ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی قدرت ہم نہ رکھتے ہوں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس سے عہدہ برآ ہونا ہمارے لئے بہت مشکل ہو۔''(۲)

علامہ زمخشری کا بھی یہی خیال ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: ''طاقت کے معنی میں وہ کام آتے ہیں جنھیں بہ تکلیف یا بہ مشقّت کیا جا سکے۔ اور ''علی الذین یطیقونہ'' سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن پر روزہ رکھنا شاق ہو۔ پس ان کے لیے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ اس بنا پر آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہے''۔(۳)

علامہ شبستری نے اسی تاویل کو اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''عربی زبان میں ''الوسع'' اس قدرت کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طاقت کا لفظ اس قدرت کے لیے آتا ہے جو مشقّت کے ساتھ ہو۔ اور علی الذین یطیقونہ کے معنی ہوں گے ''ان لوگوں پر جو تکلیف اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔''(۴)

امام راغب نے ''اطاقۃ'' کی لغوی تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''طاقت اس مقدار کا نام ہے جس کو انسان کے لیے مشقت کے ساتھ انجام دینا ممکن ہو۔ یہ دراصل طوق سے مشتق ہے جو کسی چیز کو گھیر لیتا ہے۔ قرآن شریف کی آیت ''ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا

---

(۱) لسان العرب میں ہے ''طاقت، قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لیے بمشقت کرنا ممکن ہو (ج ۱۲، ص ۱۰۳)، تاج العروس میں ہے ''طاقت اس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بدشواری کیا جائے یعنی وہ کام انسان پر اتنا شاق گزرے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو''۔

(۲) محیط المحیط، ج ۲، ص ۱۳۰۴

(۳) کشاف، ج ۱، ص ۲۵۵

(۴) روح المعانی، الجزء الثانی ص ۵۹

Marfat.com

بہ ‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ جس کا انجام دینا ہمارے لیے بے حد دشوار ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی قدرت ہم نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر صرف اتنا ہی بار ڈالتا ہے جتنا وہ اٹھا سکے، جیسا کہ ارشاد ہے: و یضع عنھم اصرھم ’’اور ان کے بوجھ ان سے اتارتا ہے‘‘ وضعنا عنک وزرک ’’ہم نے تیرا بوجھ تجھ سے دفع کیا، یعنی وہ سخت عبادات کہ جن کے چھوڑنے میں گناہ تھا ہم نے تیرے لیے اس میں تخفیف کر دی‘‘ اسی طرح ہے: قالوا لا طاقة لنا الیوم بجالوت وجنودہ ’’انہوں نے کہا کہ آج ہم جالوت اور اس کی فوج سے لڑائی کی طاقت نہیں رکھتے، یعنی ممکنہ مشقت کے باوجود آج لڑائی کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔‘‘ (۱)

دور آخر کے مفسرین میں مفتی عبدہ نے اسی تاویل کو پسند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ’’الطاقة دراصل قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب ’’اطاقة الشیء ‘‘صرف اس وقت بولتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ضعیف ہو یعنی بدشواری وہ کچھ کر سکے۔ ’’الذین یطیقونہ ‘‘ سے یہاں بوڑھے اور اپاہج لوگ مراد ہیں جن کی معذوری دور ہونے کی کوئی توقع ہی نہ ہو۔ وہ لوگ بھی ان کے زمرہ میں شمار ہوں گے جن کی معاش اللہ تعالیٰ نے پر مشقت کاموں میں رکھی ہو، مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لیے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہے۔۔۔۔ اسی زمرے میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جن پر کسی وجہ سے روزہ رکھنا گراں ہو اور اس وجہ کے دور ہونے کی کوئی امید نہ ہو، جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزور اور دائم المریض جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ لوگ جو بیمار تو نہیں مگر روزہ دشواری کے ساتھ رکھ سکیں جیسے حاملہ اور مرضعہ۔ ان سب کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔‘‘ (۲)

اکثر ہندی مفسرین بھی مذکورہ خیال کی طرف گئے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی

---

(۱) المفردات فی غریب القران

(۲) تفسیر المنار، ج ۲، ص ۱۵۵-۱۵۷

Marfat.com

لکھتے ہیں: ''تحقیق یہ ہے کہ ''اطاقۃ'' کے معنی کسی چیز کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں اس لیے ''یطیقونہ'' کا ترجمہ ہوگا کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلانے کا فدیہ دیدیں۔''(۱)

انھوں نے مزید لکھا ہے کہ: ''اطاقۃ، طاقت کا باب افعال سے مصدر ہے، اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا۔ فعل بنانے کے لئے باب افعال مستعمل ہے۔ اور طاقت کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں: طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت، اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے۔ طاقت کے معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ (بقرہ۔۲۸۶) ''اے ہمارے پروردگار، ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں۔'' جس کی ہم کو طاقت نہیں، کے یہ معنی نہیں کہ جس کی ہم کو وسعت نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالی بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا۔ فرمایا: لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا ۔۔۔ ان وجوہ سے ''وعلی الذین یطیقونہ'' کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں بلکہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔''(۲)

اس تاویل پر کئی اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو لفظ ''اطاقۃ'' کے معنی پر ہے۔ اطاقۃ کے معروف معنی طاقت رکھنے کے ہیں، مشقت سے اس کے اصل معنی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہم آگے چل کر کریں گے۔

اس تاویل پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر آیت کا محمول وہ لوگ ہیں جو دشواری اور تکلیف کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہوں، یعنی سن رسیدہ اور حاملہ و مرضعہ وغیرہ، تو اس صورت میں ''وان تصوموا خیر لکم'' کے کیا معنی ہوں گے؟ جب ایک شخص انتہائی تکلیف اٹھا کر ہی روزہ رکھ سکتا ہو تو پھر اس سے یہ کہنا کہ وہ روزہ رکھ لے تو اس کے حق میں بہتر ہے،

---

(۱) سیرت النبی، ج۵، ص۳۰۴

(۲) ایضاً، ص۳۰۴-۳۰۶

Marfat.com

یقیناً تکلیفِ مالا یطاق ہے اور خدا نے اپنے بندوں کو اس قسم کی زحمت نہیں دی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔ اس لیے یہ تاویل بھی، گو کہ اس کے مؤیدین کی تعداد بہت زیادہ ہے، صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے معنی میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور اہلِ تاویل اس کو رفع نہیں کر سکے ہیں۔

ان تمام دشواریوں کو دیکھ کر علماء کی ایک جماعت نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ اطاقۃ کے معنی تو طاقت رکھنے ہی کے ہیں لیکن آیت کا تعلق عہدِ اسلام کے اوائل سے ہے جب روزہ فرض ہوا تھا۔ چنانچہ شروع میں ان لوگوں کو بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت تھی جو طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھنا چاہیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ آگے چل کر یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔ امام جصاص نے لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین کی اکثریت نے اسی قول کو قبول کیا ہے۔(۱)

بعض ہندی مفسرین نے بھی اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: ''اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہیں تھے۔ پھر ۲ ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں، بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔''(۲)

لیکن اس تاویل کو، جو بعض روایات پر مبنی ہے، قبول کرنے سے معنی میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ اگر ابتدا میں طاقت رکھنے والوں کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ وہ روزہ نہ رکھ کر اس کے عوض ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو پھر یہی رعایت مریض اور مسافر کو کیوں نہیں دی گئی حالانکہ وہ اس کے زیادہ حقدار تھے۔ اس کے علاوہ اگر اس آیت کو منسوخ مان لیا جائے تو

(۱) احکام القرآن، ج ۱، ص ۲۰۷

(۲) تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۴۱

Marfat.com

پھر حاملہ اور مرضعہ وغیرہ کو شریعت میں جو رخصت دی گئی ہے وہ بھی ختم ہو جاتی ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اللہ نے حاملہ اور مرضعہ سے روزہ اتار لیا ہے"(۱)

بخاری میں عطا سے روایت ہے کہ انھوں نے ابن عباسؓ کو "وعلی الذین یطیقو نہٗ ففدیۃ طعام مسکین" پڑھتے ہوئے سنا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں، ان کو چاہیے کہ وہ ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں، قضا ان پر واجب نہ ہوگی۔

ان وجوہ سے ماننا ہوگا کہ یہ تاویل بھی صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم کو دو عالم ایسے ملے ہیں جن کی تاویل سب سے جداگانہ ہے، ایک ابو مسلم اصفہانی اور دوسرے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ اوّل الذکر فرماتے ہیں:

> "یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ فدیہ دیں تو گویا جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہی روزہ رکھیں۔ اصل میں آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ "تم میں سے جو بیمار ہوں یا سفر پر ہوں پس وہ روزے قضا کریں یعنی صحت کے وقت یا سفر ختم ہونے پر روزے رکھ لیں، اور ان میں سے جو مسکین کو کھانا کھلانے کی قدرت رکھتے ہوں وہ فدیہ بھی دیں یعنی دولت مندوں پر روزوں کی قضا کے ساتھ فدیہ بھی لازم کیا گیا۔ اس طرح سوچیے تو یہ آیت محکم اور غیر منسوخ ہے۔"(۲)

یہ تاویل راقم کے نزدیک اس لیے صحیح نہیں ہے کہ مرض اور مسافرت کوئی اختیاری چیز نہیں بلکہ اتفاقی حوادث میں سے ہیں۔ ماہ رمضان میں وہی شخص سفر کرے گا جس کو کوئی ہنگامی ضرورت پیش آ گئی ہو، اس لیے مالدار مریض اور مسافر پر قضا روزوں کے علاوہ فدیہ کو لازم ٹھہرانا زیادتی ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ تاویل "وان تصوموا خیر لکم" سے معنوی مطابقت نہیں رکھتی۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے پہلے تو منقول اقوال کے مطابق "یطیقونہ" کے دو

---

(۱) ترمذی

(۲) مجموعۂ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی ص ۶۵

Marfat.com

ترجمے کیے ہیں۔ ایک ترجمہ اس سے پہلے ''لا'' مقدر مان کر کیا ہے اور وہ یہ ہے: ''وبر آنانکہ نمی توانند روزہ داشتن فدیہ است کہ عبارت از طعام یک مسکین است۔''(۱) دوسرا ترجمہ آیت کو منسوخ مان کر کیا ہے: ''وبر آنانکہ می توانند روزہ داشتن و روزہ نمی دارند فدیہ است کہ عبارت از طعام یک مسکین است۔''(۲)

ان دونوں ترجموں کو تحریر کرنے کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ان میں سے کوئی تاویل بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'لا' کا حذف صرف اسی صورت میں جائز ہے جب اس سے معنی میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہو اور یہاں لا کو محذوف قرار دینے کی صورت میں آیت کے معنی میں اضطراب واقع ہوتا ہے۔(۳)

ان دونوں تاویلات کو رد کرنے کے بعد شاہ صاحب نے بالکل ایک منفرد تاویل پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''جو لوگ فدیہ دینے کی استطاعت رکھتے ہیں ان پر اپنا اور اپنے بچوں اور اپنے مملوک کا فدیہ واجب ہے، اور وہ فدیہ یہ ہے کہ ایک مسکین کو اس کے اہل و عیال سمیت پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا جائے۔ پس یہاں فدیۃ سے مراد صدقۂ فطر ہے جو سال میں ایک بار عید کے موقع پر اپنے اہل خانہ کی طرف سے، جن میں مملوک بھی شامل ہے، دیا جاتا ہے۔''(۴)

شاہ صاحب نے اسی تاویل کو اپنی معروف کتاب ''الفوز الکبیر'' میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''درحقیقت فدیہ سے مراد طعام ہے اور طعام سے مراد صدقۂ فطر ہے۔ اس آیت میں اللہ نے روزوں کے حکم کے بعد صدقۂ فطر کو اسی طرح بیان فرمایا ہے جیسا کہ دوسری آیت: ''فمن شھد منکم الشھر الخ کے بعد تکبیرات عید (ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم) کو۔''(۵)

اس تاویل پر تین اعتراض وارد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ صدقۂ فطر کو فدیہ کیوں کہا

---

(۱) مصفی ج ۱ ص ۲۳۱

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً، ص ۲۳۲

(۵) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۳۳

Marfat.com

گیا، دوسرے یہ کہ اس صورت میں اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے جو ضرورت کے بغیر جائز نہیں، تیسرے یہ کہ فدیہ مؤنث ہے لیکن اس کے لیے مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے۔ پہلے اعتراض کا جواب شاہ صاحب نے یہ دیا ہے کہ ایک سال تک انسان کو زندہ رکھنا خدا کی ایک بڑی نعمت ہے اس لیے شکریہ میں ایک مسکین کو مع اس کے اہل وعیال کے کھانا کھلانا تجویز کیا گیا ہے (۱)

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جب مرجع باعتبارِ مرتبہ مقدم ہو تو اضمار قبل الذکر جائز ہے، جیسے، فی دارہ زید اور ضرب غلامہ عمر (۲)، اور تیسرے اعتراض کا جواب شاہ صاحب نے یہ دیا ہے کہ ضمیر لفظ کے علاوہ کبھی معنی کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور یہاں یہی صورت ہے، یعنی ضمیر طعام کی طرف راجع ہے اس لیے کہ فدیہ طعامِ مسکین ہی ہے۔ اس کی نظیر قرآن مجید کی یہ آیت ہے: وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونہ، اس میں ''بطونہ'' کی ضمیر کو ''انعام'' کی رعایت سے مؤنث ہونا چاہیے تھا لیکن معنی کا اعتبار کر کے مذکر لایا گیا ہے۔ (۳)

شاہ صاحب کی مذکورہ تاویل نہ صرف تاویل بعید ہے بلکہ اس سے مفہومِ آیت کے تعین میں اضطراب رفع نہیں ہوتا بلکہ بڑھ جاتا ہے۔ یعنی آیت ''وان تصوموا خیر لکم'' سے اس تاویل کا معنوی ربط قائم نہیں رہتا ہے۔ اوپر ہم نے آیتِ زیر بحث کی جتنی تاویلیں نقل کی ہیں ان میں سب سے بڑی خرابی یہی معنوی اضطراب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب تاویلیں غلط ہیں تو آیت کی صحیح تاویل کیا ہوگی جس سے کوئی معنوی اضطراب پیدا نہ ہو۔

آیت کی صحیح تاویل تک پہنچنے کے لیے تین اشکالات کا اطمینان بخش حل تلاش کرنا ضروری ہے، ایک ''اطاقہ'' کے صحیح معنی، دوسرے ''یطیقونہ'' کی ضمیر کے مرجع کا تعین اور تیسرے آیت کا ایسا مفہوم جو مابعد کی آیت ''وان تصوموا خیر لکم الخ'' سے پوری طرح معنوی مطابقت رکھتا ہو۔

---

(۱) مصفی، ج ا، ص ۲۳۲

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

Marfat.com

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشیں کرلیں کہ "و علی الذین یطیقونه" میں واؤ عطف کا ہے اس لیے اس فقرے کا تعلق لازماً ماقبل والے فقرے یعنی "و ان کنتم مریضاً او علیٰ سفر" سے ہوگا۔ اس ایک بات کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بہت سے اشکالات پیدا ہوئے ہیں۔

اس وضاحت کے بعد اب پہلے اشکال کو لیں۔ راقم کے خیال میں "اطاقة" کا لفظ آیتِ زیرِ بحث میں اپنے معروف معنی ہی میں استعمال ہوا ہے، یعنی طاقت رکھنے کے معنی میں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں یہ کام کرنے کی طاقت رکھتا ہوں تو اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اس کام کو کرسکتا ہے خواہ اس کی انجام دہی میں اس کو تھوڑی بہت مشقت ہی اٹھانی پڑے۔ آخر دنیا میں وہ کون سا کام ہے جس کے کرنے میں کم و بیش مشقت اٹھانی نہیں پڑتی۔ کام کی نوعیت کے اعتبار سے اس میں فرق ہوسکتا ہے لیکن سرے سے اس میں کوئی مشقت اٹھانی نہ پڑے یہ ممکن نہیں ہے۔ عبادات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہر عبادت میں تھوڑی بہت مشقت انگیز کرنی پڑتی ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ عبادت ساقط نہیں ہوجاتی۔ نماز کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اگر بیٹھ کر پڑھنا ممکن نہ ہو تو لیٹ کر پڑھی جائے۔ پھر روزہ کی مشقت تو بالکل واضح ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھیں کہ اگر قرآن کا یہی مقصد تھا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی بمشکل طاقت رکھتے ہوں تو اس کے لیے عربی زبان میں بہت سے الفاظ و اسالیب موجود تھے ان سب کو چھوڑ کر ایک ایسا لفظ کیوں استعمال کیا گیا جس کے معروف معنی سے عدول کے بغیر آیت کا صحیح مفہوم متعین نہ ہوسکے۔ قرآن نے احکام کے بیان میں قطعی الدلالت الفاظ و اسالیب ہی استعمال کیے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آیتِ صیام کو اس کلیہ سے الگ رکھا جائے۔

قرآن مجید میں طاقت کا لفظ ایک سے زیادہ سورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے مواقعِ استعمال پر ایک نظر ڈال لیں تو بات واضح ہوجائے گی۔ سورہ بقرہ کی آیت ہے "و لا تحملنا مالا طاقة لنا به" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر وہ ذمہ داری نہ ڈال جو ہماری

Marfat.com

برداشت سے باہر ہو اور مشقت کے باوجود جس کو ہم ادا نہ کر سکیں۔ اسی سورہ میں دوسری جگہ فرمایا ہے" لا طاقة لنا اليوم بجالوت وجنوده "اس کا مفہوم یہ ہے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے یعنی اگر ہم دقت اٹھا کر ان سے لڑ جائیں تو بھی ان کو شکست نہیں دے سکتے ہیں بلکہ الٹا شکست کھا جائیں گے۔

اطاقہ کے معنی میں مشقت کا مفہوم شامل کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ "وان تصوموا خیر لکم الخ" کا جملہ ہے۔ جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکتے ہوں ان سے کہنا کہ وہ روزہ رکھ لیں تو بہتر ہے ایک بالکل بے تکی بات ہوگی، اور خدا کی شریعت اس سے بری ہے۔ ماننا ہوگا کہ "اطاقہ" کا لفظ طاقت رکھنے کے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔

دوسرا اشکال "یطیقونه" کی ضمیر کا ہے۔ اکثر مفسرین نے اس کا مرجع صوم کو مانا ہے اور اس بنا پر آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کا صحیح مرجع طعامِ مسکین ہے۔ بلاغتِ کلام کا اقتضا تھا کہ ایک جگہ طعام مسکین کے الفاظ حذف کر دیے جائیں۔

اس توجیہ کے قبول کرنے میں صرف ایک دشواری ہے اور وہ اضمار قبل الذکر ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس اسلوب کی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا امین اصلاحی نے لکھا ہے کہ: "اضمار قبل الذکر کلام کا عیب ہے لیکن یہ عیب اس شکل میں ہے جب ضمیر کا مرجع متکلم کی نیت میں مقدم نہ ہو اور وہ اس کے لیے ضمیر لائے۔ لیکن اگر مرجع متکلم کی نیت میں مقدم ہو اور محض تکرار سے بچنے کے لیے یا بلاغت کے کسی اور تقاضے کے تحت وہ مرجع کو مؤخر کرنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں اضمار قبل الذکر نہ صرف یہ کہ عیب نہیں ہے بلکہ کلام کی ایک خوبی ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ضمیر بھی جس کو اہل نحو ضمیرِ شان کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اسی نوعیت کی چیز ہے۔ اس میں بھی متکلم ضمیر کو درحقیقت اس مرجع کے لیے لاتا ہے جو اس کے مافی الضمیر میں مضمر ہوتا ہے"(۱)

اگر ہم ضمیر کا مرجع طعامِ مسکین کے بجائے فدیہ کو مانیں تو اس میں بھی کوئی نحوی

---

(۱) تدبر قرآن، ج ۱، ص ۴۴۹

Marfat.com

دشواری نہیں ہے بلکہ راقم کے نزدیک یہی راجح ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ فدیہ مؤنث ہے، اس کی ضمیر مذکر کیونکر ہوسکتی ہے۔ لیکن یہاں لفظ کے بجائے معنی کا اعتبار کر کے ضمیر لائی گئی ہے اور وہ معنی طعام ہے کہ فدیہ طعامِ مسکین ہی ہے اِس کی نظیر قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ''وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونہ'' اس آیت میں ''بطونہ'' کی ضمیر کا مرجع ''انعام'' ہے لیکن معنی کا لحاظ کر کے مؤنث کے بجائے مذکر ضمیر لائی گئی ہے(۱) بہرحال فدیہ اور طعامِ مسکین میں سے جس لفظ کو بھی ''یطیقونہ'' کی ضمیر کا مرجع قرار دیں اس قدر واضح ہوگیا کہ بوقت ضرورت اضمار قبل الذکر جائز ہے۔

ان دو اشکالات کے رفع ہونے کے بعد تیسرا اشکال، جس کا تعلق '' وان تصوموا خیر لکم الخ'' سے ہے، خود بخود رفع جاتا ہے۔ مریض اور مسافر کو دو رعایتیں دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مرض اور مسافرت کی حالت میں روزے نہ رکھ کر ان کی قضا کریں، اور دوسری رعایت یہ ہے کہ اگر مریض اور مسافر عذر رفع ہونے کے باوجود قضا روزے نہ رکھنا چاہیں تو ان کے بدلے ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ لیکن افضل یہی ہے کہ وہ فدیہ کی رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے قضا شدہ روزے رکھ لیں کہ فدیہ کی صورت میں روزہ کا جو اصل مقصد ہے یعنی تزکیۂ نفس وہ حاصل نہ ہوگا۔ ''وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون'' کا یہی مطلب ہے۔

یہاں ملحوظ رہے کہ آگے چل کر پہلی رعایت (فعدۃ من ایام اخر) کا دوبارہ ذکر کیا گیا لیکن دوسری رعایت (و علی الذین یطیقونہ) کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے بعض اہل علم کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ دوسری رعایت منسوخ ہوگئی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''قرآن کے الفاظ سے اس کی اصل شکل یہ سامنے آتی ہے کہ جو لوگ بیماری کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں رکھ سکتے تھے ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ یا تو روزے رکھ کر ان چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کریں یا ایک روزے

(۱) دیکھیں، مصفّی، ج ۱، ص ۲۳۲

Marfat.com

کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدلہ پورا کر دیں۔ گویا اس وقت تک قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر بھی ہو سکتی تھی۔ بعد میں یہ اجازت جیسا کہ آگے والی آیت سے واضح ہو گا، منسوخ ہو گئی، یعنی قضا شدہ روزوں کی جگہ بھی روزے رکھنا ہی ضروری قرار دیا گیا۔''(۱)

لیکن دوسری رعایت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ دوسری جگہ اس رعایت کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا تا کہ مریض اور مسافر پر یہ بات واضح ہو جائے کہ فدیہ کے مقابلے میں قضا شدہ روزے رکھنا ان کے حق میں زیادہ مفید ہے۔ اگر اس رعایت کو منسوخ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا ہو گا کہ نبی ﷺ نے حاملہ اور مرضعہ کو روزے چھوڑنے کی جو اجازت دی ہے (۲) وہ بھی منسوخ ہو گئی، اس کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ اس آیت کو منسوخ نہیں سمجھتے تھے، اس لئے ماننا ہو گا کہ فدیہ کی رعایت دائمی ہے، وہ منسوخ نہیں ہوئی ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں فدیہ کی رعایت تو صرف مریض اور مسافر کو دی گئی ہے، ان کے علاوہ جو معذورین ہیں، مثلاً بوڑھے لوگ اور حاملہ اور مرضعہ جن کا ذکر حدیث میں آیا ہے، ان کے لیے فدیہ کی اجازت کا ماخذ قرآن کی کون سی آیت ہے؟ اکثر علماء وفقہاء نے اس کا ماخذ ''وعلی الذین یطیقونہ'' کو مانا ہے اور ''اطاقة'' کے معنی بدقت کسی کام کے کرنے کے لیے ہیں لیکن اس تاویل کی غلطی ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

راقم کے نزدیک اس رعایت کا ماخذ آیت ''وان کنتم مرضا الخ'' ہے۔ اگر کوئی حاملہ روزہ رکھتی ہے تو اندیشہ ہے کہ دن بھر فاقہ کی وجہ سے بطنِ مادر میں بچہ کی نشو ونما میں خلل پڑے یا عورت کو کوئی بیماری لاحق ہو جائے۔ یہی معاملہ رضاعت کا ہے۔ اس میں بھی بچے کو تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ بوڑھے لوگوں کو روزے کی حالت میں جو ضرر پہنچ سکتا ہے وہ بالکل واضح

---

(۱) تدبر قرآن، ج ۱، ص ۴۴۹، ۴۵۰

(۲) ترمذی

Marfat.com

ہے۔ پیرانہ سالی بجائے خود ایک مرض بلکہ سرتاپا مرض ہے، جس طرح بیماری کی حالت میں مریض کے قویٰ بدنی کمزور ہو جاتے ہیں اسی طرح بڑھاپے میں بھی قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آجاتا ہے اور جسم پر ناتوانی کا غلبہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تشریح کے مطابق معذور الصوم دو طرح کے ہوئے۔ ایک وہ لوگ جن کا عذر وقتی ہوتا ہے، مثلاً عام مریض اور مسافر اور حاملہ اور مرضعہ۔ ان لوگوں کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ اپنے روزے مؤخر کر سکتے ہیں اور عذر رفع ہونے کے بعد قضا شدہ روزے رکھ لیں، یہی افضل ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے روزے نہ رکھنا چاہیں تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ امام مالک کا بیان ہے کہ عبداللہ ابن عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ حاملہ عورت اپنے حمل کا خوف کرے اور روزہ نہ رکھ سکے تو کیا کرے؟ کہا، وہ روزہ نہ رکھے اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو ایک مد گیہوں دے، رسول اللہ کے مد سے (یعنی چار صاع) (۱)

البتہ جن لوگوں کا عذر دائمی ہے، مثلاً مزمن امراض میں مبتلا اور کافی عمر رسیدہ لوگ وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ امام مالک کا بیان ہے کہ انس بن مالک بوڑھے ہو گئے تو روزہ نہ رکھ کر فدیہ دیتے تھے (یعنی ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلانا) (۲)۔

نفلی صوم

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے ہیں، مثلاً یوم عاشورہ کا روزہ، شوال کے چھ روزے، ایام بیض کے روزے، عشرۂ ذی الحجہ کے روزے اور پندرہویں شعبان کا روزہ۔ حضرت عبداللہ ابن عباس بیان فرماتے ہیں کہ عاشورہ کے دن روزہ رکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات میں تھا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا ہے (۳) یوم عاشورہ کا روزہ پہلے فرض تھا لیکن رمضان کے روزوں کے فرض ہونے کے

---

(۱) مؤطا، باب: فدیة من افطر فی رمضان

(۲) ایضاً

(۳) صحیح مسلم، ج ۱، ص ۳۵۸

Marfat.com

بعد وہ نفل ہو گیا(۱)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد ماہ شوال میں چھ نفلی روزے رکھے تو گویا کہ اس نے ہمیشہ روزہ رکھا (۲) حضرت قتادہ بن ملحانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ہم لوگوں کو ایامِ بیض، یعنی مہینہ کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں کو روزہ رکھنے کی تاکید فرماتے تھے کہ ان دنوں میں روزہ رکھنا باعثِ اجروثواب ہے اور ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہے ۔(۳)

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوسرے دنوں کے مقابلے میں عشرۂ ذی الحجہ (یکم ذی الحجہ سے نویں ذی الحجہ یعنی یوم عرفہ تک) میں عبادت کرنا اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔اس عشرہ کے ہر دن کا روزہ سال بھر کے روزے کے برابر ہے(۴)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شعبان کی پندرہویں کو دن میں روزہ رکھو اور رات میں نوافل پڑھو کہ اس رات میں اللہ کی رحمت بندوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے ۔(۵)

سفر میں صوم

قرآن مجید میں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مسافر کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ حالت سفر میں روزہ نہ رکھے اور بعد میں اس کی قضا کر لے ۔(سورہ بقرہ ـ۱۸۴) چنانچہ ایک بار عروہ بن زبیرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے حالت سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: ان شئت فصم وان شئت فافطر (۶) ''تمہارا جی چاہے تو روزہ رکھو اور جی

---

(۱) صحیح مسلم، ج ۱، ص ۳۵۸

(۲) ایضاً (مزید دیکھیں مؤطا، باب: صیام یوم عاشورہ، راوی حضرت عائشہؓ)

(۳) سنن ابی داؤد، نسائی

(۴) جامع ترمذی

(۵) سنن ابن ماجہ

(۶) مؤطا، باب: ماجاء فی الصیام فی السفر

Marfat.com

چاہے تو نہ رکھو'

معلوم ہوا کہ مسافر کو حالت سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے دونوں کی اجازت ہے۔
انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان میں سفر کیا تو روزہ رکھنے والوں نے نہ تو بے روزہ داروں پر نکتہ چینی کی اور نہ ہی بے روزہ داروں نے روزہ داروں میں کوئی عیب نکالا (۱)

ہشام بن عروہؒ بیان کرتے ہیں کہ ہم رمضان میں عروہ بن زبیرؒ کے ساتھ سفر میں تھے اور روزے سے نہیں تھے اور عروہ روزے سے تھے' لیکن انہوں نے ہم کو روزہ رکھنے کا حکم نہیں دیا۔(۲) عبداللہ ابن عمر سفر میں روزہ نہیں رکھتے تھے۔(۳)

اعتکاف

اعتکاف کے معنی اپنے آپ کو کسی چیز سے روک لینے یا کسی چیز پر جما دینے کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ماہ صیام کے آخری دس دنوں میں مسجد میں گوشہ نشین ہو کر دل کی کامل یکسوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول ہونا ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہوا ہے: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ (سورۃ بقرہ۔۱۸۷) ''اور تم بیویوں سے مباشرت نہ کرو جب کہ تم مسجد میں معتکف ہو''

اعتکاف کے لیے رمضان کا مہینہ مخصوص ہے اور یہ ضروری ہے کہ اعتکاف کسی مسجد میں ہو۔ نبی ﷺ کے عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ صحیح احادیث میں منقول ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں آپ ﷺ کے لیے مسجد کا ایک گوشہ مخصوص کر دیا جاتا تھا اور آپ رمضان کی بیسویں تاریخ کو نماز فجر پڑھ کر اس میں معتکف ہو جاتے اور عید کا چاند دیکھ کر وہاں سے باہر آتے تھے۔

حالت اعتکاف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ضروری حاجت کے لیے باہر نکلتے

---

(۱) مؤطا، باب: ما جاء فی الصیام فی السفر
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً

Marfat.com

تھے۔حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف میں ہوتے تھے تو اپنا سر میری طرف جھکا دیتے اور میں اس میں کنگھی کر دیتی، اور آپ صرف ضروری حاجت کے لیے ہی گھر میں آتے تھے(۱)

حالت اعتکاف میں درج ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے:

۱۔کثرت سے ذکر اور نوافل کا اہتمام ہو

۲۔کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت کی جائے اور اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ سمجھ کر پڑھا جائے۔

۳۔لایعنی باتوں سے پرہیز کیا جائے۔جب مسجد میں ایک سے زیادہ لوگ معتکف ہوں تو گپ شپ سے اجتناب ضروری ہے، البتہ باہم وعظ و نصیحت ممنوع نہیں ہے۔

۴۔فطری حاجات، مثلاً پیشاب پاخانہ وغیرہ کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لیے مسجد سے نہ نکلے حتی کہ مریض کی عیادت اور نماز جنازہ میں بھی شرکت نہ کرے۔(۲)

یہ سب پابندیاں صرف اس لیے ہیں کہ اعتکاف میں جو کامل یکسوئی مطلوب ہے اس میں خلل نہ پڑے۔آج کل مسلمانوں میں جس قسم کا اعتکاف رائج ہے وہ محض رسمی ہے۔

شب قدر

قرآن مجید کا نزول رمضان کی جس مبارک رات میں ہوا وہ لیلۃ القدر (شب قدر) ہے۔قرآن کی ایک سورہ اسی نام سے موسوم ہے۔یہ ہزار رات سے بہتر، سراسر سلامتی کی رات ہے، اس میں نظم عالم کے متعلق اہم فیصلے کیے جاتے ہیں۔اس بنا پر اس رات کی بڑی اہمیت ہے۔

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرے کی کوئی رات ہے۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کی

(۱) مؤطا، کتاب الاعتکاف، باب: ذکر الاعتکاف، حدیث کے الفاظ ھیں: لا یدخل البیت الا لحاجۃ الانسان۔

(۲) سنن ابی داؤد

Marfat.com

آخری دس راتوں میں تلاش کرو۔(۱) ٹھیک اسی مضمون کی ایک روایت عروہ بن زبیرؓ سے بھی مروی ہے(۲) لیکن عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ شب قدر رمضان کی آخری سات راتوں میں ہے۔(۳) ایک روایت کے مطابق آخری طاق راتوں، یعنی اکیسویں، تئیسویں، پچیسویں، ستائیسویں میں سے کوئی ایک رات ہے۔(۴) بعض اہل علم کا خیال ہے کہ وہ رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔بہرحال کسی خاص رات کا تعین مشکل ہے۔

آج کل اکثر مسلمان شب قدر کی مخصوص راتوں (۲۱،۲۳،۲۵،۲۷،۲۹) اور بالخصوص ستائیسویں شب میں عبادت اور قرآن کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ بجائے خود یہ بات غلط نہیں ہے لیکن صرف انہی راتوں میں ذکر و تلاوت کا اہتمام کرنا اور رمضان کے بقیہ ایام میں اس سے یکسر غفلت برتنا غیر ایمانی رویہ ہے۔شریعت کا منشا یہ ہے کہ رمضان کے آخری دس دنوں بالخصوص اس کی طاق راتوں میں ذکر و عبادت میں اضافہ ہو تاکہ پچھلے دنوں میں اگر عبادت میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو وہ پوری ہو جائے۔

بہت سے مسلمان ستائیسویں کی شب میں اپنے آباواجداد کی قبروں پر جاتے ہیں اور وہاں فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اسی شب میں پٹاخے وغیرہ بھی چھوڑے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں جاہلانہ اور غیر شرعی ہیں۔ بعض جاہل مسلمان سمجھتے ہیں کہ سورہ لیلۃ القدر میں جس روح کا ذکر ہے اس سے مراد مردوں کی روحیں ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔ آیت میں روح سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ اس سے پہلے ملائکہ کا ذکر ہے۔ ان کا علیحدہ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

تراویح

تراویح، ترویحہ کی جمع ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں، آرام لینے کے لیے تھوڑی دیر

---

(۱) صحیح بخاری، موصولاً

(۲) موطا، باب: ماجاء فی لیلۃ القدر

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

Marfat.com

تک بیٹھنا۔ اصطلاحاً اس سے مراد وہ نماز ہے جو ماہِ صیام میں عشاء کی نماز کے بعد باجماعت ادا کی جاتی ہے۔

نماز تراویح کا آغاز کس طرح ہوا، اس سلسلے میں ایک روایت تو بخاری میں ہے جس کے راوی ابن شہاب ہیں، جو عروہؓ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار رات گئے گھر سے نکلے اور مسجد میں آکر نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت بھی شریک نماز تھی۔ جب صبح ہوئی تو صحابہ نے آپس میں اس کے متعلق گفتگو شروع کی۔ چنانچہ (دوسرے روزے) جب آپ نے نماز پڑھی تو سب نے آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر صبح ہوئی اور اس نماز کا خوب چرچا ہوا۔ تیسرے روز نمازیوں کا اژدحام کافی بڑھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ حجرے سے باہر تشریف لائے اور نماز ادا کی اور سب نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب چوتھی شب آئی تو نمازیوں کی کثرت سے مسجد تنگ ہوگئی لیکن رسول اللہ ﷺ باہر تشریف نہیں لائے۔ نماز فجر کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا، تم لوگوں کی موجودگی مجھ سے پوشیدہ نہ تھی لیکن میں ڈرا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کردی جائے پھر تم اس سے عاجز آجاؤ۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی اور معاملہ اسی طرح رہا۔(۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے رمضان کی تین راتوں میں نماز تراویح پڑھی اور صحابہ نے بھی آپ کی امامت میں یہ نماز ادا کی۔ لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کون سی تین راتیں تھیں۔ حضرت ابو ذرؓ کی روایت سے ان راتوں کا تعین ہوجاتا ہے۔

جبیر بن نفیر حضرت ابو ذر غفاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھا۔ اس مہینہ میں آپ نے ہمیں رات میں کوئی نماز نہیں پڑھائی جب سات دن باقی رہ گئے تو (تیئسویں رات میں) آپ نے نماز پڑھائی یہاں تک کہ تہائی

(۱) صحیح بخاری، ج۱، ص ۱۲۶، ۱۵۲، ۲۶۹، مزید دیکھیں، مؤطا، باب: الترغیب فی الصلوٰۃ فی رمضان، صحیح مسلم، ج۱، ص ۲۵۹

Marfat.com

رات گزر گئی۔ جب چھ دن رہ گئے تو نماز نہیں پڑھائی (یعنی چوبیسویں رات میں) پھر جب پانچ دن رہ گئے تو نماز پڑھائی (یعنی پچیسویں رات میں) یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی۔ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ، کاش ان راتوں کا قیام آپ ہمارے لیے بطور نفل متعین کر دیتے، آپ نے فرمایا، جب کوئی شخص امام کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھے پھر گھر واپس جائے تو وہ پوری رات نماز پڑھنے والا شمار کیا جائے گا۔ جب چار دن باقی رہ گئے تو آپ نے نماز نہیں پڑھائی (یعنی چھبیسویں شب میں)، جب تین دن باقی رہ گئے تو آپ نے گھر والوں، عورتوں اور لوگوں کو جمع کیا اور نماز پڑھائی (یعنی ستائیسویں رات میں) اور یہ نماز اتنی طویل تھی کہ ہمیں خوف ہوا کہ ہم سے ''فلاح'' فوت ہو جائے گی (حتی خشینا ان یفوتنا الفلاح)۔ جبیر بن نفیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا، فلاح کے فوت ہونے کا کیا مطلب ہے (ماالفلاح)؟ فرمایا، سحری (قال السحور)۔ پھر بقیہ ایام میں حضور ﷺ نے نماز نہیں پڑھائی۔(۱)

اس روایت سے تراویح کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے رمضان کی تین مختلف راتوں میں یہ نماز پڑھائی۔ ملحوظ رہے کہ شب قدر، جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے، انہی تین راتوں میں سے کسی ایک رات میں ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستائیسویں شب ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس رات میں، جیسا کہ اوپر کی روایت میں مذکور ہے، نہایت طویل نماز پڑھائی۔ اس روایت کی بنیاد پر راقم کا خیال ہے کہ نماز تراویح دراصل رمضان کے آخری عشرہ بالخصوص اس کی طاق راتوں میں نفلی قیامِ لیل ہے روایت میں ہے کہ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو اس موقع پر رسول اللہ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا:

جعل اللّٰہ صیامہ فریضۃ و قیام لیلہ تطوعاً(۲)

''اللہ نے رمضان کا روزہ فرض کیا اور اس کی رات کی نماز کو نفل قرار دیا۔''

---

(۱) ابوداؤد، ج۱، ص۲۱۱، ترمذی، ج۱، ص۹۹، ابن ماجہ ص۹۵، نسائی ج۱، ص۲۳۸

(۲) بخاری، ج۱، ص۲۶۹

Marfat.com

عہدِ رسالت اور دورِ خلافت میں صحابہ نے اس نماز کو ہمیشہ نفل نماز کے طور پر ادا کیا، اور یہ نماز متفرق طور پر مسجد نبوی میں ادا کی جاتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں اس نماز کو نماز باجماعت کی شکل دی۔ (۱)

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ نماز تراویح دراصل نماز تہجد ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ نے یہ نماز آٹھ رکعتوں کے ساتھ ادا کی تھی اور رمضان اور غیر رمضان دونوں میں ہمیشہ آپ کا یہی معمول تھا جیسا کہ درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے:

> ''ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کیسی تھی (کیف کانت صلوۃ رسول اللہ) فرمایا، آپ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ پہلے چار رکعت پڑھتے، کچھ نہ پوچھو کہ کتنی طویل اور حسین ہوتی تھیں (فلاتسئل عن حسنھن وطولھن) پھر چار رکعت پڑھتے، کچھ نہ پوچھو کتنی طویل اور حسین ہوتی تھیں۔ پھر تین رکعت (وتر) پڑھتے (ثم یصلی ثلاثا) (۲)

یہ خیال اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کہ تراویح کی نماز دو دو رکعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے لیکن روایت میں چار رکعتوں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ تہجد کی نماز رات کے آخری حصے میں جماعت کے بجائے انفرادی طور پر ادا کی جاتی ہے۔ لیکن رسول اللہ نے تراویح کی نماز اوّل شب میں شروع کی جیسا کہ ابوذرؓ کی روایت میں بیان ہوا۔ غالباً انہی وجوہ سے حضرت عائشہؓ سے مروی روایت کو تمام محدثین نے رمضان کے بجائے تہجد کے ابواب میں نقل کیا ہے (۳) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت کا تعلق تہجد کی نماز سے ہے نہ کہ تراویح سے۔

جہاں تک نماز تراویح کی رکعتوں کی تعداد کا تعلق ہے تو اس میں اختلاف ہے۔ اہلِ حدیث کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہ نے یہ نماز آٹھ رکعتوں کے ساتھ پڑھی تھی جیسا کہ حضرت

---

(۱) مؤطا، باب: ما جاء فی قیام رمضان، مزید دیکھیں، ابن ماجہ، ص ۹۵

(۲) بخاری، ج ۱، ص ۱۵۴، مسلم، ج ۱، ص ۲۵۴

(۳) دیکھیں، مسلم ج ۱ ص ۲۵۴، ترمذی ج ۱ ص ۵۸، نسائی ج ۱ ص ۱۵۴، ابوداؤد ج ۱ ص ۱۹۶

Marfat.com

جابر بن عبداللہ سے مروی ہے:

صلّی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی رمضان ثمان رکعات والوتر (۱)

''رسول اللہ نے ہمیں رمضان المبارک میں آٹھ رکعتیں اور وتر پڑھائی''

اس سلسلے میں سائب بن یزیدؓ کی روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ: ''حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو گیارہ رکعتوں کے ساتھ (آٹھ تراویح، تین وتر) نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ امام ایک ایک رکعت میں سوسو آیتیں پڑھتا تھا یہاں تک کہ ہم لکڑی پر سہارا لگا لیتے تھے (**حتی کنا نعتمد علی العصی من طول القیام**) اور فجر کے قریب نماز سے فارغ ہوتے تھے۔'' (۲)

بعض روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ نے آٹھ کے بجائے بیس رکعتیں پڑھی تھیں (۳) لیکن اس سلسلۂ سند میں ایک راوی یعنی ابراہیم بن عثمان کو بعض علماء حدیث نے ضعیف کہا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے کسی قول وفعل سے صحیح سند کے ساتھ منقول نہیں کہ آپ نے تراویح میں کتنی رکعتیں پڑھی تھیں، بیس یا اس سے کم۔ (۴) لیکن اتنی بات ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں بیس رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ (۵) اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''قیام رمضان (تراویح) کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عدد متعین نہیں کیا

---

(۱) صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، معجم صغیر، بعض علماء حدیث کے نزدیک اس کے راوی عیسیٰ بن جاریہ قابل حجت نہیں (دیکھیں، میزان الاعتدال، علامہ ذہبی، ج ۲، ص ۱۳۱)

(۲) موطا، باب: ماجاء فی قیام رمضان

(۳) ابن ابی شیبہ، ج ۳ ص ۳۹۴؛ بیہقی ج ۲، ص ۴۹۶، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۳، ص ۱۴۸

(۴) شرح منہاج، علامہ سبکی شافعیؒ، بحوالہ تحفۃ الاخیار ص ۱۹۴، مزید دیکھیں، مصابیح، امام سیوطی، ص ۴۲ نیل الاوطار، علامہ شوکانی ج ۳ ص ۵۳، بذل المجہود، ج ۲، ص ۳۰۴

(۵) موطا، باب ماجاء فی قیام رمضان، بیہقی، ج ۲، ص ۴۹۶، لیکن موطا کے اسی باب میں ایک روایت گیارہ رکعت کی بھی ہے اور اوپر نقل ہو چکی ہے۔

Marfat.com

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں تیرہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور یہ رکعتیں لمبی ہوتی تھیں۔ پس جب حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ کی امامت میں سب لوگوں کو جمع کر دیا تو وہ بیس رکعتیں پڑھاتے تھے۔ پھر تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔''(۱)

ان کے مجموعۂ فتاویٰ میں بھی یہی بات مذکور ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب لوگوں کو رمضان المبارک میں بیس رکعات تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔ لہذا بہت سارے علماء اسی کو سنت قرار دیتے ہیں، کیونکہ ابی بن کعب نے انصار و مہاجرین کی موجودگی میں بیس رکعت پڑھائی اور کسی نے انکار نہیں کیا۔''(۲)

بہر حال اس گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ تراویح کی تعدادِ رکعات غیر معیّن ہے۔ جو شخص آٹھ رکعت پڑھتا ہے وہ بھی صحیح اور جو بیس رکعت ادا کرتا ہے وہ بھی صحیح ہے۔ اس معاملے میں اختلاف و نزاع کم نظری کی دلیل ہے۔ اصل چیز جس پر توجہ کی ضرورت ہے وہ اخلاص اور خشوع ہے۔

نمازِ تراویح کی شرعی حیثیت

ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آخری عشرہ کی ستائیسویں شب کے بعد نماز تراویح باجماعت ادا نہیں کی اور فجر کی نماز کے بعد صحابہ سے فرمایا کہ میں نے اس خوف سے نماز نہیں پڑھی کہ کہیں یہ تم پر فرض ہو جائے اور پھر تم اس کو ادا نہ کر سکو۔ نسائی کے الفاظ ہیں:

خشیت ان تکتب علیکم و لو کتب علیکم ماقمتم به

''مجھے خوف ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض ہو جائے اور پھر تم اس کو ادا نہ کر سکو۔''

معلوم ہوا کہ نماز تراویح فرض نہیں ہے، یہ واجب بھی نہیں کہ رسول اللہ نے تین

---

(۱) مرقات، ج ۲، ص ۱۷۵

(۲) فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲۳، ص ۱۱۲

Marfat.com

شب کے بعد اسے ادا نہیں کیا البتہ پڑھنے سے منع بھی نہیں کیا، اس لیے ماننا ہوگا کہ نماز تراویح کا شمار نفل نمازوں میں ہے۔ جو شخص پڑھتا ہے وہ خدا کے نزدیک مستحقِ اجر ہوگا، لیکن جو شخص نہیں پڑھتا وہ گنہگار بھی نہ ہوگا کہ نوافل کا ترک گناہ نہیں ہے۔ جن علماء نے اس کو سنتِ موٴکدہ کہا ہے اور اس کے ترک کو گناہ بتایا ہے انھوں نے غلو سے کام لیا ہے۔ اسی طرح علماء کا یہ خیال بھی از قسم غلو ہے کہ تراویح با جماعت سنتِ موکّدہ علی الکفایہ ہے۔ بہتر ہے کہ نمازِ تراویح جماعت سے ادا کی جائے لیکن اگر جماعت سے ادا کرنے میں کوئی دشواری ہو تو پھر انفرادی طور سے پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ وہ نفل نماز ہے اور نفل نماز کے لیے جماعت کا التزام ضروری نہیں ہے۔

تراویح کی موجودہ صورت

آج کل ہر شہر اور قصبہ حتیٰ کہ دیہاتوں میں بھی نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ بعض شہروں میں ''شبینہ'' کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ قرآن سننے اور سنانے کے اس عمل کو بھلا کون مسلمان ہوگا جو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھے گا اور روزہ داروں کے شوقِ عبادت اور ان کے قیامِ لیل کی تحسین نہ کرے گا۔ لیکن جس طریقے سے یہ نماز پڑھی جاتی ہے اس سے صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں اخلاص کا عنصر نہایت قلیل ہے۔

جو لوگ نماز تراویح میں قرآن سناتے ہیں یعنی حفاظِ کرام وہ یہ کام اس لیے نہیں کرتے کہ اس سے ان کے نفس کا تزکیہ ہوگا اور روز آخرت خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی بلکہ اجرت کی خاطر یہ کام کرتے ہیں۔ گویا وہ قرآن کی تجارت کرتے ہیں، اور جو لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں وہ اس کو نیکی کا کام سمجھ کر نادانی کے باعث ان کی مدد کرتے ہیں۔ قرآن میں اس طرز عمل کی مذمّت کی گئی ہے:

"وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ"

(سورہ بقرہ۔ ۴۱)

''اور میری آیات کو چند سکوں کے عوض نہ بیچو، اور مجھ ہی سے ڈرو۔''

Marfat.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو خبردار کیا ہے کہ جس نے قرآن کا علم حاصل کیا اور اسے دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا تو وہ روز قیامت اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے بدن پر گوشت نہ ہوگا، صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں ہوں گی۔(۱) لیکن حفاظ نے قرآن مجید کی مذکورہ تنبیہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بالکل بھلا دیا ہے اور قرآن خوانی کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔

اس دنیا پرستی میں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ قرآن کس طرح پڑھا جائے۔ کہا گیا ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (سورہ مزمل۔۴) ''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔'' لیکن وہ اس سرعت کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں کہ الفاظ تک صاف سنائی نہیں دیتے۔ بعض حفاظ تو اس قدر عجلت دکھاتے ہیں کہ صرف الفاظ کی گونج سنائی دیتی ہے اور مقتدی یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ قرآن کی تلاوت میں ترتیل کی جو اہمیت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بالکل واضح ہے۔ فرمایا: ''جو شخص خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔''(۲)

قرآن سنا کر اس کا معاوضہ لینا قرآن اور اس عبادت دونوں کی توہین ہے۔ عمران بن حصینؓ ایک قاری کے پاس سے گذرے جو قرآن پڑھ رہا تھا۔ جب وہ تلاوت سے فارغ ہوا تو لوگوں سے سوال کرنے لگا۔ انھوں نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

انّ اناسا یقرأون القران یسألون بهن الناس، فاقرؤا القرآن و سالوا به اللّٰه عزّو جلّ۔

''کچھ لوگ قرآن پڑھیں گے اور اس کے بدلے لوگوں سے سوالی ہوں گے۔ قرآن مجید پڑھو اور اللہ سے مانگو۔''

حفاظِ قرآن خود بھی سوچیں کہ کیا روزی کمانے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے اور کیا

---

(۱) صحیح مسلم، دارمی

(۲) صحیح بخاری، دارمی

Marfat.com

قرآن سنا کر اس سے حاصل کی گئی اجرت ان کے سال بھر کے اخراجات کے لیے کافی ہوگی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر ماہ صیام میں قرآن خوانی کو ذریعۂ آمدنی بنانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ خدا کی زمین وسیع ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ وہ ڈھونڈنے والے کو رزق دے گا۔ فرمایا ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ط

(سورہ جمعہ۔ ۱۰)

"جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو۔"

بہر حال، اگر حفاظ نماز تراویح پڑھانے کے لیے معاوضہ کے طالب ہوں، خواہ بالا علان اور خواہ بالاخفاء، تو جائز نہیں ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔ بہتر یہ ہے کہ "الم تر" سے پڑھ لی جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر انفرادی طور پر تراویح پڑھنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔ ابتدا میں وہ انفرادی طور پر ہی پڑھی جاتی تھی۔

آج کل ماہ صیام میں "شبینہ" کا بھی رواج ہے، جس میں ایک رات میں قرآن ختم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بدعت ہے اور اس سے احتراز لازمی ہے۔ شبینہ میں حفاظ اور نمازی دونوں جس طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ قرآن کے ساتھ کھلا ہوا کھلواڑ ہے۔ خدا مسلمانوں کے حال پر رحم کرے۔

سحری اور افطار

یہودیوں میں سحری کا رواج نہیں ہے۔ رات میں ایک بار سونے سے پہلے جو کچھ کھا لیتے ہیں اس کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کھاتے۔ اسی طرح افطار میں تاخیر ان کے یہاں مستحسن ہے۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو اہل کتاب کے برعکس سحری کھانے کی ترغیب دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تسحرو افانّ فی السحور برکة (۱)

"سحری کھالیا کرو کہ اس میں برکت ہے۔"

(۱) بخاری، ج ۴، ص ۱۲۰

Marfat.com

ایک دوسری روایت میں ہے:

ان اللّٰہ و ملائکته یصلون علی المستحرین (۱)

''اللہ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں پر دعائے رحمت بھیجتے ہیں۔''

مسلمانوں اور اہل کتاب کے روزوں میں ایک بڑا فرق سحری کھانا ہے۔(۲) آج کل مسلمان سحری کھانے میں جلدی کرتے ہیں حالاں کہ اس میں تاخیر افضل ہے۔ نبی ﷺ سحری میں تاخیر فرماتے تھے۔ انس بن مالکؓ زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھاتے پھر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ انسؓ نے پوچھا، اذان اور سحری میں کتنا وقفہ ہوتا تھا، انھوں نے کہا، پچاس آیتوں کے برابر (۳) آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ اگر کوئی سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز سن لے تو کھانا نہ چھوڑے بلکہ جی بھر کر کھا لے۔(۴)

سحری کے برخلاف افطار میں رسول ﷺ کا معمول جلدی کا تھا۔ ادھر سورج غروب ہوا اور اُدھر حضرت بلالؓ کو آواز دیتے کہ ''لاؤ میرا شربت۔'' بلالؓ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ ﷺ ابھی تو اجالا ہے۔ آپ فرماتے کہ جب مشرق سے رات کی سیاہی بڑھنے لگے تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔(۵) آپ نے امت کو نصیحت فرمائی ہے:

"لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر" (٦)

''لوگ ہمیشہ (اپنے دین میں) اچھائی پر ہوں گے جب تک افطار میں جلدی کریں گے۔''

نبی ﷺ عام طور پر کھجور یا شربت سے، اور اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں تو پانی سے

---

(۱) بخاری و مسلم، رواہ انسؓ

(۲) مسلم (حدیث نمبر ۱۰۹۶)، ترمذی (حدیث نمبر ۷۰۸)، ابوداؤد (حدیث نمبر ۲۳۴۳)

(۳) بخاری، ج ۴، ص ۱۱۹، مسلم (حدیث نمبر ۱۰۹۷)، مزید دیکھیں، مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۱۵۴، ۱۵۵

(۴) جامع ترمذی

(۵) سنن ابی داؤد

(٦) موطا باب: ما جاء فی تعجیل الفطر، اخرجہ البخاری و مسلم

Marfat.com

روزہ افطار کرتے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ: ''رسول ﷺ مغرب کی نماز سے پہلے چند کھجوروں سے روزہ افطار فرماتے تھے، اگر تر کھجوریں نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے اور اگر خشک کھجوریں بھی نہ ہوتیں تو چند گھونٹ پانی پی لیتے تھے۔''(۱)

آپ نے اپنی امت کو افطار میں سادگی کی تعلیم دی ہے۔ حضرت سلمانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو پانی سے افطار کرے اس لیے کہ پانی کو اللہ نے طاہر بنایا ہے۔(۲) نبی ﷺ روزہ افطار کرتے تو فرماتے: ''اللھم لك صمت وعلی رزقك افطرت (۳) ''اے اللہ میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق سے افطار کیا۔''

سحری اور افطار کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ تعلیمات اور آپؐ کے اُسوہ کو آج مسلمانوں نے یکسر بھلا دیا ہے۔ وہ سحری میں جلدی کرتے ہیں، اور بعض نادان تو سحری ہی نہیں کھاتے، اور افطار میں تاخیر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ اس معاملے میں بہت آگے چلا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''لاتزال امتی بخیر ماعجلوا الافطار واخروا السحور (۴) ''میری امت ہمیشہ (اپنے دین میں) خیر پر ہوگی جب تک وہ افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کریگی۔'' افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کے حکم سے دراصل غایتِ روزہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ وہ تزکیۂ نفس ہے۔

اجتماعی افطار

آج کل مسلمانوں نے ایک بدعت یہ نکالی ہے کہ روزہ کشائی کا اجتماعی انتظام کرتے ہیں اور اس میں طرح طرح کے ماکولات ومشروبات سے روزہ داروں کی تواضع کی جاتی ہے۔ اس اجتماع میں روزہ دار کے علاوہ بے روزہ دار بھی شریک ہوتے ہیں۔ اور

---

(۱) سنن ابی داؤد

(۲) مسند احمد، ج ۳، ص ۱۶۴، ترمذی (حدیث نمبر ۶۹۶)، ابوداؤد (حدیث نمبر ۲۳۵۶)

(۳) سنن ابی داؤد (حدیث نمبر ۲۳۵۸)

(۴) رواہ احمد

Marfat.com

یہ بات اس وقت ظاہر ہو جاتی ہے جب افطار کے بعد بہت سے شرکاء نماز مغرب میں شریک نہیں ہوتے ہیں۔ ایک روزہ دار مسلمان سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ نماز ضرور پڑھتا ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ بہت سے بے روزہ دار مسلمان بھی روزہ کشائی کا اہتمام کرتے ہیں۔ غالباً وہ گمان کرتے ہیں کہ اس عمل سے ترکِ صیام کا گناہ معاف ہو جائے گا۔ بہت سے اہل ثروت اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے مسلمان محض اپنی دولت اور جاہ و منصب کے اظہار کے لیے اجتماعی افطار کا نظم کرتے ہیں۔ سیاسی مقاصد کے لیے بھی اجتماعی افطار کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سیاسی جماعتوں کے غیر مسلم اکابر بھی اپنی اپنی پارٹی کی طرف سے اجتماعی افطار کا اہتمام کرنے لگے ہیں اور ان میں بہت سے مسلمان شرکت کرتے ہیں۔ اس قسم کی افطار پارٹیوں میں کھلے عام روزہ کا تقدس پامال ہوتا ہے۔ کوئی سچا روزہ دار اس قسم کی افطار پارٹیوں میں ہرگز شریک نہ ہوگا۔

جہاں تک مسلمانوں کی طرف سے اجتماعی افطار کے اہتمام کا تعلق ہے تو اس سے اجتناب اولیٰ ہے کہ عہد رسالت اور عہدِ صحابہ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اجتماعی افطار میں نمود و نمائش بھی ہے اور فضول خرچی بھی گو کہ نیکی کے پردے میں کی جاتی ہے۔ اگر اجتماعی افطار پر خرچ ہونے والی رقم غربا و مساکین کو دے دی جائے تو یہ عمل کہیں زیادہ سود مند اور باعثِ خیر و برکت ہوگا کیونکہ رمضان صدقہ و خیرات کا مہینہ ہے۔ لیکن اگر کوئی روزہ دار مسلمان اخلاص کے ساتھ محدود پیمانے پر بالکل سادہ طریقے سے اجتماعی افطار کرانے کا خواہشمند ہو تو ضروری ہے کہ اس میں صرف روزہ دار مسلمان بلائے جائیں اور اس کا انتظام کسی مسجد میں کیا جائے۔ اس موقع پر غریب روزہ دار مسلمان فراموش نہ ہوں کہ اطعام غربا روزہ کے مقاصد میں شامل ہے۔

سرکاری افطار پارٹی میں مسلمان روزہ دار ہرگز نہ جائیں اور حکام کو بتادیں کہ اگر روزہ کشائی سے ان کا مقصد مسلمانوں کے ساتھ محبت و یک جہتی کا اظہار ہے تو اس کے لیے مناسب موقع عید الفطر ہے، جو ان کی خوشی کا دن ہے اور اس کو قومی تہوار کی حیثیت حاصل ہے۔

Marfat.com

انفرادی افطار میں اہتمام

یہ بات رسول ﷺ کے عمل سے ثابت ہے کہ آپ افطار کا کوئی اہتمام نہیں فرماتے تھے، جو کچھ وقت پر دستیاب ہوگیا اس سے افطار کرلیا۔ لیکن ہمارا عمل اس کے برخلاف ہے، ہم اس میں فضول خرچی کی حد تک اہتمام کرتے ہیں۔ ہر سال یہ عام مشاہدہ ہے کہ ادھر رمضان کا چاند نظر آیا اور ادھر مسلمانوں کے گھروں اور ان کے بازاروں میں انواع واقسام کے کھانے اور مشروبات تیار ہونے لگتے ہیں۔ لذتِ کام ودہن کے اس کاروبار میں عورتیں اس درجہ انہماک کا مظاہرہ کرتی ہیں کہ جیسے روزے کی شکل میں ان کی دلی مراد برآئی ہو۔ اس نامسعود کام میں مرد بھی پیچھے نہیں رہتے، وہ خوشی خوشی اسبابِ خورد ونوش فراہم کرنے میں سرگرمی دکھاتے ہیں۔

جوں ہی سورج غروب ہوا اکثر مسلمان روزہ داروں کے ہاتھ سے صبر کا دامن اس طرح چھوٹ جاتا ہے کہ وہ بھوکے جانور کی طرح کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور خوب شکم سیر ہوکر کھاتے ہیں۔ بسا اوقات اس عمل میں ان کا انہماک اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ نماز مغرب مؤخر ہوجاتی ہے۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ روزہ کا ایک بڑا مقصد خواہشات نفسانی کو گھٹانا اور اس کے غلبہ و تسلّط کو بتدریج ختم کرنا ہے۔ اب اگر افطار کے وقت نفس کو پسندیدہ غذائیں اور لذیذ مشروبات وافر مقدار میں مہیّا کردیے جائیں تو اس سے لازماً روزے کا ایک بڑا مقصد، یعنی نفس کی مخالفت، فوت ہوجائے گا۔ امام غزالیؒ (متوفی ۱۱۱۱ء) عہد سلاجقہ (۱۰۳۷۔۱۱۶۰ء) کے ایک بلند پایہ فلسفی اور عالم دین گزرے ہیں، انہوں نے مسلمانوں کی اس عادتِ بد کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''افطار کے وقت حلال غذا کے استعمال میں بھی حزم واحتیاط ضروری ہے۔ اتنا شکم سیر ہوکر نہ کھائے کہ اس کے بعد کھانے کی مطلق گنجائش باقی نہ رہے۔ اس لیے کہ حلق تک بھر کر کھالینے سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اگر روزہ دار بوقت افطار دن بھر بھوکا رہنے کی کمی پوری کردے اور جو دن بھر

Marfat.com

کھاتا وہ ایک ہی وقت میں کھالے تو دشمن خدا پر غالب آنے اور شہوات نفس کے غلبہ کو ختم کرنے میں روزہ سے کیونکر مدد مل سکتی ہے؟ یہ عادتیں مسلمانوں میں اس قدر پختہ اور عام ہو چکی ہیں کہ رمضان کی آمد سے بہت پہلے ہی سامانِ خورد و نوش جمع کر لیا جاتا ہے اور رمضان کے دنوں میں اتنا لذیذ اور متنوع کھانا کھایا جاتا ہے جو اور دنوں میں نہیں کھایا جاتا۔

روزہ کا مقصد تو تقلیلِ غذا اور خواہشات نفسانی کو دبانا ہے تاکہ تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ اب اگر صبح سے شام تک تو معدہ کو کھانے اور پینے سے روکا جائے اور شہواتِ نفس کو سخت مراحلِ ابتلا سے گزارنے کے بعد انواع و اقسام کے کھانوں سے شکم کو پر کر لیا جائے تو اس سے خواہشاتِ نفسانی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھیں گی۔ اور وہ خواہشات جو ابھی نفس کے اندر خوابیدہ و پوشیدہ تھیں وہ بھی بیدار ہو جائیں گی۔ رمضان کی روح اور مقصد ان خواہشاتِ نفسانی کی قوتوں کو کمزور کرنا ہے جن کو شیطان اپنی کار برآری کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اور یہ مقصد تقلیلِ غذا ہی سے حاصل ہو سکتا ہے یعنی شام میں اتنا ہی کھایا جائے جتنا عام دنوں میں کھایا جاتا ہے۔ اگر کوئی دن بھر کا حساب لگا کر کل کھانا ایک ہی وقت میں شکم سیر ہو کر کھالے تو اس سے روزہ کا مقصد اور اس کا فائدہ ہرگز حاصل نہ ہوگا۔"(۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی یہ عادت بہت پرانی ہے اور پختہ ہو چکی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا خاتمہ کب ہوگا۔ روزہ کا مقصد بالکل واضح ہے لیکن مسلمانوں کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان پر غیر واضح ہے۔ یہ دراصل ہماری بداعمالیوں کی سزا ہے کہ ہم خدا کی مقرر کردہ عبادتوں کی بجا آوری کے باوجود ان کے روحانی اور مادی فوائد سے یکسر محروم ہیں۔ شیطان نے سمجھا دیا ہے کہ روزے کا مقصد قلب کی صفائی، نفس کا تزکیہ اور اصلاحِ احوال نہیں بلکہ محض حصولِ ثواب ہے۔ یقین کریں کہ ماہ صیام میں خورد و نوش کے متنوع مناظر دیکھ کر گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ تزکیۂ نفس کا مہینہ ہے۔ کوئی اجنبی یہ مناظر دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ یہ مسلمانوں کا ماہِ طعام ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

---

(۱) احیاء العلوم، ج ۱، ص ۲۱۱

Marfat.com

صدقۂ فطر

عید الفطر کا دن چوں کہ خوشی کا دن ہوتا ہے اس لیے اسلام نے چاہا کہ اس اجتماعی خوشی میں سب مسلمان، خواہ امیر ہوں یا غریب، شریک ہوں۔ اس مقصد کے لیے اسلام نے مسلمانوں پر صدقۂ فطر واجب کیا ہے۔ عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ: ''رسول اللہ نے صدقۂ فطر مقرر کیا، ایک صاع (۱) جَو یا ایک صاع کھجور، ہر آزاد اور غلام مرد اور عورت پر جو مسلمان ہو۔'' (۲) بخاری میں یہ روایت ان الفاظ میں ہے:

"فرض رسول الله ﷺ زكوٰة الفطر صاعا من تمرا و صاعا من شعير، على العبد والحرو الذكر والانثى، والصغير والكبير من المسلمين، و امر بها ان تودى قبل خروج الناس الى الصلوٰة" (۳)

''رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر کو لازم ٹھہرایا ہے، ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو، ہر مسلمان پر، غلام ہو یا آزاد، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا، اور حکم دیا کہ نماز کے لیے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔''

اس سے زیادہ تفصیل اس روایت میں ہے جو عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا کہ وہ جا کر مکہ کے گلی کوچوں میں منادی کر دے کہ صدقۂ فطر ہر مسلمان پر واجب ہے، خواہ مرد ہو خواہ عورت، آزاد ہو یا غلام، چھوٹا ہو یا بڑا، دو مد (۴) گیہوں یا ایک صاع کوئی دوسرا غلہ یا کھجور۔ یہ صدقہ نماز عید کے لیے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔'' (۵)

اکثر روایتوں میں صدقۂ فطر کی مقدار ایک ہی صاع مذکور ہے۔ عیاض بن عبداللہ،

---

(۱) ساڑھے تین سیر سے کچھ زیادہ (تقریباً ڈھائی کلوگرام)

(۲) مؤطا، باب: مکیلۃ زکوۃ الفطر (اخرجہ البخاری و مسلم)

(۳) بخاری

(۴) مد، تقریباً دو سیر کے برابر

(۵) ترمذی

Marfat.com

ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''ہم نکالتے تھے صدقۂ فطر ایک صاع گیہوں یا ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع انگور خشک، نبی ﷺ کے صاع سے۔''(۱)

کوشش یہ ہونی چاہیے کہ صدقۂ فطر نماز عید سے پہلے نکال دیا جائے تاکہ غریب مسلمان آسانی کے ساتھ اپنی ضرورتیں پوری کرلیں۔ عبداللہ ابن عمرؓ کا معمول تھا کہ وہ عید سے تین روز پہلے اس شخص کے پاس صدقۂ فطر بھیج دیا کرتے تھے جو اس کام پر مامور ہوتا تھا۔(۲) آج کل ایک غلط رواج یہ چل نکلا ہے کہ لوگ صدقۂ فطر غربا کو دینے کے بجائے دینی مدارس کو دیا کرتے ہیں۔ اس سے صدقۂ فطر کا مقصد باطل ہو جاتا ہے۔ مناسب طریقہ یہ ہے کہ صدقۂ فطر نماز عید سے پہلے ایک جگہ جمع کرلیا جائے اور پھر انتہائی رازداری سے غربا اور مساکین اور دوسرے حاجت مند مسلمانوں کو دیا جائے۔ بدقسمتی سے زکوٰۃ کی طرح صدقۂ فطر کی تحصیل کا بھی کوئی اجتماعی نظم ابھی تک قائم نہیں ہو سکا ہے جس کی وجہ سے یہ خطیر رقم ہر سال ضائع ہو جاتی ہے۔

رویتِ ہلال

رمضان کے چاند کے بارے میں اختلاف شاذ و نادر ہی پیش آتا ہے، لیکن عید کے چاند میں، اگر مطلع ابر آلود ہو، نہ صرف اختلاف پیدا ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات یہ اختلاف اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ ایک شہر میں عید منائی جاتی ہے اور اس سے بالکل قریب واقع دوسرے شہر میں لوگ روزے سے ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدھا شہر یا قصبہ عید مناتا ہے اور آدھے شہر کے لوگ روزے رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں نبی ﷺ کا واضح ارشاد ہے:

> ''تم روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، اور عید نہ مناؤ یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔
> اگر مطلع صاف نہ ہو (مثلاً بادل آجائے) تو پھر (تیس دن کی) گنتی پوری کرد

---

(۱) موطا، باب: مکیلۃ زکوٰۃ الفطر

(۲) ایضا، باب: وقت ارسال زکوٰۃ الفطر

Marfat.com

(فان غم علیکم فاکملوا العدة)۔"(۱)

اس حدیث میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ چاند دیکھ کر روزہ رکھیں اور چاند دیکھ کر ہی عید منائیں۔ اس حکم میں بظاہر کوئی دشواری نہیں ہے اور یہ بالکل آسان طریقہ ہے۔ یہ بات فراموش نہ ہو کہ شریعت کے مخاطب صرف شہر کے باشندے نہیں بلکہ قصبہ، گاؤں اور کوہ و بیاباں کے رہنے والے بھی اس تخاطب میں شریک ہیں۔ چاند کی شکل میں اللہ نے ایک ایسی قدرتی جنتری دی ہے جس سے ہر دور میں ہر ملک و مقام کے مسلمان بآسانی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا آسمانی ریڈیو ہے جس کی آواز ہر جگہ کے لوگوں تک بآسانی پہنچ جاتی ہے۔ شارع نے یہ سہولت بھی دی ہے کہ اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس روزے پورے کر کے عید منائی جائے۔ اگر بعد میں معلوم ہو کہ چاند انتیس کا تھا تو ایک روزہ نفل شمار ہوگا۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر ایک مقام پر چاند دکھائی دے اور دوسرے مقام پر دکھائی نہ دے تو اس جگہ کے لوگ کیا کریں؟ زیادہ تر علماء کرام مذکورہ بالا حدیث کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ہر مقام پر چاند کی رویت ضروری ہے اور اس کے بغیر روزے رکھنا یا عید منانا خلافِ شرع ہوگا۔ لیکن قولِ حق یہ ہے کہ اگر ایک مقام پر چاند دیکھ لیا گیا ہے تو جہاں چاند نہیں دیکھا گیا ہے وہاں پہلے مقام کی رویت کا اعتبار کیا جائے گا بشرطیکہ نمایاں جغرافی فرق نہ ہو۔ (۲) رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد: صوموا لرویته وافطروا لرویته، میں رویت سے عام رویت مراد ہے۔ اگر آپ نے یہ فرمایا ہوتا کہ: صوموا لرویة بلدة وافطروا لرویة بلدة، (روزہ رکھو اپنے شہر کا چاند دیکھ کر اور روزہ توڑ دو اپنے شہر کا چاند دیکھ کر) تو اس صورت میں یقیناً ایک مقام کی رویت دوسرے مقام کے لیے لازمی ہوتی۔ جب نبی ﷺ نے اس رویت کو محدود نہیں کیا تو پھر اس کو عام کیوں نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ، امام

---

(۱) بخاری و مسلم

(۲) ——————— سعودی عرب وغیرہ میں روزے ہندوستان کے مقابلے میں پہلے شروع ہوتے ہیں اور پہلے ختم ہو جاتے ہیں، جس دن وہاں عید منائی جاتی ہے ہم ہندوستانی روزے سے ہوتے ہیں۔

Marfat.com

مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ایک جگہ کی رویت دوسری جگہ کے لیے کافی ہے۔ محمد علی صابونی لکھتے ہیں:

" ذهب الحنفية والمالكية والحنابلة: الى انه لا عبرة باختلاف المطالع،فاذا رأى الهلال اهل بلدوجب على بقية البلاد لقوله صلعم (صوموا لرويته وافطروا لرويته) وهوخطاب عام لجميع الامة فمن رأه منهم فى اى مكان كان ذلك روية لهم جميعا (۱)

''حنفی مالکی اور حنبلی فقہ کے ماننے والوں کا مسلک یہ ہے: اس معاملے میں مطلع کے اختلاف کا اعتبار نہیں ہوگا۔ جب ایک شہر کے لوگوں نے چاند دیکھ لیا تو بقیہ شہروں کے لیے یہ رویت نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق واجب ہوگی (چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو)، ساری امت اس کی مخاطب ہے اور پس اس کے جس آدمی نے جہاں کہیں بھی چاند دیکھ لیا تو یہ رویت سب کے لیے کافی ہے''

فقہِ حنفی کی تمام متداول کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ چاند کی رویت میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے۔ کسی ملک میں، اگر وہ غربی ہے، چاند دیکھ لیا جائے تو مشرق کے لوگ اس کے مطابق عمل کریں یعنی روزہ رکھیں اور عید منائیں۔ ردالمختار فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے، اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

فليزم اهل المشرق برویة اهل المغرب ، اذا ثبت عندهم روية او لئك بطريق من حب(۲)

''اہل مغرب کی رویت اہل مشرق کے لیے واجب ہے بشرطیکہ یہ رویت طریق احسن ان کے نزدیک ثابت ہو''

فتاویٰ عالم گیری سے کون صاحب علم ناواقف ہوگا، اس میں بھی مذکورہ قول کے مطابق ہی فتویٰ دیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

---

(۱) روائع البیان، تفسیر آیات الاحکام، ج ۱، ص ۲۱۱

(۲) ردالمختار

Marfat.com

"لا عبـرة باختلاف المطالع فی ظـاهـر الـروایـة (ای قوله ﷺ) وعـلـیـه الفتوی، لو ر أ هلال رمضان اهل المغرب یجب الصوم لاهل المشرق(۱)

''ظاہر روایت (یعنی رسول اللہ کا قول) کے لحاظ سے اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں ہوگا اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اگر اہلِ مغرب نے رمضان کا چاند دیکھ لیا تو اہلِ مشرق کے لیے روزہ رکھنا واجب ہے۔''

مذکورہ اقتباسات سے ان لوگوں کی غلطی بالکل واضح ہوگئی جو ایک مقام کی رویت کو دوسرے مقامات کے لیے حجت تسلیم نہیں کرتے اور ہر جگہ عینی رویت پر اصرار کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی وجہ لفظ رویت ہے۔ حدیث: صوموا لرویته الخ میں رویت سے مراد یقینی خبر ہے علماءِ حدیث نے بھی رویت کے یہی معنی لیے ہیں، یعنی جب یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ فلاں غربی شہر میں چاند دیکھ لیا گیا ہے تو دوسرے شہروں کے لیے یہ خبر عینی رویت کی قائم مقام ہوگی۔ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں لفظ رویت خبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

(سورہ بقرہ۔ ۲۴۳)

''کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔''

یہاں اگر رویت کو دیکھنے کے معنی میں لیا جائے تو یہ بات صحیح نہ ہوگی کیونکہ واقعہ مذکور کا تعلق بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ سے ہے اور اہل عرب اس سے ناواقف تھے۔''(۲)

اب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ رویت کی خبر پر اعتماد کی بنیاد کیا ہو؟ بالخصوص جب کہ مقامِ رویت زیادہ فاصلے پر واقع ہو۔ آج تقریباً ہر شہر میں علماء پر مشتمل ''رویتِ ہلال کمیٹی''

(۱) فتاویٰ عالم گیری، ج ۲ (کتاب الصوم)، ص ۹

(۲) مزید مثالوں کے لئے دیکھیں، سورہ فیل اور سورہ فجر وغیرہ

Marfat.com

قائم ہے اور ٹیلی فون کی سہولت تقریباً ہر جگہ دستیاب ہے اس لیے ایک مقام کی رویت کی تصدیق دوسری جگہ جہاں رویت نہیں ہوئی، بآسانی کی جاسکتی ہے۔

آج کل ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ بھی ترسیلِ خبر میں بہت آسانی ہوگئی ہے۔ جن ملکوں میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے وہاں بھی روزہ اور عید کے مواقع پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے چاند کی رویت کی خبر علماء کے حوالے سے نشر کی جاتی ہے۔ اس خبر پر اعتماد کرنے میں اس وقت تک کوئی حرج نہیں جب تک ایک بار یہ ثابت نہ ہو جائے کہ جس عالم یا ''رویت ہلال کمیٹی'' کے حوالے سے خبر نشر کی گئی وہ من گھڑت تھی۔ مناسب یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبر کی تصدیق مقامی ''رویت ہلال کمیٹی'' سے ٹیلی فون کے ذریعہ کر لی جائے اور اس کے بعد ہی روزہ اور عید کے متعلق فیصلہ کیا جائے۔ دوسرے مواقع کی طرح اس موقع پر بھی قرآن کی درج ذیل آیت ضرور پیشِ نظر رہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (سورہ آل عمران ۔ ۱۰۵)

''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو واضح دلائل آجانے کے بعد بھی فرقہ فرقہ ہو گئے اور باہم اختلاف کیا''

Marfat.com

کتابیات

۱۔ ابن تیمیہؒ، شیخ الاسلام: فتاویٰ ابن تیمیہ، کردستان، ۱۳۲۹ھجری

۲۔ ابن حنبلؒ، احمد بن محمد، امام: مسند الامام، تحقیق، احمد محمد شاکر، دار المعارف، مصر

۳۔ ابن رشد، علامہ: بدایۃ المجتہد، مکتبہ الازہر مصر، ۱۹۶۶ء

۴۔ ابن عبدالحکیم: سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، طبع مصر

۵۔ ابن عبدالبر، علامہ: جامع بیان العلم، طبع دہلی

۶۔ ابن عابدین: ردالمحتار علی الدرالمختار، مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ، پاکستان، ۱۴۰۴ھجری

۷۔ ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل: تفسیر القرآن الکریم (تفسیر ابن کثیر) مصر، ۱۹۳۷/۱۳۵۶ء

۸۔ ابن منظور، جمال الدین ابوالفضل محمد بن جلال الدین: لسان العرب، طبع بیروت، ۱۹۵۶ء

۹۔ ابن ہشام: سیرۃ النبی، دارالفکر بیروت، ۱۴۰۱ھجری

۱۰۔ ابوداؤد، امام: سنن ابی داؤد، مطبع مجیدی کانپور، ۱۳۴۵ھجری

۱۱۔ ابوعبید قاسم بن سلام: کتاب الاموال (اردو ترجمہ)، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، پاکستان، ۱۹۶۸ء

۱۲۔ ابویوسف، امام: کتاب الخراج، امیریہ مصر، ۱۳۰۲ھجری

۱۳۔ الجصاص، ابوبکر، امام: احکام القرآن، البہیۃ المصریۃ، ۱۳۴۷ھجری

۱۴۔ آزاد، ابوالکلام، مولانا: ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی دہلی، ۱۹۶۹ء

Marfat.com

۱۵۔ آزاد، ابوالکلام، مولانا: الہلال (مکمل فائل)، الہلال اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۱ء
۱۶۔ اصفہانی، ابومسلم: مجموعۂ تفاسیر (ترجمہ: سید نصرت و رفیع اللہ)، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۶۴ء
۱۷۔ اصلاحی، امین احسن، مولانا: تدبر قرآن، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء
۱۸۔ اعظمی، الطاف احمد: وحدۃ الوجود، ایک غیر اسلامی نظریہ، قاضی پبلیشر اینڈ ڈسٹری بیوٹر، نظام الدین ایسٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
۱۹۔ ———: سورہ فاتحہ، ایک تحقیقی مطالعہ، جمال آفسٹ پرنٹر، جامع مسجد دہلی، ۱۹۸۷ء
۲۰۔ آلوسی، ابوالفضل شہاب الدین محمود: روح المعانی، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر، ۱۳۴۵ہجری
۲۱۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، امام: الجامع الصحیح (صحیح بخاری) قاہرہ، ۱۳۷۸ہجری
۲۲۔ برنیر، سفرنامۂ برنیر، اردو ترجمہ: وقائعِ سیر و سیاحت، کرنل ہنری مور، باہتمام محمد قادری علی خاں صوفی، مفید عام پریس آگرہ، ۱۲۲۱ہجری
۲۳۔ بستانی: محیط المحیط، طبع بیروت
۲۴۔ بغوی، ابو محمد حسین الفراء: معالم التنزیل، المطبعۃ التقدم العلمیۃ مصر، ۱۳۲۲ہجری
۲۵۔ بیہقی، ابوبکر احمد بن حسین بن علی، امام: کتاب السنن الکبریٰ، حیدرآباد دکن، ۱۳۴۶ہجری
۲۶۔ ———: کتاب الاسماء والصفات، مطبع انوار احمد الہ آباد، ۱۳۱۳ہجری
۲۷۔ کتاب مقدس (بائبل)، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور، ۱۹۵۸ (طبع لندن)
۲۸۔ پانی پتی، محمد ثناء اللہ، قاضی: تفسیر مظہری، طبع حیدرآباد دکن، ۱۱۹۶ہجری
۲۹۔ تبریزی، ولی الدین محمد عبداللہ، شیخ الخطیب العمری: مشکوٰۃ المصابیح، مطبع احمدی دہلوی، ۱۲۶۷ہجری
۳۰۔ ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ: جامع ترمذی، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۲۲۸ہجری

Marfat.com

۳۱۔ جزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ (اردو ترجمہ: منظور احسن عباسی) محکمۂ اوقاف پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱ء
۳۲۔ جمیل عبداللہ، مصری، ڈاکٹر: حاضر العالم الاسلامی وقضایاہ المعاصرۃ، طبع مصر
۳۳۔ جوزی، ابن القیم: زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، المکتبۃ الحسینیۃ مصر، ۱۹۲۸ ہجری
۳۴۔ ــــــــــ: اعلام الموقعین، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر
۳۵۔ حاکم، محمد بن عبداللہ: المستدرک، حیدر آباد دکن، ۱۳۴۰ ہجری
۳۶۔ حمید اللہ، ڈاکٹر: خطبات بہاولپور، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد پاکستان، ۱۹۸۵ء
۳۷۔ خازن، علاء الدین بن محمد بن ابراہیم بغدادی: لباب التاویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن)، التقدم العلمیۃ، ۱۳۰۱ ہجری
۳۸۔ ذہبی، حافظ: میزان الاعتدال، المطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۲۵ ہجری
۳۹۔ رازی، محمد فخر الدین، امام: مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)، دار احیاء التراث العربی، بیروت
۴۰۔ راغب، اصفہانی، امام: المفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ المنیریۃ، مصر
۴۱۔ رشید رضا، مصری، علامہ: تفسیر المنار، طبع مصر، ۱۳۷۴/ ۱۹۲۸ء
۴۲۔ زبیدی، محمد مرتضیٰ، سید: تاج العروس، طبع کویت، ۱۹۶۶ء
۴۳۔ زمخشری، ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر: الکشاف عن حقائق التنزیل (کشاف)، دار المعرفہ، بیروت، لبنان
۴۴۔ سر سید احمد، خان: تفسیر القرآن (عکسی)، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۵ء
۴۵۔ سیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر: الدر المنثور فی تفسیر القرآن بالماثور (درمنثور)، المطبعۃ المیمنیۃ مصر، ۱۳۱۴ ہجری
۴۶۔ ــــــــــ: الاتقان فی علوم القرآن، مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۹۳۵ء
۴۷۔ شامی، محمد امین بن عمر عابدین: رد المحتار، طبع مصر
۴۸۔ شوکانی، محمد بن علی: فتح القدیر، مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۳۴۹ ہجری
۴۹۔ ــــــــــ: نیل الاوطار، المطبعۃ العثمانیۃ، ۱۳۵۷ ہجری

Marfat.com

۵۰۔ صابونی، محمد علی: روائع البیان، تفسیرِ آیات الاحکام، طبع دمشق، ۱۹۷۷ء
۵۱۔ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر: جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر الطبری)، طبعِ مصر ۱۳۸۸/ ۱۹۶۸ء
۵۲۔ عبدالحیٔ، ابوالحسنات، فرنگی محلی: مجموعہ الفتاویٰ (اردو)، طبع دہلی
۵۳۔ عزیز الرحمٰن، مولانا: فتاویٰ عزیزیہ، مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ، دیو بند (یو پی)
۵۴۔ فتاویٰ عالم گیری، مطبع نولکشور، لکھنؤ (یو پی)
۵۵۔ عسقلانی، ابن حجر، علامہ: فتح الباری، المطبعۃ الخیریۃ، ۱۳۱۹ ہجری
۵۶۔ عطاء اللہ، شیخ (مرتّب): اقبال نامہ، کشمیری بازار، لاہور پاکستان
۵۷۔ غزالی، ابو محمد، امام: المرشد الامین (خلاصہ احیاء العلوم)، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
۵۸۔ ـــــــــ: کیمیائے سعادت، لکھنؤ ۱۸۹۴ء
۵۹۔ ـــــــــ: احیاء علوم الدین (احیاء العلوم)، مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۹۳۹ء
۶۰۔ فراہی، حمید الدین، مولانا: رسالہ اصلاح الناس، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء
۶۱۔ قرضاوی، یوسف، علامہ: فقہ الزکوٰۃ، موسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۹۸۱ء
۶۲۔ قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری الخزرجی الاندلسی: تفسیر قرطبی، طبع بیروت، ۱۳۷۲/ ۱۹۵۳ء
۶۳۔ ـــــــــ: الجامع لاحکام القرآن، دارالکتب بیروت، ۱۹۳۵ء
۶۴۔ کرامت علی، مولانا: اطمینان القلوب، تاریخ طبع ندارد
۶۵۔ کنور درگا پرشاد: تاریخِ اجودھیا، منشی نولکشور لکھنؤ، ۱۹۰۲ء
۶۶۔ گنگوہی، رشید احمد، مولانا: فتاویٰ رشیدیہ، مطبوعہ کراچی
۶۷۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا: اسلامی معاشیات، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۷ء
۶۸۔ مالک بن انسؒ، امام: المؤطا فی الحدیث، المطبعہ التجاریۃ الکبریٰ مصر
۶۹۔ ماوردی، ابوالحسن علی: الاحکام السلطانیۃ، طبع مصر، ۱۹۰۹ء
۷۰۔ محمد ابو زہرہ: ابو حنیفہ: حیاتہ وعصرہ وآراؤہ وفقہہ، دار الفکر العربی

Marfat.com

۷۱۔ مدنی، حسین احمد، مولانا: نقش حیات، الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۹۵۳ء

۷۲۔ مرغینانی، علامہ: کتاب الہدایۃ، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی

۷۳۔ مسلم، بن حجاج، امام: الجامع الصحیح (صحیح مسلم)، المطبعۃ الامیریۃ، ۱۳۲۵ ہجری

۷۴۔ منصور پوری، محمد سلیمان سلمان، قاضی: رحمت للعلمین، مطبوعہ دہلی، ۱۹۸۰ء

۷۵۔ منگلوری، طفیل احمد: مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی، ۱۹۴۵ء

۷۶۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، مولانا: اسلام اور جدید معاشی نظریات، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۸ء

۷۷۔ ــــــــ: تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۶۹ء

۷۸۔ ندوی، ابوالحسن علی، مولانا: ارکانِ اربعہ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ (یوپی)

۷۹۔ ندوی، سید سلیمان، مولانا: سیرت النبی (جلد پنجم)، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء

۸۰۔ ندوی، عبدالباری، مولانا: تجدیدِ تصوف وسلوک، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۹ء

۸۱۔ نسائی، امام: سنن النسائی، طبع بیروت (لبنان)، ۱۴۰۶ ہجری

۸۲۔ نسفی، ابوالبرکات عبداللہ احمد بن محمود، علامہ: مدارک التنزیل وحقائق التاویل (تفسیر نسفی)، المطبعۃ الحسینیۃ مصر، ۱۳۴۴ ہجری

۸۳۔ نظام برہانپوری وغیرہ: الفتاویٰ العالمگیریہ، طبع بیروت، ۱۹۸۰ء

۸۴۔ نووی، امام: شرحِ مسلم، کتب خانہ رشیدیہ دہلی، ۱۳۷۶ ہجری

۸۵۔ ولی اللہ، شاہ، دہلوی: حجۃ اللہ البالغۃ، طبع مصر، ۱۳۲۲ ہجری

۸۶۔ ــــــــ: مصفّٰی (شرح مؤطا)، مطبع فاروقی دہلی، ۱۲۹۳ ہجری

۸۷۔ ــــــــ: الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (اردو ترجمہ: مولوی رشید احمد): مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۶۳ء

88. Bernier, Francois, Travels In the Mughal Empire, Constable, London, 1891
89. David, Moss, Religions of India

Marfat.com

90. Draper, John William, The History of the Intellectual Development of Europe, London, 1864.
91. Hinnels, John R., A Hand Book, on Living Religions,
92. Max Mullar F., Sacred Books of the East, (Edited), Delhi, 1965
93. Radha Krishnan, Indian Philosophy, London, 1948.
94. Somervell, D.C., A Short History of Our Religion, London, 1945
95. The Encyclopaedia of Religion, New York, 1987.
96. The Encyclopaedia of Religion and Ethics, Edited by James Hastings, (Vol.3), New York, 1910.
97. The Hindustan Times, Delhi, October, 1990.
98. The Times of India, Delhi, August, 2002.

Marfat.com

ہماری اہم مطبوعات

تفسیر قرآن کے اصول	علامہ حمید الدین فراہی	[illegible]0.00
ترجمۂ قرآن مجید	مولانا امین احسن اصلاحی	300.00
الفاظِ قرآنی کی تفہیم	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	140.0
تدبر حدیث (شرح مؤطا امام مالک)	مولانا امین احسن اصلاحی	220.00
فلسفے کے بنیادی مسائل (قرآن حکیم کی روشنی میں)	مولانا امین احسن اصلاحی	100.00
حقیقت نماز	مولانا امین احسن اصلاحی	25.00
اصول فہم قرآن	مولانا امین احسن اصلاحی	20.00
مبادی تدبر قرآن	مولانا امین احسن اصلاحی	100.00
عہد نبوی کے میدان جنگ	ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس)	25.00
علم وہدایت کے چراغ	عبدالرحمن پرواز اصلاحی	50.00
نظام حق کے معمار	عبدالرحمن پرواز اصلاحی	50.00
فن غریب الحدیث کا آغاز وارتقا	ترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	150.00
روشنی کے مینار	حافظ محمد ادریس	60.00
مغرب اور اسلامی بنیاد پرستی	ڈاکٹر محمد ارشد	100.00
قرآن مجید سمجھ کر پڑھیں	مولانا عتیق الرحمان اصلاحی	10.00
اسلامی قانون کی تدوین	مولانا امین احسن اصلاحی	70.00
برصغیر میں صحابہ وتابعین	مولانا اسحاق بھٹی	80.00
حیات رسول امی	مولانا خالد مسعود	200.00
حقیقت حج	الطاف احمد اعظمی	100.00
رہبر کامل	مولانا عبدالمجید اصلاحی	40.00
ہمارے خلفائے راشدین	مولانا عبدالمجید اصلاحی	35.00
صدائے رستاخیز	مولانا سید ابوالاعلی مودودی	170.00
اسلامی تہذیب وثقافت پر اسلام کے اثرات	محمود شرقاوی	80.00
تاریخ عرب	فلپ کے حتی	100.00

Distributed by
Al-Balagh Publications
10-Azami Apartment,N-1, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Ph.011-26942592,09210008835
E-mail: abpublications@gmail.com

Marfat.com

Marfat.com

Distributed by

AL-BALAGH PUBLICATIONS

10-Azami Apartments, N-1, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-25
Ph.: 26942592 Mob. 9213374775, 9210008835
E-mail: abpublications@gmail.com,

Marfat.com